یک بابی
اردو ڈرامے
(انتخاب)

ترتیب وانتخاب
زبیر رضوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

یک بابی
اردو ڈرامے
(انتخاب)

ترتیب وانتخاب

زبیر رضوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110 066

پہلی اشاعت	:	2008
تعداد	:	550
قیمت	:	-/325 روپے
سلسلہ مطبوعات	:	1300

Yak Babi Urdu Dramey (Intekhab)
Compiled by: **Zubair Razvi**

ISBN : 81-7587-247-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: گیتا آفسیٹ پرنٹرس، سی۔90، اوکھلا انڈسٹیریل ایریا، فیز۔I، نئی دہلی۔110 020
Printed on 70 gsm paper of Khanna Paper Mills.

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف سمتوں میں اردو کے فروغ کے کام کرتے ہوئے اس پہلو پر بھی پوری توجہ دی ہے کہ آج کے قاری کے مطالعے کے ذوق کو مفید اور معیاری کتابوں سے ہم آہنگ رکھا جائے اور جن موضوعات و مضامین میں کتابوں کی کمی ہے یا پھر اشاعت ثانی نہ ہونے کی بنا پر جو کتابیں اور تحریری مواد پڑھنے والے کی دسترس سے باہر ہو گیا ہے لیکن جس کی ضرورت آج بھی ہے اسے نئی ترتیب اور تعارف کے ساتھ قاری کو فراہم کیا جائے۔

آزادی کے بعد لکھے اور اسٹیج کیے گئے اردو کے نمائندہ ڈراموں کے Text کو اس صنف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے شائع کرنے کا احساس کونسل کی ترجیح کا حامل رہا ہے کیونکہ فلم کے بعد ڈرامے نے بھی اپنی ایک مقبول جگہ بنالی ہے دوسرے اردو میں ڈرامہ اسٹیج کرنے کی روایت مراٹھی، گجراتی اور بنگالی ڈرامے اور ان زبانوں کے تھیٹر کی طرح ہی پرانی اور خاصی سرگرم رہی ہے۔

اردو ڈراموں کی دو جلدوں میں مرتب کی گئی زیر نظر انتھالوجی میں 29 طبع زاد ڈراموں کا Text تفصیلی دیباچے کے ساتھ دیا جا رہا ہے اس انتھالوجی سے پہلی بار قارئین کو یہ اندازہ ہوگا کہ

اردو ڈرامہ خواہ وہ ''فُل لینتھ'' ہو یا ''یک بابی'' وہ قومی اردو عالمی تھیٹر کے مختلف ادوار کے رجحان اور رویوں سے پوری طرح ہم آہنگ رہا ہے نیز اردو ڈرامہ برابر نئے موضوع اور نئی تکنیک کے ساتھ اسٹیج ہو رہا ہے اور اسے شوق سے دیکھا جا رہا ہے۔ 29 اردو ڈراموں کی اس انتھالوجی سے اب ڈرامہ اسٹیج کرنے والوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اپنی ضرورت اور وسائل کے مطابق وہ ان میں سے کوئی بھی ڈرامہ ناظرین کے روبرو اسٹیج کر سکتے ہیں ڈرامہ نگاروں کو اس کی اطلاع اور ان کی اجازت اخلاقاً ضروری ہے۔

امید ہے یہ انتھالوجی تھیٹر کی سطح پر اردو کے فروغ میں ایک معاون ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر علی جاوید
ڈائرکٹر

یک بابی اردو ڈرامہ لکھنے اور کھیلنے والوں کے نام

فہرست

پیش لفظ

ڈائریکٹر NCPUL (ایک صفحہ)

دیباچہ

● اردو میں ڈرامہ اسٹیج کرنے کے سرگرم دنوں میں تھیٹر کا بنیادی مقصد نا ٹک منڈپ میں ٹکٹ لے کر آنے والے کو زیادہ سے زیادہ تفریح فراہم کرنا تھا اس ساری تفریح ساز تھیٹریکل کاوش کے پس پردہ کوئی واضح سماجی مقصد یا اس وقت کی انسانی زندگی کے مختلف مسائل کو حقیقت پسندی کے ساتھ تھیٹر کا موضوع بنانا مقصود نہیں تھا اس تفریحی سرگرمی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ڈرامے کے شوقینوں کو زیادہ دیر تک کہانی، ناچ اور گانوں کے طلسم میں باندھے رکھا جائے پرانے تھیٹر میں یہ تین عناصر ڈرامے کی مقبولیت اور شوقینوں میں اس کی پذیرائی کا لازمی مسالہ تھے اس تفریحی تھیٹر کے متوازی ایک ڈرامہ اور بھی تھا جو بڑی حد تک کتابی تھا یعنی جسے ادبی شوق کے وفور میں لکھا گیا تھا اس کے لکھنے والے کے ذہن میں نہ اس کے اسٹیج ہونے کا خیال تھا اور نہ ہی اسے ڈرامے کی ہیئتی تقاضوں اور لوازم سے ہی کوئی پیشہ ورانہ سروکار تھا اس ڈرامے کی ایک خوبی بڑی واضح تھی کہ یہ عام طور سے نا ٹک منڈپ میں کھیلے جانے والے ڈرامے کی طرح فل لینتھ پلے نہ ہو کر اس کی مدت پندرہ بیس منٹ کے درمیان ہوا کرتی تھی اس پیش کش کو یک بابی یا ایکانکی ڈرامہ کہا گیا انگلینڈ، فرانس اور اٹلی میں اسے کم وقفے کے طنزیہ یا مزاحیہ یک بابی ڈرامے کے طور پر فل لینتھ پلے کے شروع میں یا پھر انٹرول کے وقفے میں کھیلا جاتا تا کہ المیہ ڈرامے کی پیدا کردہ بوجھل فضا کو تھوڑی دیر کے لیے ناظرین کے لیے خوشگوار بنا دیا جائے بظاہر 'یک بابی' ڈرامہ لکھنا طویل وقفے والے ڈرامے کے مقابلے میں آسان سمجھا گیا لیکن یہ تاثر صحیح نہیں تھا 'یک بابی' ڈرامے میں بھی پلاٹ اس کا عروج، دلچسپ خاتمہ، کردار اور پلاٹ میں واقعات سازی سب کچھ اسی طرح ہوتا جیسا کہ زیادہ وقفے کے ڈرامے میں ہوتا تھا فرق یہی تھا کہ 'یک بابی' ڈرامے کو لمبے وقفے کے ڈرامے کی پیش کش کے دوران ایک Interlude کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح یک بابی ڈرامے کو طویل المیہ ڈراموں کی پیش کش کا حصہ بنا لیا گیا تھا۔

اردو والوں نے تھیٹر کی غیر معمولی مقبولیت پیشہ ور پارسی تھیٹر کے روپ میں دیکھی تھی

پارسی تھیٹر میں ڈرامے کا مرکزی خیال تو سبق آموز ہی ہوتا تھا لیکن اس ڈرامے کے اجزائے ترکیبی اس مقصد کے حامل تھے کہ ڈرامہ ناٹک منڈپ میں آنے والوں کی کردار سازی پر زور نہ دے کر انھیں زیادہ سے زیادہ تفریح فراہم کرنے کا اہتمام کرے اس لیے تھیٹر کے اس تفریحی دور میں یک بابی ڈرامے اپنا وہ رول ادا نہ کر سکے جو وہ انگلینڈ، فرانس اور اٹلی میں انجام دے رہے تھے ہندوستان میں شہروں شہروں کھیلے جانیوالے پارسی تھیٹر کے ڈراموں کی زبان اردو تھی جیسا کہ کہا گیا کہ اس تھیٹر کا مقصد کچھ کچھ نیک چلنی پر زور مگر زیادہ یہ تھا کہ تھیٹر دیکھنے والوں کی ٹکٹ کھڑکی پر زیادہ سے زیادہ بھیڑ کو اکٹھا کیا جائے ایسی صورت میں یک بابی ڈرامے کو گود لینے والے اور اسے اردو زبان کے دودھ پر پالنے پوسنے والے وہ لوگ بن گئے جو مغرب سے مستعار اصناف ناول اور مختصر افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کے بہت زیادہ اہل نہیں تھے جس طرح ابتداء میں افسانوں کے اور ناولوں اور سنجیدہ ڈراموں کے تراجم اردو میں عام ہوئے اسی طرح یورپ میں مقبول ہونے والے یک بابی ڈراموں کے تراجم بھی اچھی خاصی تعداد میں رسالوں اور اخباروں میں جگہ پانے لگے ان میں سے ایک دو اسٹیج پر بھی کھیلے جانے لگے جیسے The Dear Departed, Mr.Box and cox, Bishop's Candle ان یک بابی ڈراموں کو زیادہ تر اسکولوں، کالجوں میں کھیلا جاتا آزادی سے پہلے کے برسوں میں انگریزی نوآبادیات کے زیر اثر شکسپیرین تھیٹر بھی اپنی فنی تکمیل اور پلاٹ کی ترسیل کے بہترین نمونے پیش کرنے میں ناکام رہا تھا اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان جو اپنی تہذیبی اور ثقافتی قدروں سے اٹوٹ وابستگی رکھتا ہے اور اپنی لوک شیلیوں کو اپنے اظہار، کا موثر ترین وسیلہ سمجھتا رہا ہے وہ شکسپیرین تھیٹر کا ایک مستقل ناظر نہیں بن سکا اسی لیے جب آزادی سے پہلے اور بعد کے دنوں میں پارسی تھیٹر کے بدل کے طور پر ہندوستانی طرز کا تھیٹر پرتھوی تھیٹر اور اپٹا کے ڈراموں کے روپ میں سامنے آیا تو تھیٹر کا وہ سارا منظر نامہ ہی بدل گیا جو نوآبادیاتی تھیٹر اور پارسی تھیٹر کے تفریحی اور تجارتی تھیٹر کے گرد وغبار میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

اردو میں یک بابی ڈرامے کی تکنیک کو اپنانے والوں کے لکھے یک بابی ڈراموں پر تفصیلی نظر ڈالیں تو پھر ایک بار کہنا پڑے گا کہ یہ محض ادبی کاوش کے طور پر ایک طرح سے مشق سخن

کے انداز میں لکھے گئے کچھ پر اس لیے نظر ٹھہر گئی کہ وہ ڈرامے کی عام روش سے ہٹ کے تھے ان کی نثر اور مکالمے کسی قدر دلچسپ تھے اور ایسے زیادہ تر یک بابی ڈراموں کو اسٹیج پر آنا نصیب نہیں ہوا اور وہ جلدی فراموش کردئے گئے ایسے یک بابی ڈراموں میں محمد حسین آزاد کا ایک بابی ڈرامہ اکبر، شرر کا شہید وفا، ظفر علی خاں کا نازلی بیگم کا انصاف، مولانا عبدالماجد کا زود پشیماں، جیسے کئی یک بابی ڈرامے شامل ہیں لیکن یہ اور اس طرح کے کئی یک بابی ڈرامے اردو ڈرامے کی تاریخ اور اس کی پیشہ وارنہ پیش کش کا حصہ نہ بن سکے لیکن شوقیہ طور پر یک بابی ڈرامے لکھنے والوں کا سلسلہ جاری رہا دراصل یہ وہ اردو حلقہ تھا جو کسی نہ کسی طور پر کسی ہیئت کے حوالے سے اپنے خیال وفکر کے اظہار کے لیے مضطرب تھا اسکول اور کالج جیسے ادارے معمولی ساز وسامان کے ساتھ ان کے لکھے ڈراموں کو اسٹیج کرنے کے لئے بڑے شوق سے آمادہ تھے اس صورت حال کا فائدہ یک بابی ڈرامے کی عوامی مقبولیت کی صورت میں اسی طرح ظاہر ہوا جس طرح مختصر افسانے نے ہیئتی طور پر اپنی جگہ بنائی تھی۔

اردو میں ڈرامے کی ارتقائی تاریخ پر کئی لوگوں نے کتابیں لکھتے ہوئے طویل وقفے کا ڈرامہ لکھنے والوں کے کھاتوں میں یک بابی ڈرامے لکھنا بھی شامل کردیا ہے اسی طرح یک بابی ڈرامہ نگاروں کا ذکر باقاعدگی سے اسٹیج ڈرامہ لکھنے والوں کے ساتھ کردیا گیا عشرت رحمانی نے یک بابی ڈراموں کے ارتقائی سفر پر بحث کرتے ہوئے ایسے ڈرامہ نگاروں کی ایک طویل فہرست دی ہے جنھوں نے یک بابی ڈرامے کے بجائے صرف طویل وقفے کے ڈرامے لکھے ہیں یا پھر دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے ہیں جبکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یک بابی ڈارمے کے نام پر پچھلی ایک صدی میں جو کچھ بھی لکھا گیا اسے پوری طرح کھنگالا جاتا یا پھر آزادی سے تین چار دہوں پہلے یک بابی ڈرامے کو جو ادیب اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے تھے ان کے لکھے ڈراموں کو سامنے رکھ کے یہ دیکھا جاتا کہ یک بابی ڈرامے کے پرانے یا نئے Treatment کی واضح مثالیں ہمیں کہاں کہاں ملتی ہیں اور وہ ڈرامے کون سے ہیں ان کے ڈرامہ نگار کون ہیں؟ لیکن ایسا کرنا شاید ممکن نہیں تھا کیونکہ ڈرامہ ہمیشہ نظر انداز کی جانے والی صنف رہا اس لئے اس کا قابل ذکر Text بھی معدوم ہوتا چلا گیا۔

زیر نظر یک بابی ڈراموں کا انتخاب کرتے ہوئے مشکل یہ تھی کہ صحیح اور مطلوبہ مواد کے حصول کی واضح نشان دہی سے عشرت رحمانی اور کمال احمد رضوی کی کتابیں بھی عاری تھیں ادھر بڑے شہروں میں آزادی کے بعد ہندوستانی تھیٹر کی نئی سرگرمیوں اور نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے قیام اور ناٹک فیسٹول کے ہر سال انعقاد سے صورت حال ہی بدل گئی یک بابی ڈرامے اب نہ محض ادبی شوق کی تسکین کا مظہر تھے نہ ہی طویل ڈرامے کے آغاز اور درمیان میں طنز اور مزاح کی خاطر بننے والے سرکسی جوکر۔ Intertude

دراصل نئے تھیٹر کی پہچان کا آغاز اس نیشنل تھیٹر فیسٹول سے ہوا جو 1954 میں سنگیت ناٹک اکادمی اور دلی ناٹیہ سنگھ کے اشتراک سے منعقد ہوا تھا اسی تھیٹر فیسٹول نے نئے تھیٹر کی لینگویج اور Text کے ماضی سے مختلف ہونے کا احساس دلا دیا تھا ہندوستانی تھیٹر کی زندگی کا دوسرا موڑ وہ تھا جب 1956 میں نیشنل تھیٹر پر ایک سی می نار ہوا اس میں تھیٹر کے نئے رجحانات، رویوں اور ہیئتی تجربوں پر بھی کھل کر بحث ہوئی تھی جس نے ڈراموں کو نئے انداز لکھنے کی راہ کھولی۔

وہ یک بابی ڈرامہ جو اسٹیج ہونے لائق بنایا جا سکتا تھا اور وہ جو محض ادبی شوق میں لکھا گیا ان دونوں کی واضح مثالیں اس انتخاب میں نہیں ہیں اس کے برخلاف یہ انتخاب کرشن چندر اور اپندر ناتھ اشک کے معروف یک بابی ڈراموں سے شروع ہو کر نئے ڈرامہ نگار قدیر زماں کے 'لنگڑا گھوڑا' پر ختم ہوتا ہے ان میں ایسے بھی ہیں جو ابھی اسٹیج نہیں ہوئے لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جو اسٹیج ہو چکے ہیں ظاہر ہے ان منتخب یک بابی ڈراموں کے لکھے جانے کا عرصہ سات دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے اس لئے اس عرصے میں فنی تکمیل اور موضوع کے اعتبار سے جو تبدیلیاں ہندوستانی تھیٹر اور اس کے اسٹیج پر رونما ہوئی ہیں ان کی جھلک یا ان کا اثر اس انتخاب کے ان یک بابی ڈراموں کے Text میں قاری کو ضرور محسوس ہوگا اس انتخاب کا مقصد بھی یہی ہے کہ اردو کے یک بابی ڈرامے کی ایک Up date صورت اس انتخاب کے ذریعے قاری تک منتقل ہو جائے۔

●●●

دلی، جون 2008 — **زبیر رضوی**

کتاب کا کفن

• کرشن چندر

کردار

مہتہ جی	مہتہ مہتہ اینڈ کمپنی بک سیلر اینڈ پبلشر کے پروپرائٹر
تولارام آوارہ	ٹائپسٹ
دین دیال تیواری	اردو زبان کا افسانہ نگار
آتمارام کھنگر	ہندی زبان کا افسانہ نگار
اصغر اژمڑ ٹانڈوی	دو شاعر
بیدل جھن جھن جھانوی	
اچلا کماری	میونسپل اسکولوں کی ایک انسپکٹرس
کمال الدین	ایک پبلشر

ایک امیر لڑکا۔ ایک امیر لڑکی۔ گاہک، چپراسی وغیرہ

پہلا منظر

جب پردہ اٹھتا ہے تو مہتہ جی کی دوکان کتابوں سے سجی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دکان کے اوپر انگریزی میں ایک بورڈ ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہے۔ ''مہتہ اینڈ کمپنی بک سیلرز اینڈ پبلشرز'' دکان کے اندر وسط میں مرکز سے لے کر بائیں ونگ تک لکڑی کا ایک کونٹر ہے جس پر کتابیں بے ترتیبی سے رکھی ہیں۔ مرکز سے دائیں طرف کی ونگ تک دو میزیں رکھی ہیں۔ مرکزی میز مہتہ جی کی ہے۔ اس پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ میز کے پیچھے ایک گھومنے والی کرسی ہے۔ یہ دوکان کے مالک مہتہ جی کی کرسی ہے۔ اس سے ذرا فاصلے پر دوسری میز ہے جس پر ٹائپ رائٹر رکھا ہے۔ یہ میز دائیں ونگ تک جاتی ہے۔ ان دونوں میزوں کے پیچھے اور لکڑی کے کونٹر کے پیچھے دیواروں پر تینوں طرف کتابیں چھت تک لکڑی کے ریکوں اور شیشے کی الماریوں میں چنی ہیں۔ کئی جگہ کتابیں کونوں میں بندھی رکھی ہیں۔ بائیں ونگ کی جانب شیشے کی ایک عمدہ الماری ہے۔ اس میں رنگا رنگ کے قلم دوات، کاغذ، پنسلیں اور اسٹیشنری کا مختلف سامان رکھا ہے۔ بائیں ونگ کی طرف سے دوکان کے اندر داخل ہونے والے کو لکڑی کے کونٹر تک جانے کے لئے اس شیشے کی الماری کے گرد گھوم کر جانا پڑتا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو مہتہ جی (بے مونچھوں

والے، ادھیڑ عمر کے، سانولے رنگ کے، فربہ اندام) اپنی کرسی سے میز پر جھکتے ہوئے ایک چیک پر دستخط کرنے لگتے ہیں۔ دائیں طرف کی میز پر تولا رام آوارہ ٹائپسٹ کچھ ٹائپ کر رہا ہے۔ تولا رام آوارہ ایک دبلا پتلا درمیانے قد کا آدمی ہے۔ سر پر پنجابی وضع کی گھٹی ہوئی پگڑی باندھے ہوئے ہے۔

مہتہ جی :(چیک پر دستخط کرتے ہوئے) ''تولا رام!''

تولا رام :(ٹائپ کرتے ہوئے ہاتھ روک کر) ''جی''!

مہتہ :یہ پانچ سو روپے کا چیک جگ میر پرشاد کا غذی کو دے آؤ۔

تولا رام :جی بہت اچھا۔ (کرسی پر سے اٹھنے لگتا ہے)

مہتہ :دیکھنا وہ بنڈل باندھ لیے جو لکھنؤ جائیں گے۔

تولا رام :جی

مہتہ :اچھا تو جانے سے پہلے یہ دو خط بھی ٹائپ کر کے رستے میں ڈالتے جاؤ۔

تولا رام :جی۔ (پھر بیٹھ جاتا ہے۔ اور شارٹ ہینڈ پیڈ ہاتھ میں لے کے پنسل سے جلدی جلدی لکھنے لگتا ہے۔)

مہتہ :(خط لکھواتے ہوئے) مائی ڈیئر شرما جی! آپ نے گرام سدھار لائبریوں کے سلسلے میں پانسو کتابوں کا جو آرڈر بھیجا ہے اس کے لیے میں آپ کا دھنیاد کرتا ہوں۔ پچھلے مہینے میری بیوی کشمیر گئی تھی۔ وہ بھابھی جی کے لئے پشمینے کا ایک بہت عمدہ شال لائی ہے۔ اسے بذریعہ ہوائی جہاز ڈاک بھیج دیا ہے۔ امید ہے بھابی جی کو یہ شال پسند آئے گا۔ میرے لائق کوئی اور خدمت،

آپ کا مخلص

کرم چند مہتہ

تو . . . دیا کرشن شرما سکریٹری گرام سدھار لائبریری

نو پردیش۔ بجنین

مہتہ :لکھ لیا؟

تولارام : جی۔

مہتہ : دوسرا لکھو، ٹو میسرز چمن بک ڈپو۔ سبزی منڈی، امرتسر
ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم شری دین دیال تیواری جی کی نئی کتاب ''الٹے بانس بریلی'' پر پچیس فی صدی سے زیادہ کمیشن نہیں دے سکتے۔ شری دین دیال تیواری ہندوستان کے عظیم ترین افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں اور ہمیں ان کی ہر کتاب پر رائلٹی ایڈوانس ہی ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے شری دین دیال تیواری کی کسی کتاب پر پچیس فی صدی سے زیادہ کمیشن نہیں دیا جا سکتا..... کیا لکھا؟
(یہاں پر تیواری جی اندر آتے ہیں)

تیواری : نمستے مہتہ جی! یہ ہمارا ذکر کس سلسلے میں ہو رہا ہے؟

مہتہ : (چونک کر) آیئے آیئے تیواری جی۔ دیکھ لیجئے۔ کہاں کہاں ہم آپ کے لئے لڑائی کرتے پھرتے ہیں۔

تیواری : لڑائی؟ ہمارے لئے؟ وہ کیوں؟

مہتہ : کسی سرپھرے نے آپ کی کتاب ''الٹے بانس بریلی'' پڑھ کر خط لکھ دیا ہے۔

تیواری : دکھایئے! (تیواری ہاتھ بڑھاتا ہے۔ مہتہ خط پرے لے جاتا ہے)

مہتہ : کیا دکھاؤں خط کیا ہے۔ گالیوں کا پلندہ ہے۔

تیواری : کیوں؟ گالیاں کیوں دے رہے ہیں؟

مہتہ : بس آپ کی نئی کہانیاں انہیں پسند نہیں آئیں۔

تیواری : کیوں جی، کیا میری نئی کتاب بھی پسند نہیں آئی؟

مہتہ : جی نہیں۔ اس پر تو سب سے زیادہ گالیاں پڑی ہیں آپ کو۔ وہ لکھتا ہے نہ اس میں سٹائل ہے۔ نہ زبان، نہ ندرت، نہ فکر، نہ پلاٹ، کہانی کیا ہے، لایعنی دلائل کا انبار ہے۔ یہ کہانی لکھنے کے بجائے مصنف اگر بھنی ہوئی مونگ پھلی بیچتا تو بہتر ہوتا۔

تیواری : بکواس کرتا ہے۔ دکھاؤ یہ خط

مہتہ : جانے دیجئے۔ کیا کریں گے یہ خط پڑھ کے (خط پھاڑتے ہوئے) موڈ خراب ہو جائیگا

(چند لمحوں کی خاموشی)

مہتہ :تم جاؤ تولا رام وہ کاغذی والا کام کر کے آؤ۔ یہ خط بعد میں بھیج دینا۔

(تولا رام جاتا ہے)

(پھر چند لمحوں کی خاموشی، دین دیال تیواری خاموش بیٹھا ہے۔ خاموش اور اداس)

مہتہ : تیواری جی، میں نے اس گالیاں دینے والے کو وہ منہ توڑ جواب دیا ہے کہ وہ بھی کیا یاد کرے گا۔ دیکھئے ہم تو جہاں بھی ہوں آپ کا پروپگنڈہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ مگر......

تیواری :مگر کیا؟

مہتہ : کچھ نہیں۔ کہہ دوں گا تو آپ خفا ہو جائیں گے۔

تیواری :نہیں نہیں کہئے۔

مہتہ :بات دراصل یہ ہے کہ آپ کا اسٹائل واقعی کمزور ہو رہا ہے۔ پہلے والی بات اب نہیں رہی ہے۔ وہ حسن بیان، وہ خوبصورتی، وہ ادائے دل کش و دل پذیر کیا ہوئی؟

تیواری : (افسردہ ہو کر) بس بس مہتہ جی زیادہ مت کہئے۔ مجھے خود اس کا کچھ کچھ احساس ہوتا جا رہا ہے۔ دراصل جن دنوں میں نے کتاب ''الٹے بانس بریلی'' لکھی تھی، میری بیوی سخت بیمار تھی اور میں بہت سخت مالی مشکلات میں۔

مہتہ :مگر کتنی بھی مالی مشکلات کیوں نہ ہوں تیواری جی، آرٹ پر ان کا اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ زندگی قلیل ہے مگر آرٹ طویل ہے۔ زندگی غیر ابدی ہے مگر آرٹ لازوال ہے۔

تیواری :جی ہاں، وہ تو صحیح ہے مگر مہتہ جی میں اس وقت آپ سے ......

مہتہ : (بات کاٹ کر) مالی مشکلات کتنی بھی کیوں نہ ہوں۔ ان کا آدمی کے کام پر برا اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ مجھے دیکھئے بال بال قرض میں بندھا ہے۔ ایک ایک پیسے کو ترس رہا ہوں۔ باپ دادا کی جتنی کمائی تھی کتابوں میں جھونک دی۔ آپ لوگوں کی کتابیں چھاپیں اور انہیں الماریوں میں سجا دیا۔

تیواری :جی ہاں وہ تو صحیح ہے مگر مہتہ جی میں اس وقت آپ سے ایک ضرورت......

مہتہ : (بات کاٹ کر) ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جانے کس مسخرے نے کتابوں کی

ضرورت کو ایجاد کیا۔ میں اس وقت اگر مچھلی بیچنے کا بیوپار کرتا تو مزے میں رہتا۔ اسّی ہزار کی کتابیں اس وقت اس دوکان میں پڑی ہیں۔ مگر پڑے پڑے ان کو دیمک چاٹ جائے گی۔ اور کوئی گاہک نہیں آئے گا۔ جانتے ہیں ''الٹے بانس بریلی'' کی اب تک کتنی جلدیں بکی ہیں؟

تیواری :(انکار میں سر ہلاتا ہے)

مہتہ :پانچ!

تیواری :(حیرت سے) صاف پانچ!

مہتہ :جی ہاں صرف پانچ۔ چھ مہینوں میں صرف پانچ جلدیں بکی ہیں۔

گپتا جی :(اندر آتے ہوئے) الٹے بانس بریلی کی بیس جلدیں جلدی سے باندھ دیجئے مہتہ جی۔

مہتہ :(گھبرا کر اور چونکا ہو کر گپتا جی کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اور کھسیانی ہنسی ہنس کر کہتا ہے) آیئے آیئے، گپتا جی بیٹھے۔

گپتا :نہیں، میں اس وقت نہیں بیٹھوں گا۔ گاہک دوکان پر کھڑا ہے۔

(مہتہ اٹھ کر ریک سے کتابیں نکال کر کونٹر پر رکھتا ہے)

گپتا :کتاب کیسی جا رہی ہے؟

مہتہ :اچھی جا رہی ہے۔ اگلے ماہ نیا ایڈیشن چھاپ رہا ہوں۔

گپتا :مزے ہیں تمہارے مہتہ جی!

(گپتا چلا جاتا ہے۔ مہتہ جاتے جاتے اس سے کہتا ہے)

مہتہ :آپ کی عنایت ہے...... (تیواری سے) دیکھ لیا۔ آپ کی عزت رکھنے کے لیے ہمیں کیا کیا جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ (طنزیہ ہنسی سے) کتاب کا نیا ایڈیشن چھاپ رہا ہوں۔ یہاں یہ حال ہے کہ چھ مہینوں میں یہ پہلا آرڈر آرہا ہے بیس کتابوں کا۔ وہ بھی کسی دوسرے کا۔ ہمیں کیا بچا؟ چالیس فیصد کمیشن تو یہ کمبخت گپتا لے گیا۔ پینتس فی صدی کتاب کی لاگت کھا گئی۔ باقی بچے پچیس فیصدی۔ اس میں سے پندرہ فی صدی رائلٹی تم لے گئے باقی بچے دس۔ اب دس کا حساب کرو۔ اس میں ڈاک خرچ ہے ملازموں کی

تنخواہ ہے۔ دوکان کا کرایہ ہے اور گودام کی انشورنس ہے۔ بنئے کا سود ہے۔ یہ سب لے دے کر میرے لئے اس میں کیا بچتا ہے؟ بینگن؟

تیواری :تو آپ یہ کام ہی کیوں کرتے ہیں؟

مہتہ :اجی کون کمبخت یہ کام کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اسّی ہزار کے مال کے کوئی آج چالیس ہزار دے تو میں اسی دم کھڑا کھڑا دوکان سے باہر ہو جاؤں۔ کیا سمجھتے ہیں آپ تیواری جی۔ یہ باہر جو میری موٹر کھڑی ہے کیا وہ ان کتابوں کی کمائی ہے؟ ہاہاہا۔ اجی صاحب دن بھر ادب کی خدمت کرتا ہوں۔ شام کو دوکان بند کر کے انشورنس کرتا ہوں۔ اس سے اپنے گھر کا خرچ اور اپنی موٹر گاڑی کا پٹرول چلاتا ہوں۔ مہتہ مہتہ اینڈ کمپنی بس نام ہی نام ہے اندر سے مت پوچھئے کیا حال ہے؟

(رک کر) ہاں آپ کیا کہہ رہے تھے؟

تیواری :(فوراً گھبرا کر) میں آپ سے کہنے آیا تھا کہ مجھے اس وقت ایک دس......

(آتمارام کھنگر داخل ہوتا ہے)

مہتہ :(فوراً رخ بدل کر) آیئے آیئے تشریف لایئے (تیواری سے) بھئی آپ سے ملئے۔ آپ ہیں شری آتمارام کھنگر۔ ہندی کے سب سے بڑے افسانہ نگار اور (تیواری کی طرف اشارہ کر کے) شری دین دیال تیواری۔ اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار۔

شری دین دیال تیواری :آپ کو کون نہیں جانتا۔

(ایک ساتھ)

شری آتمارام کھنگر :آپ کو کون نہیں جانتا۔

(دونوں ہاتھ ملا کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک چپراسی آتا ہے۔ مہتہ خط کی رسید دیتا ہے۔ تولارام آوارہ آ کر میز پر بیٹھ جاتا ہے۔ خاموشی سے ٹائپ کرنے لگتا ہے)

خاموشی کا وقفہ

شری دین دیال تیواری :آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

(ایک ساتھ)

شری آتما رام کھنگر : آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

کھنگر : میں ابھی آسام ہو کے آیا ہوں۔ ناگو قوم پر ایک ناول لکھ رہا ہوں۔

تیواری : میری کتاب ''الٹے بانس بریلی'' دوسرے ایڈیشن میں جا رہی ہے۔ اس کا جاپانی، روسی، فارسی اور گجراتی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

کھنگر : میری کتاب ''دیدی کے دریپ'' بھی انگریزی، پرتگالی، آئس لینڈک اور چیک...

مہتہ : (چونک کر) چیک! چیک؟ کون سے چیک کی بات کر رہے ہیں کھنگر جی! آپ اپنی کتاب ''دیدی کے دریپ'' کی ساری رائلٹی لے چکے ہیں۔ اب میرے پاس آپ کے لئے کوئی چیک نہیں۔

کھنگر : (ہنس کر) مہتہ جی! میں آپ کے بنک کی چیک کی بات نہیں کر رہا۔ میں تو چیک زبان کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں جس میں میری کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

مہتہ : (اطمینان سے) اوہ۔ تو ٹھیک ہے۔

(اتنے میں بیدل اور اصغر دونوں نوجوان شاعر بوسیدہ اچکنیں پہنے، لابنے بال بکھرائے، دائیں ونگ سے داخل ہو کر ایک دوسرے کو خاموشی سے پہلے آپ، کا اشارہ کرنے لگتے ہیں۔)

(دو شاعروں کو داخل ہوتے دیکھ کر مہتہ جی خوشی سے چلا کر کہتا ہے)

مہتہ : (کرسی سے اٹھ کر) ارے آج تو بڑے بڑے لوگ آ رہے ہیں۔ آیئے آیئے۔ تشریف لایئے۔ اصغر صاحب، بیدل صاحب۔ اندر تشریف لایئے نا۔

اصغر : (جھک کر) آداب عرض کرتا ہوں۔

بیدل : (اصغر سے زیادہ جھک کر) آداب عرض کرتا ہوں۔

مہتہ : (کرسی پیش کرتے ہوئے) یہاں تشریف رکھئے۔ آپ کے لئے چائے منگاؤں تو لا رام دائیں ونگ سے جاتا ہے اور اس کے جانے کے فوراً بعد بائیں ونگ سے مس اچلا کماری سکول انسپکٹرس ایک باوردی چپراسی کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔ مہتہ یکا یک کرسی سے اچھل کر بہت تیزی سے ونگ کی جانب بڑھ کے سکول انسپکٹرس کا استقبال

کرتا ہے۔)

مہتہ : آیئے۔آیئے۔ارے آپ خود کیسے تشریف لے آئیں؟ میں تو یہ دونوں بنڈل آپ کے گھر بھیجنے والا تھا۔ بالکل تیار کر کے رکھے تھے۔ یہ لیجئے۔ (ایک بنڈل اٹھا کر کونٹر پر رکھتا ہے) یہ کتابیں ہیں۔ یہ کاپیوں کا بنڈل ہے۔

(چپراسی بنڈل اٹھاتا ہے)

مہتہ : آپ نے خواہ مخواہ آنے کی تکلیف کی۔ میں بھیج رہا تھا مگر وہ میرا شاپ اسٹنٹ ایک ماہ کی چھٹی لے کر چلا گیا ہے۔

(تولا رام اندر آ کے خاموشی سے اپنی میز پر کام کرنے لگتا ہے)

اچلا کماری : نہیں میں تو ادھر سے گزر رہی تھی۔سوچا آپ سے ملتی جاؤں۔(گہری نظر سے مہتہ کی طرف دیکھ کر) وہ۔ میں نے کہہ دیا تھا ان سے ......وہ۔ہو جائے گا۔ (مسکرا کر سر ہلاتی ہے)

مہتہ : بڑا کرم کیا آپ نے۔(چپراسی سے) بھئی یہ بنڈل بھی لے لو۔

اچلا : اس میں کیا ہے؟

مہتہ : جی، پچھلے ماہ میری بیوی کشمیر گئی تھی۔آپ کے لئے پشمینے کا شال لائی ہے۔مجھ سے کہنے لگی میں یہ بہن جی کے لیے لائی ہوں۔ میں خود ان کے پاس لے کے جاؤں گی۔ آج دو پہر میں وہ خود آنے والی تھیں۔ یہ شال لے کر۔

اچلا : بہت بہت دھنیہ باد۔آج تو میں مل نہیں سکوں گی معائنے پر جانا ہے۔

مہتہ : کوئی بات نہیں۔ وہ ٹیلیفون کر کے آپ سے وقت لے لیں گی۔

(اچلا کماری ادیبوں کی طرف دیکھتی ہے۔مہتہ فوراً کہتا ہے)

مہتہ : (ادیبوں کی طرف اشارہ کر کے) آیئے۔آپ کو اپنے دیش کے کچھ مہان لکھکھوں سے ملائیں۔ دیکھئے آپ ہیں اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار شری دین دیال تیواری اور آپ ہندی کے سب سے بڑے افسانہ نگار شری آتما رام کھنگر اور آپ جناب بیدل اڑمڑ ناٹڈوی......

اچلا : کیا؟

بیدل : خاکسار کو بیدل اڑمڑ ٹانڈوی کہتے ہیں۔ میں اڑ مڑ ٹانڈے کا رہنے والا ہوں۔ ہمارے ہاں تخلص کے بعد شاعر لوگ اپنی سکونت کا پتہ بتاتے ہیں۔ جیسے ولی دکنی، غالب دہلوی اور (جھک کر) خاکسار بیدل اڑمڑ ٹانڈوی......

اچلا : اوہ!

مہتہ : اور آپ جناب بیدل اڑمڑ ٹانڈوی ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر اور آپ جناب اصغر جھن جھن جھانوی پاکستان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

(جناب اصغر جھن جھن جھانوی خاموشی سے آداب عرض کرنے کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں)

اچلا : (تولا رام کی طرف دیکھ کے) اور آپ؟

تولا رام : خاکسار ہندوستان، پاکستان اور افغانستان کا سب سے بڑا ٹائپسٹ ہے۔

مہتہ : (کھسیانی ہنسی ہنس کر) جی۔ آپ تو دکان پر کام کرتے ہیں۔ مگر ادیب نہیں ہیں .... (پھر پلٹ کر فوراً ہی) آپ ہیں مس اچلا کماری ہمارے شہر کی میونسپل مدارس کی انسپکٹرس۔

تیواری : نمستے!

کھنگر : نمستے!

بیدل اڑمڑ ٹانڈوی : آداب عرض کرتا ہوں

اصغر جھن جھن جھانوی : آداب عرض کرتا ہوں

(اسی دوران میں چائے والا ٹرے لا کے میز پر رکھ کے چلا جاتا ہے۔)

مہتہ : چائے پیجئے۔

اچلا : (گھڑی دیکھ کر) مجھے جانا ہے۔

بیدل : ارے ایک منٹ تو بیٹھے نا صاحب۔

اچلا : مجھے ادیبوں اور لیکھکھوں سے مل کر بہت خوشی ہوتی ہے۔

تیواری : ہمیں بھی بہت خوشی ہوتی ہے۔ خصوصاً میونسپل سکولوں کی انسپکٹروں سے مل کر......

اچلا : کیوں یہ میونسپل سکول کی انسپکٹرس کی کیا خصوصیت ہے۔

تیواری : دیکھئے نا میرا مطلب ہے۔ میونسپل سکولوں میں بچے تعلیم پاتے ہیں اور بچے قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس لئے جب آپ ایسی ہستیاں معلم اخلاق بنیں تو......

بیدل : (بات کاٹ کر) جی ہاں بجا فرمایا آپ نے۔ دراصل زندگی میں اخلاق کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ دیکھئے اسی اہمیت کو میں نے اپنے تازہ کلام میں یوں ظاہر کیا ہے۔

(جیب سے ایک پرزہ نکال کر پڑھنے لگتا ہے)

بیدل : عرض کیا ہے

(اچلا اپنی کرسی پر بے چین ہوتی ہے مگر کچھ کہہ نہیں سکتی، بیدل گلا صاف کر کے فوراً پڑھنے لگتے ہیں۔)

بیدل اڑمڑ ٹانڈوی

اخلاق

....

(بیدل اڑمڑ ٹانڈوی کے کلام کے دوران میں مہتہ جی چائے بنا کر باری باری پیش کرتے جاتے ہیں۔ بیدل اڑمڑ ٹانڈوی اپنا کلام سنا کر اور داد وصول کر کے وہ کاغذ پرزہ اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھ اچلا کماری کے سامنے بڑھاتا ہے۔)

بیدل اڑمڑ ٹانڈوی : آپ کی نذر ہے۔

اچلا : (کاغذ کا پرزہ لے کر) شکریہ!

(کاغذ کا پرزہ پرس میں ڈال کر اٹھنا چاہتی ہے کہ اصغر بول اٹھتے ہیں)

اصغر جھن جھن جھانوی : یہ تو صحیح ہے کہ زندگی میں اخلاق کی بے حد ضرورت ہے۔

بیدل : بے حد۔

اصغر : مگر صرف حسن اخلاق سے کام نہیں چل سکتا۔

مہتہ : نہیں چل سکتا ہے۔

اصغر :اس کے لئے حسن نظر بھی چاہئے۔

کھنگر :چاہئے۔

اصغر :اور حسن نظر کے لئے یہ ضروری ہے کہ زندگی محبت سے عبارت ہو۔ چنانچہ اسی خیال کو میں نے اپنے چند ناقص اشعار میں یوں ادا کیا ہے۔ (جیب سے ایک پھٹا پرزہ نکال کر فوراً پڑھنے لگتا ہے۔ اچلا کماری بہت بے چین دکھائی دیتی ہے۔ بیدل، تیواری اور کھنگر بھی پریشان نظر آتے ہیں۔ لیکن کچھ کر نہیں سکتے۔ کیونکہ اصغر جھن جھن جھانوی نے پڑھنا شروع کر دیا ہے۔)

غزل بہ عنوان محبت

....

(اصغر جھن جھن جھانوی اپنا کلام ختم کر کے اس بوسیدہ پرزے کو لپیٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اچلا کماری کے سامنے بڑھاتے ہیں۔)

اصغر :آپ کی نذر ہے۔

اچلا کماری :شکریہ!

(پرزہ پرس میں رکھتی ہے۔ اتنے میں شری آتمارام کھنگر اچلا کماری کا ہاتھ پکڑ کے کہتے ہیں۔)

کھنگر :جناب اصغر جھن جھن جھانوی اور جناب بیدل اڑمڑ ٹانڈوی نے جو فرمایا ہے وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے۔ صحیح ہے اور مناسب ہے۔ مگر میں نے ان دونوں حضرات کے خیالات کو ایک ہی افسانے میں سمو کر پیش کر دیا ہے۔ (جیب سے ایک کتابچہ نکالتے ہوئے۔ یہ ایک چھوٹی سی پینسٹھ صفحے کی کہانی ہے اس کا عنوان ہے ''شتر مرغ کے انڈے'')

اچلا :مگر......

کھنگر :شتر مرغ کے اپنے پر پھڑ پھڑائے۔

اچلا :جی۔

کھنگر :اور پنجے ریت میں گاڑ دیئے پھر اپنی لمبی تھوتھنی......

اچلا :(بالکل بے چین ہو کر) دیکھئے۔!

کھنگر :جس کے باریک روئیں پر گھاس کے دو تنکے الجھے ہوئے تھے۔

اصغر :واہ واہ کیا جذبات نگاری سے کام لیا ہے۔

کھنگر :اور ان دو تنکوں کے درمیان شبنم کا ایک قطرہ صبح کے تارے کی طرح لرز رہا تھا......

بیدل :شاعری ہے صاحب شاعری!

کھنگر :شتر مرغ نے اپنی لمبی تھوتھنی شتر مرغی کی طرف بڑھا کر چونچ کھول کر تیں تیں کرتے ہوئے......

اچلا :(یکا یک بہت بے چین ہو کر کرسی سے اٹھ جاتی ہے) معاف فرمایئے مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بہت سے اسکولوں میں معائنے کے لیے جانا ہے۔ پھر کبھی سن لوں گی۔

کھنگر :محترمہ یہ افسانہ تو لیتی جایئے۔ مہتہ جی ذرا اپنا قلم دیجئے گا۔

(کھنگر مہتہ جی سے قلم لے کر اپنی کتاب پر دستخط کرنے لگتا ہے۔ اسے دستخط کرتے دیکھ کر تیواری بھی کرسی سے اٹھ کر کونٹر پر پڑی ہوئی اپنی کتاب ''الٹے بانس بریلی'' اٹھا کر لاتا ہے اور میز پر پڑے ہوئے قلم سے دستخط کرنے لگتا ہے۔ اتنے میں کھنگر جو دستخط کر چکا ہے۔ کتاب اچلا کماری کی نذر کرتا ہے۔ اچلا جانے کے لئے مڑتی ہے کہ اس کا سامنا تیواری سے ہوتا ہے۔ جو اپنی کتاب آگے بڑھائے ہوئے ہے۔)

تیواری :یہ بھی لیتی جایئے! (کتاب پیش کرتا ہے۔)

اچلا :یہ کیا ہے؟ الٹے بانس بریلی!

تیواری :یہ میری تین طویل کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ پہلی کہانی کا عنوان ہے ''الٹے'' دوسری کا 'بانس' تیسری کا ''بریلی'' تینوں کہانیاں ملا کر ایک مشہور ضرب المثل بن جاتی ہے۔

اچلا :الٹے بانس بریلی! بہت خوب شکریہ! تیواری جی ایک دن میں مہتہ جی کو ٹیلیفون کر کے آپ سب کو چائے پر بلواؤں گی نمستے!

(اچلا کماری جلدی سے چلی جاتی ہے۔ مہتہ بائیں ونگ تک اس کے ساتھ پیچھے پیچھے

جاتا ہے۔ جب واپس اتا ہے تو اصغر اور بیدل دونوں اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور جیب سے چند لفافے نکال کر کہتے ہیں۔)

اصغر :مہتہ جی آپ ہمارے مشاعرے میں ضرور تشریف لائیے گا (سب کو کارڈ بانٹتے ہیں) حاجی ملک دین کی صدارت میں یہ مشاعرہ ہے۔

مہتہ :کون حاجی ملک دین؟

اصغر :وہی جی۔ انجمن ریڑھی فروشان کے صدر جن کا گھوڑا پچھلی ریس میں اول آیا ہے اسی خوشی میں حاجی جی نے یہ مشاعرہ کیا ہے۔ دو ایک عمدہ قصیدے گھوڑے کی شان میں کہے جائیں گے۔ باقی غزلیں ہوں گی۔ جناب مرزا قرولباغوی اور جناب نشتر نئی دہلوی بھی تشریف لا رہے ہیں۔ ضرور آیئے گا۔

مہتہ :ضرور آئیں گے صاحب!

بیدل :ضرور!

اصغر :آداب عرض ہے۔

بیدل :آداب عرض ہے۔

(دونوں شاعر چلے جاتے ہیں۔ چند لمحوں کے لئے دکان میں سناٹا ہو جاتا ہے۔ دونوں افسانہ نگار آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ مہتہ جی بظاہر دونوں سے بے نیاز کونٹر پر کچھ کتابیں گن کر بنڈل باندھ رہے ہیں۔)

تیواری :(آہستہ سے کھنگر کے قریب جھک کر) آپ کو ان سے کچھ کہنا ہو تو بات کر لیجئے۔

کھنگر :نہیں پہلے آپ بات کر لیجئے۔

تیواری :میری بات تو ذرا لمبی ہوگی۔

کھنگر :تو میں پھر آجاؤں گا۔ کل ول کسی وقت۔
(کھنگر اٹھ کے جانے لگتا ہے۔)

مہتہ :جا رہے ہیں

کھنگر :جی۔

مہتہ :کوئی خاص بات تھی؟

کھنگر :جی نہیں، یونہی درشنوں کو چلا آیا تھا۔

مہتہ :نمستے

کھنگر :نمستے

(کھنگر چلا جاتا ہے۔اس کے جانے کے بعد تیواری مہتہ سے بات کرنے کے لئے کونٹر کی طرف جاتا ہے لیکن مہتہ کتابیں اٹھائے کونٹر سے تولا رام کی طرف چلا جاتا ہے۔تیواری پھر کونٹر سے واپس تولا رام کی میز کی طرف آتا ہے۔)

مہتہ :(تولا رام سے) یہ کتابیں نیشنل بک ایجنسی اجین جائیں گی۔

(اتنا کہہ کر تیواری کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر مہتہ پھر کونٹر کی طرف جاتا ہے اور دوسرا بنڈل اٹھاتا ہے۔تیواری پھر تولا رام کی میز سے کونٹر کی طرف بڑھتا ہے۔لیکن اتنے میں مہتہ دوسرا بنڈل اٹھائے ہوئے پھر کونٹر سے تولا رام کی میز کی طرف چلا آتا ہے۔تیواری پھر کونٹر سے تولا رام کی میز کی طرف بڑھتا ہے۔)

مہتہ :(تولا رام سے) یہ بمبئی کتاب گھر کو وی پی کر دو......

(پھر کونٹر کی جانب مڑتا ہے۔اب کے تیواری جلدی سے کونٹر پر اس کے کوٹ کی آستین پکڑ لیتا ہے اور اس کی طرف بہت ہی ملتجیانہ انداز سے دیکھ کر کہتا ہے۔)

تیواری :مہتہ جی! میری بیوی بہت سخت بیمار ہے۔مجھے دس روپے چاہئیں۔

مہتہ :دس روپے؟ (طنزیہ ہنسی ہنس کر) یہاں دس پیسے نہیں ہیں۔دس پھوٹی کوڑیاں نہیں ہیں۔

تیواری :وہ بہت سخت بیمار ہے۔

مہتہ :کتابیں بکتی نہیں ہیں۔پڑھا لکھا امیر طبقہ انگریزی کتابیں پڑھتا ہے۔اپنے ملک کی زبان کی کتابیں نہیں خریدتا۔جو غریب پڑھے لکھے ہیں ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔پھر آپ کا سٹائل پہلے سے بہت کمزور ہو گیا ہے۔

تیواری :میری بیوی بھی بہت کمزور ہو گئی ہے۔

مہتہ : آپ کے قلم میں وہ طاقت وہ قوت نہیں رہی۔

تیواری : اسے دودھ، چائے وٹامن اور مقوی غذا.....

مہتہ : وہ خوبصورت رنگینی کیا ہوئی۔ لوگ آپ کے نئے افسانوں میں اپنے پرانے تیواری کو پہچان نہیں سکتے۔

تیواری : کسی نے اس کے رخساروں کا سارا رنگ چوس لیا ہے۔ مہتہ جی آپ اپنی بھابھی کو دیکھیں تو پہچان نہ سکیں گی۔

(کونٹر سے بنڈل اٹھا کر مہتہ پھر واپس تولارام کی طرف جاتا ہے۔ اب کے تیواری افسردہ اور مایوس وہیں کونٹر پر کھڑا رہتا ہے۔ مہتہ تولارام سے کان میں کچھ کہہ کر پھر واپس جاتا ہے اور کونٹر پر بنڈل باندھنے لگتا ہے۔)

مہتہ : آپ کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے؟ ہندوستان میں ادیب صرف ادب سے اپنی روٹی نہیں کما سکتا۔

تیواری : آپ کپڑا بننے والے سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ ساتھ میں سنار کا کام بھی کرے سنار سے یہ کیوں توقع نہیں رکھتے کہ وہ ڈاکٹری بھی کرے ڈاکٹر سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ سبزی بیچنے والے سے اسکول کی انسپکٹری کرنے کو کیوں نہیں کہتے۔ اسکول کے انسپکٹر کو گھاس کاٹنے کے لیے کیوں نہیں کہتے۔ گھاس کاٹنے والے کو کیوں آل انڈیا کرکٹ ٹیم کا کپتان نہیں بنا دیتے؟ اس ہندوستان میں ہر پیشہ ور کو اس کے پیشے سے روٹی ملتی ہے۔ صرف ادیب کو اس کے ادب سے روٹی نہیں مل سکتی۔

مہتہ : آپ تو خفا ہو گئے۔

تیواری : نہیں میں خفا نہیں ہوں۔ بتایئے میں کیا کام کروں میں کام کرنے کے لئے آمادہ ہوں آپ کا ملازم بنسی لال جو اس کونٹر پر کتابیں بیچتا تھا ایک ماہ سے چھٹی پر ہے۔ بتایئے کیا آپ مجھے اس کی جگہ دینے پر آمادہ ہیں؟ صرف ایک ماہ کے لئے میری بیوی بیمار ہے۔ مجھے اس کے لئے دوا چاہیے۔ دودھ چاہیے۔ وٹامن چاہئے۔ سردی سے بچنے کے لیے ایک کمبل چاہئے۔ بولئے آپ خاموش کیوں ہیں آپ یہ کام دیں گے

مجھے......؟

مہتہ : اگر آپ یہ کام کر سکیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مگر اتنا بڑا ادیب......؟

تیواری : اتنا بڑا ادیب بھی پیٹ رکھتا ہے۔ ٹانگیں اور باہیں، آنکھ اور کان، دل اور دماغ رکھتا ہے۔ خواہشیں اور آرزوئیں رکھتا ہے۔ اس کا جسم بھی سردی سے کانپتا ہے اور گرمی سے پسینے میں شرابور ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ایک حقیر سے حقیر کیڑے کو بھی خوراک چاہیے۔ پھر آپ ایک ادیب سے یہ کیسے توقع کرتے ہیں کہ وہ ہوا پر زندہ رہ سکتا ہے۔ کاش ادیب ایک دیمک ہوتا اور اپنی کتابوں کو چاٹ سکتا تو مجھے آپ کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ پڑتے......

مہتہ : کاغذی بھی کاغذ کی قیمت لیتا ہے۔ آپ بھی رائلٹی مجھ سے لے چکے ہیں۔ آپ ہم پبلشروں کی تکلیفوں کو نہیں جانتے۔ اس ملک میں کاغذ سے لے کے کھاد کے کارخانے تک کو Subsidize کرنے والے موجود ہیں لیکن علم اور فن کو Subsidize کرنے والا کوئی نہیں ہے مگر۔ آیئے آپ کونٹر کے ادھر کھڑے کیوں رہیں۔ یہاں آ کر کام کیجئے اور دیکھ لیجئے کہ اس علم و فن کی تجارت میں کیا ہے۔ اول تو صبح سے کوئی گاہک نہیں آیا۔

(تیواری کونٹر پر جاتے ہیں ایک دبلا پتلا لمبا آدمی دوکان کے اندر داخل ہو کے کونٹر کے قریب آتا ہے)

تیواری : فرمایئے؟

گاہک : (ادھر ادھر دیکھ کر) ایک کتاب خریدتا ہے۔

تیواری : (لہجے میں بشاشت لا کر سیلز مین کا سا انداز پیدا کرتے ہوئے اور کتابیں ریک سے نکال کر دکھاتے ہوئے) فرمایئے کیا خریدیئے گا۔ دیکھئے۔ یہ پریم چند کا گئودان ہے۔ یہ غالب کا دیوان ہے۔ یہ ٹیگور کی گیتا نجلی ہے۔ یہ......۔

گاہک : (آہستہ سے) آپ کے پاس اصلی کشمیری کوک شاستر ہے؟

تیواری : (جی۔ (ایک طویل خاموش وقفہ۔ مہتہ اس طویل خاموشی کے مزے لے رہا ہے) جی

اصلی کشمیری......وہ تو عرصہ ہوا سرکار ضبط کر چکی......

(گاہک جانے کے لے مڑتا ہے۔ مہتہ کونٹر پر آتا ہے)

مہتہ: وہ تو ضبط ہو چکا۔ مگر میرے پاس ایک اس سے بھی عمدہ چیز ہے۔ (دکھاتا ہے) پچپن رنگین تصویروں والی ہے۔ تنہائی میں دیکھنے کی چیز ہے۔ صرف خاص خاص گاہکوں کو بیچتا ہوں۔ قیمت پندرہ روپئے سے کم نہیں ہوگی۔

(گاہک تھوڑی دیر کتاب کی تصویریں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ پھر وہ جیب سے پندرہ روپئے نکال کر دے دیتا ہے اور چلا جاتا ہے)

مہتہ: (تیواری کی طرف دیکھ کے) اونہہ الٹے بانس بریلی۔

(پھر واپس اپنی میز کی طرف چلتا ہے)

(اتنے میں ایک اور گاہک اندر آ جاتا ہے اس کے پیچھے ایک اور گاہک آتا ہے۔)

گاہک نمبر۲: نیلی چھتری ہے؟

تیواری: یہ چھتریوں کی دوکان نہیں ہے۔

گاہک نمبر۲: جاسوسی گھوڑا ہے؟

تیواری: ہم گھوڑے نہیں بیچتے۔

مہتہ: (فوراً اپنی کرسی سے اچھل کر کونٹر کی طرف آتے ہوئے) ہے صاحب ہے۔ نیلی چھتری ہے اور جاسوسی گھوڑا بھی ہے۔ معاف کیجئے گا۔ یہ سیلز مین میں نے نیا نیا رکھا ہے۔ آج ہی۔ ابھی اسے فہرست کتب سے آگاہی نہیں ہوئی۔ اس لئے......معاف کیجئے گا......یہ لیجئے گا۔ چار روپئے سات آنے کمیشن کاٹ کے......یہ دو روپئے پانچ آنے کمیشن کاٹ کے......دونوں کتابیں حاضر ہیں۔ (گاہک نمبر۲ سے) یہ رہی نیلی چھتری......اور......(گاہک نمبر۳ کو پیش کرتے ہوئے)......یہ جاسوسی گھوڑا......۔

گاہک نمبر۳: شکریہ! مگر آپ کا سیلز مین ہے بہت بدتمیز۔

(تیواری کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا ہے کہ مہتہ جلدی سے اس کے زور کی چٹکی لے کے

آنکھ مارتا ہے۔ تیواری غصے میں ہے لیکن چپ ہو جاتا ہے۔)

گاہک نمبر۲: اگر یہ اسی طرح بکتا رہے گا۔ ہم تو کبھی اس دوکان پر نہیں آئیں گے۔

مہتہ: میں آپ سے ہزار بار معافی چاہتا ہوں آئندہ اس سے ایسی غلطی نہ ہوگی۔

(دونوں گاہک چلے جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ہی تیواری بھڑک اٹھتا ہے)

تیواری: جاہل، ان پڑھ، بے ادب خود ہیں۔ اچھے اور بُرے ادب میں تمیز نہیں کرتے اور ہمیں تمیز سکھانے چلے ہیں۔

مہتہ: گاہک ہمیشہ سچ کہتا ہے۔ درست کہتا ہے اور صحیح کہتا ہے۔ دوکان دار کا گاہک خدا ہے۔ اگر یہ خدا نہ ہو تو دوکان دار بھوکا مر جائے۔ اس اصول کو تیواری جی ہمیشہ یاد رکھو۔ اگر کتابیں بیچنی ہیں تو گاہک کی مرضی پر چلو۔ اس کی نگاہ پہچانو۔ وہ کیا چاہتا ہے اور وہی دو جو وہ چاہتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی زبان شیریں ہوگی تو گاہک شہد کی مکھی کی طرح اڑتا ہوا آئے گا۔ تلخ کلامی سے گاہک کبھی دوبارہ دوکان پر نہیں آتا اور پھر تم کون ہو ان کی پسند ناپسند کا فیصلہ کرنے والے اگر گاہک جاسوسی ناول اور مار دھاڑ کی کہانیاں پڑھنا چاہتا ہے تو تم اپنی سماجی نصیحتوں سے بھری ہوئی کتابیں ان پر کیسے ٹھونس سکتے ہو؟

تیواری: ہم انہیں یہ تو بتا سکتے ہیں کہ کون سی کتاب اچھی ہے کون سی بری۔

مہتہ: میری دوکان کی ہر کتاب اچھی ہے اور گاہک جو کتاب مانگتا ہے وہ اچھی ہی کتاب مانگتا ہے۔ اگر آپ کو کام کرنا ہو تو اس اصول پر چلئے مجھے کتابیں بیچ کر نفع کمانا ہے۔ کوئی سماج سدھار کا کام نہیں کرنا ہے۔

تیواری: (شرمندہ ہو کر) آئندہ خیال رکھوں گا۔

(مہتہ تھوڑی دیر تک غصہ سے تیواری کی طرف دیکھ کر واپس اپنی میز پر چلا جاتا ہے۔ اتنے میں ایک نہایت خوبصورت خوش پوش لڑکی اندر آتی ہے اور کوئنٹر پر کھڑی ہو جاتی ہے۔)

خوبصورت لڑکی: منشی پریم چند کا غبن ہے۔

تیواری : جی یہ لیجئے

خوبصورت لڑکی: مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا؟

تیواری : یہ حاضر ہے۔

خوبصورت لڑکی: بس ایک ناول اور چاہئے کوئی اچھا سا ناول بتایئے۔ اچھا ٹھہرئے۔ وہ۔ دین دیال تیواری کا کوئی نیا ناول ہے؟

تیواری : دو ہیں...... (ریک سے کتابیں اٹھا کر) ایک تو یہ ہے دل کی فریاد۔ دوسرا یہ ہے الٹے بانس بریلی۔

خوبصورت لڑکی: دونوں میں کون سا اچھا ہے؟

تیواری : میرے خیال تو دل کی فریاد اچھا ہے۔ اس میں زبان اور موضوع میں ہم آہنگی ہے۔ کرداروں کا ارتقا سماجی ماحول سے الگ نہیں ہے اور جذبات کی مصوری میں ایک مخصوص توازن ہے......

مہتہ : (فوراً کونٹر پر آکر) اجی خاک توازن نہیں ہے۔ دونوں کتابوں کا مقابلہ کیا' الٹے بانس بریلی' مصنف کی بہترین کتاب ہے۔ یہ دل کی فریاد تو سچ مچ ہماری دوکان پر فریاد بن کر رہ گئی ہے۔ آٹھ مہینے سے پڑی ہے۔ کوئی کتاب اٹھاتا ہی نہیں۔ دو گاہکوں کو بہت مشکل سے گھیر گھار کے دی تھی۔ دونوں آدھی کتاب پڑھ کے واپس دے گئے ہیں۔ آپ تو ہماری دوکان کے پرانی گاہک ہیں۔ میں آپ کو دھوکا نہیں دوں گا۔ آپ کو اگر تیواری جی کی بہترین کتاب خریدنا ہے تو الٹے بانس بریلی خریدیئے۔ اب تک چھ سو کاپیاں فروخت کر چکا ہوں۔ جو لوگ ایک دفعہ خریدتے ہیں اپنے دوستوں کو خریدوانے کے لئے ساتھ لاتے ہیں۔ یہ دل کی فریاد تو معاف کیجئے گا محض بکواس ہے۔ مصنف نے بالکل ٹالنے کے لیے لکھ دی ہے۔

خوبصورت لڑکی: اچھا تو ایک جلد' الٹے بانس بریلی' کی دے دیجئے۔ اور دل کی فریاد واپس رکھ لیجئے۔

مہتہ : بہت اچھا۔

(جلدی سے رسید کاٹ کر کتاب دیتا ہے۔ خوبصورت لڑکی خراماں خراماں چلی جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد ہی تیواری بہت غصے سے مہتہ کی طرف مڑ کے کہتا ہے۔)

تیواری : میری زندگی بھر کے شاہکار کو آپ نے بکواس کہہ دیا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ الٹے بانس بریلی میری کمزور ترین کتاب ہے اور ابھی آپ نے۔ ابھی آپ نے خود میرے آتے ہی مجھ سے یہی کہا تھا۔ اب آپ اتنی جلدی بدل گئے اور میری سب سے اچھی کتاب کو یوں سب سے بری کہہ دیا اور وہ بھی میرے سامنے۔ آپ کو شرم نہیں آتی؟

مہتہ : اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ یہ تو سیدھی سادی بزنس کی بات ہے۔ دل کی فریاد اور الٹے بانس بریلی دونوں ایک ہی مصنف کی کتابیں ہیں۔

تیواری : لیکن آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دل کی فریاد میری بہترین کتاب ہے۔

مہتہ : جانتا ہوں۔

تیواری : پھر آپ نے اس۔ اس کے سامنے اسے برا کیوں کہا؟

مہتہ : بزنس میں کہنا ہی پڑتا ہے بھائی۔ دیکھو، یہ کتاب تمہاری دل کی فریاد نیشنل بک کلب نے چھاپی ہے۔ الٹے بانس بریلی میں نے چھاپی ہے۔ میں تو اپنی کتاب کی تعریف کروں گا ہی۔ کیونکہ یہ میرے ہاں چھپی ہے۔ یہ بکے گی تو مجھے زیادہ منافع ملے گا۔ دوکاندار کا منافع بھی میرے گھر آئے گا۔

تیواری : منافع ہی سب کچھ ہے، ادب کا معیار کچھ نہیں؟ میرا نام؟

مہتہ : مجھے نام سے نہیں دام سے کام ہے۔ دیکھئے تیواری جی! آپ کو اگر کام کرنا ہے تو سیدھے طریقے سے کیجئے۔ یہاں تو ایسا ہی ہوگا۔ یہ دیکھئے ناکام چڑیا کوٹی کا ناول ایکٹرس کی آپ بیتی ایک غلیظ گندی کتاب ہے۔ آپ کے ناول، دل کی فریاد اور اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کی کتاب ادب ہے، وہ غلاظت ہے۔ یہ سماج کا نشتر ہے تو وہ اس کا ناسور ہے۔ لیکن دل کی فریاد نیشنل بک کلب نے چھاپی ہے۔ اور

ایکٹرس کی آپ بیتی میں نے چھاپی ہے۔اس لئے گاہک اگر ان کے بارے میں میری پسند پوچھے گا تو میں تو اپنے ہاں کی چھپی ہوئی کتاب کی تعریف کروں گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں غلیظ بات کہہ رہا ہوں میں پھر بھی اسی کی تعریف کروں گا۔

تیواری :یہ کھلی بے ایمانی ہے۔

مہتہ :نہیں یہ بزنس ہے۔

تیواری :میں۔میں یہ کام نہیں کرسکتا۔آپ کسی دوسرے کو یہ کام سونپ دیجئے۔مجھ سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔

مہتہ :آپ کی مرضی......

(تیواری کونٹر کے باہر آجاتا ہے اور دائیں ونگ کی طرف چلنے لگتا ہے۔یکا یک اسی ونگ کی جانب سے ایک میلے کچیلے لباس میں ملبوس عورت ایک ننھے سے بچے کا ہاتھ پکڑے بھیک مانگتے ہوئے دوکان کے سامنے سے گزرتی ہے۔)

عورت :بابا ایک پیسہ

بچہ :خدا کے نام پر ایک پیسہ

عورت :بابا ایک پیسہ

بچہ :خدا کے نام پر ایک پیسہ

(بھیک مانگتے ہوئے عورت اور بچہ دونوں بائیں سے دائیں ونگ میں غائب ہوجاتے ہیں۔تیواری وہیں خاموش کھڑا ہے۔فضا میں کچھ دیکھ رہا ہے۔اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔وہ آہستہ سے واپس ہوتا ہے اور کونٹر کے اندر آجاتا ہے۔)

مہتہ :کیا ہوا؟ ارادہ بدل دیا؟

تیواری :(آبدیدہ ہوکر) میں نے اپنی بیوی کو دیکھا، میں نے اپنے بچے کو دیکھا وہ دونوں ہاتھ پھیلائے مجھ سے بھیک مانگ رہے تھے۔بابا ایک پیسہ خدا کی راہ میں ایک پیسہ......

(مہتہ پیٹھ موڑ کر کتابیں ریک میں ٹھیک کرنے لگتا ہے)

(اتنے میں ایک چگی داڑھی والا دہرے بدن کا آدمی تنگ اچکن اور تنگ پائجامہ پہنے

ہوئے داخل ہوتا ہے۔اس کے ہاتھ میں کتابوں کا ایک بہت بڑا بنڈل ہے)

مہتہ :آؤ آؤ کمال بھائی۔ یہ کیا اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہو؟

کمال الدین:تمہارے لئے لایا ہوں۔'دست صبا' کی تیس کاپیاں ہیں۔

مہتہ :مگر دست صبا تو یہاں ایک پبلشر نے چھاپی ہے۔

کمال :میں نے بھی چھاپ لی ہے۔

مہتہ :مگر کیسے؟ مصنف کی اجازت سے؟

کمال :فیض تو پاکستان جیل میں ہے۔اس کی اجازت کیا ضروری ہے؟

مہتہ :مگر بھائی!

کمال :تم بات کرو نا تمہیں۔ یہ کتابیں لینی ہیں کہ نہیں۔ دست صبا پر پچیس فیصدی کمیشن ملتا ہے۔ میں تمہیں پچاس فیصدی کمیشن دیتا ہوں۔

تیواری :آپ ایک غریب مصنف کی رائلٹی مار رہے ہیں اور وہ مصنف بھی جیل میں ہے۔

کمال :جیل سے باہر بھی ہوتا تو میرا کیا کر لیتا؟ یہاں کتنے پبلشر ہیں جنہوں نے بہت سے ایسے پاکستانی مصنفوں کی کتابیں چھاپ ڈالی ہیں جو جیل سے باہر ہیں بلکہ کبھی جیل ہی نہیں گئے۔ اسی طرح وہاں کے ناشروں نے یہاں کے مصنفوں کی کتابیں بلا اجازت چھاپ ڈالی ہیں۔ دونوں ملکوں میں کتابوں کی خرید وفروخت کے سلسلے میں کوئی آسانی نہیں ہے۔اس لئے کون پوچھے گا؟

تیواری :جب دو ملک لڑتے ہیں تو کتابیں پہلے قتل ہوتی ہیں۔ بے گناہوں کے خون میں مصنفوں کی محنت کا خون بھی شامل ہوتا ہے......

کمال :اس درجہ جذباتی بننے کی ضرورت نہیں ہے تیواری جی! کہئے تو میں آپ کی کتاب الٹے بانس بریلی بھی یہاں چھاپ ڈالوں اور آپ کے مہتہ جی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جالندھر کے کسی انٹ سنٹ پریس میں چھپوالوں گا امرتسر کی کسی غلط سلط بک ایجنسی کا نام دے دوں گا۔کتابیں میرے پاس نہیں ہوں گی۔ پھر بھی بیچوں گا۔ جیسے یہ دست صبا بیچ رہا ہوں۔آپ ڈھائی میں دیں گے میں پونے دو میں بیچوں گا۔آپ کی دست صبا،

دھری رہے گی۔ میری دست صبا بک جائے گی۔ حالانکہ وہی فیض کی شاعری ہے۔
وہی اس کا حسن ہے، وہی اس کا سوز و گداز ہے، وہی لہجے کا لوچ ہے۔

تیواری : (ایک تلخ تلخ ہنسی ہنس کر) ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔

کمال الدین: کیا کریں آج کل چاروں طرف مندہ ہے۔ شرافت سے کوئی بزنس ہی نہیں ہوتا۔

مہتہ : (آہ بھر کر) سچ کہتے ہو کمال الدین...... اچھا تمیں کا پیاں رکھ جاؤ اور تمیں کا پیاں اور دے جاؤ۔ مگر کمیشن ساٹھ فیصدی لوں گا۔

کمال الدین: لے لو۔ یہاں کونسا باوا کے گھر سے مال جاتا ہے۔

(کتابیں رکھ کر کمال الدین دوکان سے رخصت ہوتا ہے۔ اس کے جاتے ہی ایک گورا چٹا نوجوان اور اس کے ساتھ ایک سلیکس پہنے ہوئے طرحدار لڑکی داخل ہوتی ہے۔ نوجوان نے شوخ رنگوں والا بش کوٹ پہن رکھا ہے۔ اور جس کپڑے کا اس بش کوٹ پہن رکھا ہے اسی کپڑے اور رنگ اور ڈیزائن کی لڑکے نے پتلون پہن رکھی ہے۔ پہلی نظر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ لڑکا آدھی لڑکی ہے اور لڑکی آدھا لڑکا ہے۔)

نوجوان : ایک رائٹنگ پیڈ دے دیجئے۔ ایک لفافوں کا پیکٹ اور ایک تاش۔

(تیواری سامان دکھا کے لفافے میں بند کرتا ہے)

لڑکی : ٹھہریئے۔ ڈارلنگ نینی تال تک جاتے جاتے میں تو سخت بور ہو جاؤں گی۔

نوجوان : پھر؟

لڑکی : کچھ ناول کیوں نہ لے لیں؟

نوجوان : گڈ آئیڈیا۔ آپ کے پاس کچھ اچھے ہنسنے ہنسانے والے ناول ہیں؟

تیواری : (ریک سے بہت سے ناول نکال کر سامنے کونٹر پر بکھیر دیتا ہے) پسند فرمایئے!

نوجوان : (کتابیں اٹھا اٹھا کے ٹائٹل پڑھتا ہے۔ ناکام آرزو، سونے کا محل، سماج کا پنجرا، نئے غلام، بیج۔ ہونہہ، ایک ایک کر کے کتابیں پلٹ کر رکھ دیتا ہے) سب بکواس......
(ایک کتاب اٹھا کر) محبت کیسے کی جاتی ہے؟...... یہ کتاب اچھی معلوم ہوتی ہے۔
نغمے کی موت، دست صبا، خالی ڈبے، خالی بوتلیں، نئی بیماری، گرہن، کیسی کتابیں ہیں یہ

ڈارلنگ! ان کے نام تک سے مایوسی ٹپکتی ہے۔ یہ کیا ہے گناہ کی پانچ راتیں...... اس میں کچھ ہوگا (الگ کر لیتا ہے) یہ دل کی دھڑکن نام تو کچھ نہیں مگر ٹائٹل اچھا ہے۔ (الگ رکھ لیتا ہے) یہ کیا ہے جھیل کے کنارے...... نینی تال جا رہے ہیں...... یہ ٹائٹل اچھا رہے گا۔ (الگ رکھ لیتا ہے) مقالات افلاطون، ہمارا دوسرا پانچ سالہ پلان، قومی زندگی، تھو! (سب پرے دھکیل دیتا ہے) ڈارلنگ! تم نے کون سی کتابیں پسند کی ہیں؟

لڑکی : میں نے دو چنی ہیں۔ دل کی فریاد، از دین دیال تیواری اور یہ ایکٹرس کی آپ بیتی، از نا کام چڑیا کوئی...... لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا ان دونوں میں سے کون سی کتاب لوں......

نوجوان : میرے خیال میں تو ایکٹرس کی آپ بیتی مزیدار ہونی چاہئے۔

لڑکی : لیکن میں نے دین دیال تیواری کی ایک کتاب بہت عرصہ ہوا پڑھی تھی 'صبح کا تارا' وہ تو مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئی تھی۔ کیوں صاحب آپ کے خیال میں ان دونوں میں سے کون سی کتاب اچھی ہے؟

تیواری : آ۔ آ۔ دونوں اچھی ہیں۔ دونوں لے جایئے۔ (مہتہ کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔)

لڑکی : دونوں نہیں۔ میں تو ایک لوں گی۔ بتایئے ذرا۔ آپ کے گاہک کسے زیادہ پسند کرتے ہیں؟

تیواری : اپنی اپنی پسند ہے۔ (تیواری مہتہ کی طرف دیکھ کے پھر لڑکی کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

لڑکی : پھر بھی؟

(تیواری مہتہ کی طرف دیکھتا ہے اور پھر بولنے لگتا ہے)

تیواری : آپ۔ ایک یہ ایکٹرس کی آپ بیتی لے جایئے (تیواری کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں) یہ دل کی فریاد نہ لے جایئے۔ یہ کتاب بالکل بکواس ہے۔ اس میں کوئی دم نہیں، اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس میں کوئی رنگ نہیں ہے۔ اس کا ٹائٹل تو دیکھئے۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاہی۔ بیچ میں ایک چھوٹے سے روشنی کے ہالوں میں کانوں کے

جھاڑ۔ مسٹر آپ لوگ خوبصورت اور حسین ہیں اور نوجوان اور امیر ہیں اور نینی تال جا رہے ہیں۔ آپ اس کتاب کے اندھیرے میں نہ جائیے۔ اس کے کانٹوں سے نہ الجھئے۔ اس ویرانے میں چھالے ہی چھالے ہیں۔

(ایک لڑکا یہاں آ کے مہتہ جی کے کان میں کچھ کہنے لگتا ہے۔ تیواری اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔)

لڑکی :مگر اس کا مصنف دین دیال تیواری کا ایک بہت ہی اچھا......

تیواری :اجی اس کا مصنف نہایت ہی لچا، نالائق، الو کا پٹھا ہے۔ بالکل جاہل، بے وقوف، احمق انسان ہے۔ اسے لکھنے کی تمیز نہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں، زندہ رہنے کی تمیز نہیں۔ کیونکہ وہ منافع کی قدر نہیں کرتا۔ جاسوسی گھوڑے نہیں دوڑاتا۔ معصوم دلوں کو قتل غارت گری کے افسانے سنا کر انہیں ڈکیتی اور چوری کی طرف مائل نہیں کر سکتا۔ ایسا پھیکا، سیٹھا، کچا، باسی، بدمزہ لٹریچر پڑھ کر آپ کو ابکائی آ جائے گی۔

مہتہ :مسٹر دین دیال!

تیواری : آپ دل کی فریاد، کبھی نہ خریدیئے۔ آپ ایکٹرس کی آپ بیتی باتصویر لے جایئے، اس میں آپ کی جذبات خیز ونشاط انگیز خوبصورت الفاظ ملیں گے۔ جو کام الفاظ نہیں کر سکتے وہ کام یہ تصویریں پورا کر دیں گی۔ آپ اس کے ساتھ یہ محبت کرنے کے ایک ہزار ایک طریقے ملے گا۔ ایک ہی راستہ۔ ایک ہی سفر، ایک ہی منزل جس میں آدمی سب کچھ دے دیتا ہے اور اپنے لئے کچھ باقی نہیں رکھتا۔

(مہتہ یہاں پر لڑکے سے الگ ہو کے جھجکتے جھجکتے آگے بڑھ کے تیواری سے مخاطب ہوتا ہے۔)

مہتہ :مسٹر دین دیال تیواری! آپ کی بیوی مر گئی۔ آپ کے گھر سے آدمی بلانے کے لئے آیا ہے۔

(چند لمحوں کا سناٹا، دین دیال تیواری پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔)

تیواری :وہ مر گئی

(وقفہ)

وہ مرگئی!

(وقفہ)

اچھا ہے وہ مرگئی۔

(وقفہ)

آج میں بھی تو مرگیا ہوں۔

(وقفہ)

تیواری : آج میرے دل کی فریاد مرگئی اور میری صبح کا تارا ڈوب گیا۔ آج سے میں بھی نیلی پیلی چھتریاں لکھوں گا اور جاسوسی گھوڑے دوڑاؤں گا۔ میری ہر کتاب میں دس قتل ہوں گے اور بارہ ڈکیتیاں۔ آج کے بعد میرے ناولوں میں قمار خانے ہنسیں گے۔ عورتیں روئیں گی اور بچوں کی آنتیں نکال لی جائیں گی اور میں ان کا خون اپنے چہرے پر مل کر منافع کے دربار میں جاؤں گا اور سونے کے دیوتا کے سامنے اپنا ماتھا ٹیک دوں گا۔

(تیواری ریک سے کتابیں نکال کر جلدی جلدی کونٹر پر ڈھیر لگاتا ہے)

مہتہ : یہ کیا کر رہے ہو تیواری جی؟

تیواری : مہتہ جی! یہ میری کتابیں ہیں۔ یہ مجھے روٹی نہیں دے سکتیں۔ لیکن میری بیوی کا کفن تو بن سکتی ہیں۔ دیکھئے (کونٹر کی طرف اشارہ کر کے) یہ میری بیوی کی ارتھی ہے۔ اوپر صبح کا تارا ہے، نیچے دل کی فریاد ہے۔ بیچ میں میری بیوی کی ارتھی ہے۔...... اب میں اس کفن کو آگ لگا دوں گا۔

(تیواری کتابوں کو آگ لگا دیتا ہے۔ مہتہ بھاگ کے اسے پکڑتا ہے۔ نوجوان لڑکا اور لڑکی دوکان سے باہر بھاگتے ہیں۔)

مہتہ : تیواری جی۔ تیواری جی آپ کیا کر رہے ہیں؟

تیواری : (شعلوں کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر پاگلوں کے انداز میں) کتابیں جل رہی ہیں۔ امیر لوگ نینی تال جا رہے ہیں۔ ہاہاہا!

(پردہ)

تولئے

• اوپندر ناتھ اشک

کردار

نعیم

نجمہ

رضیہ

ثریا

کریمن

مقام : نئی دلی میں نعیم کا فلیٹ

وقت : پہلا منظر : نومبر ۱۹۴۲ء کی ایک صبح

دوسرا منظر : دو ماہ بعد جنوری ۱۹۴۳ء کی ایک دوپہر

پہلا منظر

پردہ نعیم کے ڈرائنگ روم میں اٹھتا ہے ڈرائنگ روم نہ بہت بڑا ہے۔ نہ چھوٹا۔ اور نہ ہی سازوسامان سے اتنا آراستہ ہے۔ نعیم ایک فرم میں اڑھائی سو روپے ماہوار پاتا ہے۔ وہ فرم کا منیجر ہے اس لئے اس کے ہاں ٹیلیفون بھی لگا ہوا ہے۔ اور کمرہ بھی کچھ نہ کچھ سجا ہوا ہے۔ بائیں دیوار کے ساتھ ایک میز لگی ہوئی ہے۔ اس پر فائلوں وغیرہ کے علاوہ ٹیلیفون رکھا ہے۔

میز کے ورے ایک دروازہ ہے۔ جو اندر کو جاتا ہے۔ پرلے کونے میں ایک انگھیٹی ہے۔ لیکن شاید اس میں کبھی آگ نہیں جلائی جاتی۔ کیونکہ انگھیٹی کا کپڑا نہایت خوبصورت ہے اور اس پر سجاوٹ کی ایسی چیزیں رکھی ہوئی ہیں جو متوسط درجہ کے گھروں میں عموماً ہوتی ہیں۔ پیتل کے دو گلدان دوسری چیزوں کے علاوہ انگھیٹی کے کپڑوں کے جھالر چھوتا ہوا ایک ریڈیو سیٹ چھوٹی سی میز پر دھرا ہے، جس کے میز پوش کا ڈیزائن انگھیٹی کے کپڑے سے میچ کرتا ہے اور نجمہ کے سگھڑاپے کی دلیل ہے۔

انگھیٹی کے اوپر دیوار پر ایک کلینڈر لٹک رہا ہے۔ اگر کوئی شخص میز پر بیٹھے تو کلینڈر اس کے سامنے نظر آتا ہے۔ کیلنڈر معلوم ہوتا ہے کہ نومبر کا مہینہ ہے۔

انگھیٹی کے برابر ایک دروازہ ہے جو باورچی خانہ کو جاتا ہے۔ اس دروازہ سے ذرا ہٹ

کر سامنے کی دیوار کے ساتھ بید کا ایک کوچ پڑا ہے۔ جس کے آگے ایک تپائی ہے۔
سیٹ کی گدیاں خوبصورت اور دیدہ زیب ہیں۔ اس تپائی کا کپڑا بھی انگھیٹی کے
کپڑے سے میچ کرتا ہے۔
سامنے دیوار کی بائیں طرف کوچ سے ذرا ہٹ کر ایک دروازہ ہے جو غسل خانہ کو
جاتا ہے۔
دائیں دیوار کے کونے میں سنگار میز لگی ہے۔ جس سے نجمہ اور نعیم دونوں اپنی آرائش کا
کام لیتے ہیں۔ اس کے اوپر کھونٹوں پر تولئے ٹنگے ہوئے ہیں۔ میز کے دونوں طرف
دو کرسیاں پڑی ہیں دائیں دیوار میں باہر جانے کے لئے ایک دروازہ ہے۔
پردہ اٹھتا ہے تو ہم نعیم کو سنگار میز کے سامنے بیٹھے اور حجامت کے بعد تولئے سے منہ
پونچھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس وقت رسوئی خانے کے دروازے سے نجمہ سوئٹر بنتی
ہوئی داخل ہوتی ہے۔)

نجمہ : یہ پھر آپ نے جمیل کا تولیہ اٹھالیا۔ میں کہتی ہوں آپ ....

نعیم : (منہ پونچھتے ہوئے رک کر) اوہ کمبخت تولئے! مجھے خیال ہی نہیں رہتا دراصل (ہنستا ہے) جمیل کے تولئیے چھوٹے ہیں اور حجامت۔۔۔۔

نجمہ : (چڑ کر) اور حجامت کے تولیوں جیسے ہیں، جی! ذرا آنکھ کھول کر دیکھئے۔ حجامت کے تولئے کتنے رنگین ہیں۔ بیسیوں تو دھاریاں پڑی ہوئی ہیں ان میں۔ اور جمیل کے کتنا سادہ..........

نعیم : (کھسیانی ہنسی کے ساتھ) لیکن روئیں دار تو......

نجمہ : (طنز سے) دونوں ہیں۔ جی! آنکھیں بند کر کے آدمی دونوں کا فرق بتا سکتا ہے۔ میں کہتی ہوں..........

نعیم : (لاجواب ہو کر) دراصل میرا خیال دوسری طرف تھا۔ لاؤ مجھے حجامت کا تولیہ دے دو۔ کہاں ہے۔ مجھے نظر ہی نہیں آیا۔..........

نجمہ : (کھونٹی پر ٹنگا ہوا تولیہ اتارتے ہوئے) یہ سامنے تو ٹنگا ہے۔ پھر بھی..........

نعیم :میں نے عینک اتار رکھی ہے اور عینک کے بغیر تم جانتی ہو ہماری دنیا..... (کھسیانی ہنسی ہنستا ہے)

نجمہ : جی آپ کی دنیا۔ خدا جانے آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ اب تو خیر عینک نہیں، پر عینک ہو بھی تو آپ کو کیا نظر آتا ہے۔!

نجمہ منہ لٹکا کر دھم سے کوچ میں دھنس جاتی ہے اور چپ چاپ سوئیٹر بننے لگتی ہے۔ نعیم حجامت کا سامان قرینے سے رکھتا ہے پھر اچانک اس کی طرف دیکھتا ہے۔

نعیم : یہ تم نے پھر منہ لٹکا لیا۔ ناراض ہو گئیں۔

نجمہ : (طنز سے ہنس کر) نہیں، میں ناراض نہیں۔

نعیم :تمہارا خیال ہے کہ میں اتنا بیوقوف ہوں جو یہ بھی نہیں پہچان سکتا۔

نجمہ : (ہنس کر) میں کب کہتی ہوں۔

نعیم ؛ (کرسی اس کی طرف گھماتے ہوئے) میں نے تمیں کتنی بار بتایا ہے کہ اپنے جذبات کے چھپا لینے پر قدرت تمہیں حاصل نہیں۔ تمہاری نفرت، تمہارا غصہ، تمہارے تمام جذبات تمہارے چہرے پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ تمہیں میری عادتیں بُری لگتی ہیں۔ لیکن میں نے تمہیں تاریکی میں نہیں رکھا۔ اپنے متعلق، اپنی عادتوں کے متعلق میں نے سب کچھ تمہیں بتا دیا۔ اپنے سب پتے میں نے..........

نجمہ : میز پر رکھ دیئے تھے۔ (اسی طرح ہنس کر) میں کب انکار کرتی ہوں!

نعیم : تمہاری یہ ہنسی کتنی زہریلی ہے۔ اسی طرح بس گھول گھول کر تم نے اپنی صحت کا ستیاناس کر لیا ہے۔

(نجمہ چپ رہتی ہے)

نعیم : میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں صفائی کا خود بڑا قائل ہوں

نجمہ : (ہنستی ہے) اس میں کیا شک ہے۔

نعیم :اور خود مجھے غلاظت پسند نہیں۔

(نجمہ صرف ہنستی ہے)

نعیم : لیکن میں تمہاری طرح رئیسانہ ماحول میں نہیں پلا اور یہ نزاکتیں، نفاستیں میرے بس

کی نہیں۔ ہمارے گھر میں صرف ایک تولیہ ہوتا تھا اور ہم چھوں بھائی اسی کو استعمال کرتے تھے۔

نجمہ : میں کب کہتی ہوں، دس (۱۰) تولیے ہوں۔

نعیم : دس (۱۰) اور کس طرح ہوتے ہیں۔ نہانے کا الگ، حجامت بنانے کا الگ، ہاتھ منہ پونچھنے کا الگ، پھر تمہارے الگ اور جمیل کے......

نجمہ : (پہلو بدل کر) لیکن میں پوچھتی ہوں اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ جب ہم خرید سکتے ہیں تو کیوں نہ دس دس تولیے رکھیں۔ اگر خدانخواستہ اس قابل نہ رہیں تو میں آپ کو دکھادوں کہ کس طرح غریبی میں بھی صفائی رکھی جا سکتی ہے۔ تولیے نہ سہی کھادی کے صافے سہی، کسی پرانی چادر یا ساری کے ٹکڑے سہی۔ کچھ بھی رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جس تولئے سے کسی نے بدن پونچھا ہو اسے کوئی دوسرا کیسے استعمال کرسکتا ہے۔

نعیم : میں کہتا ہوں ہم چھ بھائی ایک ہی تولئے سے جسم پونچھتے رہے۔

نجمہ : لیکن بیماری......

نعیم : ہم میں سے کسی کو کبھی کوئی بیماری نہیں ہوئی۔

نجمہ : اور جلدی امراض......

نعیم : تمہیں اور جمیل کو تو کوئی جلدی مرض نہیں...... اور پھر بیماری اس طرح نہیں پھیلتی۔ بیماری پھیلتی ہے کمزوری سے۔ جب ہمارے جسم میں مرض کا مقابلہ کرنے والے سرخ جراثیم کم ہو جاتے ہیں۔ جب قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے۔ چوہا سیدن شاہ کا قصہ سنا ہے......؟

نجمہ : چوہا سیدن شاہ......!

نعیم : ہاں۔ شکار کی غرض سے کچھ انگریز افسر، چوہا سیدن شاہ گئے۔ ان میں امریکہ کے راک فیلر ٹرسٹ کے کچھ ڈاکٹر بھی تھے۔ لنچ کے وقت انہیں پانی کی ضرورت پڑی تو بیرے نے آ کر بتایا کہ گاؤں میں کوئی کنواں نہیں اور سب لوگ جوہڑ کا پانی پیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کو یقین نہ آیا کیونکہ جوہڑ کا پانی میلا چیکٹ تھا اور اس میں ہر مرض کے جراثیم

موجود تھے۔اور چوہا سیدن شاہ کے جاٹ پھر بھی تنومند......

نجمہ : تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم بھی جوہڑ کا پانی پینا شروع کر دیں۔

نعیم : (اٹھ کر کمرے میں گھومتے ہوئے) تم اس بات پر اپنی زہریلی ہنسی بکھیر سکتی ہو۔ (اس کے سامنے رک کر) لیکن امریکہ کے ڈاکٹر وہیں رہے۔انھوں نے ایک جاٹ کے خون کا معائنہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اس کے خون میں بیماری کا مقابلہ کرنے والے سرخ جراثیم سفید جراثیم کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔مزید تحقیقات پر پتہ چلا کہ ان کی خوراک کا بیشتر حصہ دہی اور لسی تھا اور دہی میں بیشتر بیماریوں کے جراثیم کو ہلاک کرنے کی قوت ہے۔امراض کا مقابلہ ان نزاکتوں اور نفاستوں سے نہیں ہوتا۔ بلکہ جسم میں قوت مدافعت پیدا کرنے سے ہوتا ہے۔

(گھومنے لگتا ہے)

نجمہ : خیر! میلے تولیے استعمال کرنے سے جسم میں سرخ جراثیم پھیلیں یا سفید، مجھے اس سے غرض نہیں۔بچپن ہی سے مجھے صفائی پسند ہے۔ماموں جان.....

نعیم : (میز کے کونے کا سہارا لے کر) تم نے پھر اپنے ماموں اور خالو کا قصہ چھیڑا۔ مانا وہ ولایت ہو آئے ہیں۔لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ جو بھی کہتے ہیں، قرآن اور حدیث ہے۔اس دن تمہارے ماموں جان آئے تھے۔انھوں نے ہاتھ دھوئے تو میں نے کہیں بھولے سے اپنا تولیہ پیش کر دیا۔(نجمہ کے نزدیک آ کر) انھوں نے دانت نکوس دیئے اور کہا (نقل اتار کر) ''میں کسی دوسرے کے تولیے سے ہاتھ نہیں پونچھتا''۔اور رومال سے ہاتھ پونچھنے لگے۔میں کہتا ہوں اگر وہ اس تولیے سے ہاتھ پونچھ لیتے تو انہیں کون سے جراثیم چمٹ جاتے۔

نجمہ : اب یہ تو.........

نعیم : اور تمہارے خالو جان......(واپس جا کر پھر میز کے کونے پر بیٹھ جاتا ہے) تمہارے جانے کے بعد ایک دن میں ان کے ہاں گیا۔رات وہیں رہا۔صبح سیدھے دفتر آنا تھا۔ کہنے لگے حجامت یہیں بنا لو۔میں نے کہا میں ایک دن چھوڑ کر حجامت بناتا ہوں۔

مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن انھوں نے اصرار کیا تو میں نے کہا۔ ''اچھا بنائے لیتا ہوں۔'' تب وہ ایک ذلیل سا ریزر اٹھالائے اور کہنے لگے (نقل اتارتے ہوئے)۔ ''میں اپنے ریزر سے کسی دوسرے کو حجامت نہیں بنانے دیتا، اس لئے میں نے مہمانوں کے لئے دوسرا ریزر رکھ چھوڑا ہے۔'' غصہ سے میرا خون کھولنے لگا۔ لیکن میں نے صرف اتنا کہا۔ ''رہنے دیجئے میں گھر جا کر شیو کرلوں گا......''۔

نجمہ :لیکن خالو جان......

نعیم :(اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے) اس پر انہیں محسوس ہوا کہ مجھے ان کی بات بُری لگی ہے۔ تب انھوں نے مجھے اپنے ہی ریزر سے حجامت بنانے پر مجبور کیا۔ لیکن حجامت بنانے کے بعد میرے سامنے ہی بلیڈ انھوں نے لان میں پھینک دیا اور نوکر سے کہا کہ ریزر کو سٹر لائز Sterilize کرلائے (منہ بناتے ہوئے) تمہارے خالو جان......

نجمہ : میں کہتی ہوں آپ چونکہ ان کی عادات سے واقف نہیں اس لئے آپ کو بُرا لگا۔ نفاست کی حس بھی آپ کی شاعری اور آرٹ کی حس کی طرح۔

نعیم :(جوش سے پھر اٹھ کر اس کے پاس آتے ہوئے) شاعری اور آرٹ کو اپنی اس نفرت میں کیوں ملوث کرتی ہو؟ تمہارے جیسے رئیسانہ ماحول میں پلے ہوئے سب لوگوں کی اس نفاست میں نفرت کا جذبہ موجود ہے۔ جسم سے غلاظت سے، زندگی سے نفرت کا!۔

(نجمہ چپ رہتی ہے)

نعیم :اور مجھے زندگی سے نفرت نہیں، مجھے جسم سے بھی نفرت نہیں اور میں سچ کہدوں، مجھے غلاظت سے بھی نفرت نہیں۔

(پھر کرسی پر جا بیٹھتا ہے)

نجمہ :(ہنستی ہے) تو پھر کوڑے کے ڈھیروں پر بیٹھئے۔

نعیم : (کرسی کو نجمہ کے نزدیک لاتے ہوئے) مجھے غلاظت سے نفرت نہیں، لیکن میں غلاظت پسند نہیں کرتا۔ بڑا نازک سا فرق ہے۔ زندگی میں غلاظت بھری پڑی ہے۔ اگر ہمیں زندگی کا سامنا کرنا ہے تو غلاظت سے روز دوچار ہونا پڑے گا۔ پھر اس سے

نفرت کیسی؟ جن غریبوں کو تم اپنے برآمدے کے فرش پر بھی پاؤں نہ رکھنے دو، ان کے پاس گھنٹوں بیٹھ سکتا ہوں۔

(نجمہ اسی طرح طنز سے زیرلب ہنستی ہے)

نعیم : اور میں نے ایسے غلیظ علاقوں میں زندگی کے کئی برس گذارے ہیں۔ جہاں تمہاری نفاست پسندی تمہیں گزرنے تک کی اجازت نہ دے۔

نجمہ : (بدستور سوئیٹر بنتے ہوئے) لیکن اب تو آپ مفلس نہیں۔ اب تو ان غلیظ علاقوں میں نہیں رہتے۔ غلاظت میں رہنے کی مجبوری کو میں سمجھ سکتی ہوں۔ لیکن غلاظت کی عادت میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

نعیم : تو تمہارا خیال ہے کہ میں عادتاً غلیظ ہوں۔

نجمہ : (اسی زہریلی ہنسی کے ساتھ) میں کب کہتی ہوں۔

نعیم : (کھڑا ہو جاتا ہے) ایسے دن مجھ پر آئے ہیں جب ایک بنیان پہنے مجھے ہفتہ ہفتہ تک گذر جاتا تھا۔ اسے دھونے تک کی فرصت نہ ملتی تھی اور اب میں دن میں دو بار بنیان بدل لیتا ہوں۔ اگر یہ غلاظت ہے تو......

نجمہ : (اسی ہنسی سے) میں کب کہتی ہوں۔

نعیم : نفاست بُری نہیں، لیکن تم ہر چیز کو سنک کی حد تک پہنچا دیتی ہو اور سنک سے مجھے چڑ ہے۔ (پھر گھومنے لگتا ہے) بنیانوں اور تولیوں کی قید میں نے مان لی۔ لیکن اگر میں غلطی سے بنیان نہ بدل سکوں یا غلط تولیہ لے لوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تمہارے ماتھے پر شکن پڑ جائے۔ تم منہ پھلا کر بیٹھ جاؤ یا اپنی یہ زہریلی ہنسی بکھیرو۔

(نجمہ چپ رہتی ہے)

نعیم : تم نے اپنے آپ کو ان تکلفات میں اس طرح جکڑ لیا ہے کہ میری ذرا سی بے تکلفی تمہیں کھل جاتی ہے۔ اپنے اصولوں کو تم نے سنک کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ شلّو اور چنی......

نجمہ : (بُنتا چھوڑ دیتی ہے) آپ نے پھر شلو اور چنی کی بات شروع کر دی۔ شلو اور چنی......

نعیم : (ہنستے ہوئے) کل مل گئیں بازار میں۔ میں نے کہا۔ چچی آئی نہیں تم اتنے دنوں سے، کہنے لگیں، ہم کو چچی سے ڈر لگتا ہے۔

(ہنستا ہے)

نجمہ : (اسی زہریلی ہنسی کے ساتھ) میں انہیں کھا جو جاتی ہوں۔

نعیم : (تپائی کے پاس سے) کھاؤ گی تو تم کیا، لیکن اب وہ بچیاں ہیں۔......

نجمہ : (دانت چبا کر) بچیاں!

نعیم : (نجمہ کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے تپائی پر بیٹھ کر) ہنسنا ان کی فطرت ہے۔ وہ ہنسیں گی تو بے بات کی بات سنیں گی۔ اور تمہارا ایٹی کیٹ......بس دبے دبے، گھٹے گھٹے پھرو۔ ہونہہ! (بیزاری سے سر ہلاتا ہوا اٹھتا ہے) جو آدمی جی بھر کے ہنس نہیں سکتا؟ ہنس ہنسا نہیں سکتا، وہ زندگی میں کر ہی کیا سکتا ہے۔ غم و آلام کی بیڑیاں ہی کیا کم ہیں، جو زندگی کو ادب و آداب کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، ایسے نہ بولو، ویسے نہ بولو۔ مناہیوں کی کوئی حد بھی ہے۔

(نجمہ چپ رہتی ہے)

نعیم : اور پھر تمہارے اس تکلف میں گرم جوشی کہاں ہے۔ تمہارے آنے سے پہلے سعید، حنیف اور میں سب ایک ہی لحاف میں بیٹھ جاتے تھے۔ ذرا تصور کرو۔ سردیوں کی صبح یا شام، ایک ہی چارپائی پر، ایک ہی لحاف گھٹنوں پر اوڑھے، چار پانچ دوست بیٹھے ہیں۔ گپیں ہانک رہے ہیں، دکھ سکھ کی باتیں کر رہے ہیں۔ وہیں چائے آجاتی ہے۔ باتیں بھی ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ چسکیاں بھی لی جا رہی ہیں۔ اس تصور میں کتنا لطف ہے۔ کتنی گرم جوشی ہے۔ اب دوست آتے ہیں، الگ الگ کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک دوسرے پر بار معلوم ہوتا ہے۔ (جوش سے) چڑیا تک کو تو پھٹکنے نہیں دیتیں تم اپنے بستر کے پاس۔ میں تو اس تکلف میں گھٹا جا رہا ہوں۔

(کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور حجامت کا سامان قرینے سے رکھنے لگتا ہے)

نجمہ : میں خود تکلف پسند نہیں کرتی لیکن جب دوسروں کو صفائی کا کچھ بھی خیال نہ ہو تو مجبوراً

تکلف سے کام لینا پڑتا ہے۔ آپ ہی بتایئے کتنے آدمیوں کو صفائی کی عادت ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو ہماری طرح پاؤں دھو کر بستر پر بیٹھتے ہیں۔

نعیم : (وہیں سے) پاؤں دھونے کی مصیبت رضائی میں بیٹھنے کا لطف ہی کرکرا کر دیتی ہے۔

(ہنستا ہے)

نجمہ : کتا بھی بیٹھتا ہے تو دم ہلا کر بیٹھتا ہے۔ صفائی کی عادت انسان کی فطری عادتوں میں سے ہے۔ مجھے بچپن ہی سے غلیظ لوگوں سے نفرت ہے۔

(پھر ہنسنے لگتی ہے)

نعیم : (مڑ کر) نفرت! ۔ یہی تو میں کہتا ہوں۔ تمہیں مجھ سے نفرت ہے۔ میری ہر ایک عادت سے نفرت ہے۔ (غضبناک ہو کر) تمہارا ماحول میرے ماحول سے نفرت کرتا ہے۔

نجمہ : (اسی زہریلی ہنسی کے ساتھ) یہ آپ کہہ سکتے ہیں۔

نعیم : تمہیں میری ہر ایک بات سے نفرت ہے۔ میرے کھانے پینے سے اٹھنے بیٹھنے سے، ہنسنے بولنے سے، میں جب ہنستا ہوں، سینہ پھلا کر ہنستا ہوں اور اس لیے شلّو اور چنی ....

نجمہ : (سوئیٹر پھینک کر) آپ نے پھر شلّو اور چنی کا ذکر چھیڑا۔ مجھے ہنسنا برا نہیں لگتا۔ لیکن اخلاق بھی آخر کوئی چیز ہے۔ اس پارٹی میں آتے ہی سو نے میرے کان کی چٹکی لے لی۔ اور چنی نے میری آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی موقع بھی تھا اس طرح کی ہنسی مذاق کا مجھے ہنسی مذاق سے نفرت نہیں، بد اخلاقی سے نفرت ہے۔

نعیم : سو تو .....

نجمہ : پرلے سرے کی بیہودہ لڑکی ہے۔ جمیل کی سالگرہ کے دن وہ سب آئے تھے۔ چنی اتنی چنچل ہے۔ اس کے باوجود تو ایک طرف بیٹھ گئی اور یہ نواب زادی سو۔ سینڈل سمیت آ بیٹھی۔ میرے سامنے۔ ٹانگیں پسارے اور اس کے گندے سینڈل۔ میری ساڑی کے بالکل قریب آ گئے۔ آپ اس بے تکلفی کو شوق سے پسند کریں، لیکن میں تو اس

بیہودگی کو قطعاً پسند نہیں کر سکتی۔ جسے اٹھنے بیٹھنے، بولنے بتیانے کی تمیز نہیں وہ آدمی کیا جانور ہے۔

نعیم: (گرج کر) جانور! تو تم مجھے جانور سمجھتی ہو۔ تم انسان کے فطری جذبوں کو باندھ کر رکھنا چاہتی ہو۔ کٹھن اصولوں کی بیڑیوں میں۔ تاکہ اس کی حس ہی مر جائے۔ مجھے یہ سب پسند نہیں اور اس لئے تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ تمہاری اس زہریلی ہنسی میں، میں جانتا ہوں کتنی نفرت پوشیدہ ہے اور مجھے ڈر ہے، کسی دن سچ مچ جانور نہ بن جاؤں۔ ابھی میرا جی چاہا تھا کہ اس ذلیل سے تولئے کو اٹھا کر صحن کے باہر پھینک دوں ..... اور ..... میرا جی چاہا کرتا ہے کہ تمہاری اس ہنسی کا گلا گھونٹ دوں۔ نفرت..... تم میری ہر عادت سے نفرت کرتی ہو..... مجھے جانور سمجھتی ہو!

نجمہ: (سوئیٹر اٹھا کر رندھے ہوئے گلے سے) آپ خوامخواہ ہر بات کو اپنی طرف لے جاتے ہیں۔ اپنے تخیل سے میرے دل میں وہ باتیں دیکھتے ہیں جو میں خواب میں بھی نہیں سوچتی۔ مجھے آپ سے نفرت ہے یا نہیں، اسے میں ہی جانتی ہوں۔ لیکن آپ کو مجھ سے ضرور نفرت ہے۔ آپ نے مجھ سے شادی کر لی، میں جانتی ہوں، کیوں کر لی، لیکن شادی کے لئے آپ کا تیار ہو جانا یہ نہیں بتاتا کہ آپ کو مجھ سے نفرت نہیں۔ اس بات کا غصہ چاہے آپ میری نفاست پسندی پر نکالیں، چاہے میری پوشاک، آواز یا کسی اور بات پر۔

نعیم: تم.....

نجمہ: میرا خیال تھا، میں آپ کو سکھ آرام پہنچا سکوں گی۔ آپ کی بے ترتیب زندگی کو ترتیب دے سکوں گی۔ لیکن میں دیکھتی ہوں میری تمام کوششیں بے سود ہیں..... آپ کو اس دکھ، تکلیف، بے پروائی اور بے ترتیبی میں سکھ ملتا ہے۔ آپ کو میری نفاست پسندی، صفائی بری لگتی ہے۔ پھر فائدہ۔ میں آپ کی دنیا میں رہوں گی۔ میں آج ہی چلی جاؤں گی۔ ابھی چلی جاؤں گی۔

(نجمہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ نعیم جلدی سے جا کر

چونگا اٹھا تا ہے)

نعیم : ہیلو، جی۔جی۔صاحب!

نجمہ : (نوکرانی کو آواز دیتی ہے) کریمن!

کریمن : (عقب سے) جی بیگم جی۔ (غسل خانے کی طرف سے آتی ہے) جی

نجمہ : اس کمرے سے میرے ٹرنک اٹھا لا۔

کریمن : کیوں بیگم آپ......

نجمہ : میں جو کہتی ہوں اٹھا لا۔

(کریمن چلی جاتی ہے۔نعیم ''بہتر صاحب'' کہہ کر چونگا رکھ دیتا ہے اور ہنستا ہوا آتا ہے۔)

نعیم : میں کہتا ہوں تم اپنا سامان باندھنے لگی ہو۔ پہلے میرا سامان تو ٹھیک کر دو۔ مجھے اس گاڑی سے بنارس جانا ہے۔ابھی صاحب کا فون آیا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

کمرہ وہی ہے۔ ساز وسامان بھی وہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں میز تھی وہاں ایک پلنگ بچھا ہوا ہے۔ اور ٹیلی فون سرہانے تپائی پر رکھا ہے۔ بڑی میز کی جگہ چلی گئی ہے۔ اور سنگار میز اپنی کرسی کے ساتھ دائیں دیوار کے ساتھ ہی ذرا ادھر کو سرک گئی ہے۔ کیلنڈر وہیں ہے۔ پلنگ اور میز دونوں سے برابر نظر آتا ہے۔

پلنگ پر نجمہ گھٹنوں پر لحاف لئے دیوار کے سہارے شکستہ خاطر سی آدھی بیٹھی لیٹی ہے۔ کچھ لمحے کے بعد کیلنڈر کی طرف دیکھتی ہے۔ جنوری کی ۲ر تاریخ ہے۔

باہر کا دروازہ کھلا ہے۔ اور تیکھی ہوا اندر آرہی ہے۔ لحاف کندھوں پر کھینچتے ہوئے نجمہ نوکرانی کو آواز دیتی ہے۔

نجمہ : کریمن!

لیکن آواز اتنی ہلکی ہے کہ شاید کریمن تک نہیں جاتی۔ نجمہ رضائی اوڑھ کر لیٹ جاتی ہے۔ کچھ لمحے بعد کریمن ادھر سے گزرتی ہے۔

کریمن : بیگم صاب۔ یہ آج آپ اداس اداس کیوں ہیں؟

نجمہ : (لیٹے لیٹے ذرا سر اٹھا کر) یہ کواڑ بند کردے کریمن۔ برف سی ہوا اندر آرہی ہے۔

کریمن : (آواز بند کرتے ہوئے) میری بات کا جواب نہیں دیا آپ نے بیگم صاب۔

نجمہ : یونہی کچھ طبیعت اداس ہے کریمن۔

کریمن : کوئی خط نہیں آیا صاب کا۔

نجمہ : آیا تھا، شاید آج کل میں آجائیں۔

کریمن : تو پھر......

نجمہ : (اداسی سے ہنس کر) طبیعت کچھ بھاری بھاری سی ہے۔ شاید کچھ سردی کی وجہ سے۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے) کون؟

رضیہ : (باہر سے) دروازہ تو کھولو۔

نجمہ : (بیٹھ کر) کریمن ذرا دروازہ تو کھولنا۔

(کریمن دروازہ کھولتی ہے۔ رضیہ اور ثریا داخل ہوتی ہیں۔)

نجمہ : (رضائی ہٹا کر) ارے رجو، ثریا، تم یہاں کیسے؟

رضیہ : آج ہی صبح یہاں اتری ہیں۔

ثریا : اماں آگرے جا رہی ہیں۔ رضیہ آپا کا خیال تھا کہ دلی بھی دیکھتے چلیں

نجمہ : ٹھہری کہاں ہو؟

ثریا : کناٹ پیلس۔ بھائی جان کے ہاں۔ عرصے سے ان کا اصرار تھا کہ دلی آئیں تو......

نجمہ : اور مجھے خط تک نہیں لکھا۔ اتنے دنوں سے میں کہہ رہی تھی کہ دلی آؤ تو......

رضیہ : سب سے پہلے تمہیں سے ملنے آئی ہیں۔ اما کہتی تھیں قطب مینار......

ثریا : میں نے کہا۔ قطب مینار ایک طرف اور نجو بیگم ایک طرف۔

(نجمہ قہقہہ لگاتی ہے)

رضیہ : اور پھر دو گھنٹے سے ماری ماری پھر رہی ہیں تمہاری تلاش میں......

نجمہ : لیکن پتہ تو میرا......

ثریا : رضیہ آپا بھول گئیں۔ انھوں نے تانگے والے کو بھیرو کے مندر جانے کے لئے کہہ دیا۔

نجمہ :(حیرت سے) بھیرو کے مندر......

ثریا :اور تانگے والا لے گیا سبزی منڈی تیس ہزاری کے گرجے کے پاس۔

نجمہ :تیس ہزاری کے گرجے کے پاس......

(زور سے قہقہہ لگاتی ہے)

ثریا :(اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) اس وقت انہیں خیال آیا کہ مندر تو ہنومان کا تھا، سو پھر نئی دلی واپس آئیں۔

(نجمہ پھر ہنستی ہے)

رضیہ :اور جب پتہ چلا کہ ہم لوگ تو یونہی پریشان ہوتے رہے، گھر تو تمہارا قریب ہی تھا۔

نجمہ :تم لوگ بھی، میں کہتی ہوں۔

(زور سے ہنس پڑتی ہے)

رضیہ :یہ اتنا ہنسنا تم کہاں سے سیکھ گئیں۔ تم تو تھیں جنم کی سڑی......

ثریا :بھائی صاحب نے سکھا دیا زور سے ہنسنا کہاں ہیں وہ۔

نجمہ :بنارس گئے ہوئے ہیں دو مہینے سے۔ وہاں کی فرم کا منیجر بیمار پڑ گیا تھا۔ شاید آج کل میں آجائیں۔

ثریا :اچھے تو ہیں۔

نجمہ :موج میں ہیں۔ لیکن یہ تم کھڑی کیوں ہو۔ ادھر آجاؤ بستر پر۔ (نوکرانی کو آواز دیتی ہے) کریمن، کریمن

(رضیہ اور ثریا کرسیوں پر بیٹھنے لگتی ہیں)

نجمہ :ارے کرسیاں چھوڑو۔ بس چلی آؤ ادھر۔ پلنگ پر بیٹھتے ہیں لحاف لے کر......

رضیہ :لیکن میرے پاؤں (ہنستی ہے) اور میں دھو نہیں سکتی انہیں۔

نجمہ :ارے چھوڑ بھی۔ موزے تو پہن رکھے ہیں تم نے۔

ثریا :لیکن تمارا بستر......

نجمہ :کچھ نہیں ہوتا بستر کو۔ میرے بستر کا خیال چھوڑو۔ بس چلی آؤ ادھر۔ کواڑ بند کر دو

(جھرجھری لیتے ہوئے) برف سی ہوا اندر آ رہی ہے)

(کریمن آتی ہے)

کریمن :آپ نے آواز دی تھی بیگم

نجمہ :چائے لاؤ۔

(ثریا کواڑ بند کر دیتی ہے۔ تینوں گھٹنوں پر لحاف لے کر آرام سے بیٹھ جاتی ہیں۔)

رضیہ :فہمیدہ کی شادی ہو رہی ہے۔ اگلے مہینے

نجمہ :(چونک کر خوشی سے) ہاں لفٹیننٹ مجید کے ساتھ۔

ثریا :(ہنس کر) سب تمہارے جیسی نہیں، وہ محبت کرتی رہے گی مجید سے، زندگی بھر، لیکن شادی تو اس کی پروفیسر دین محمد کے ساتھ ہی ہوگی۔

نجمہ :لیکن دین محمد......

رضیہ :لفٹیننٹ مجید تو آتے ہیں کبھی کبھی۔ سال میں ایک بار اور پروفیسر دین محمد سر پر سوار رہتے ہیں آٹھوں پہر سائے کی طرح۔

ثریا :وہ لمبا، پتلا، ڈھاک سا آدمی، زور کی ہوا چلے تو اڑتا چلا جائے۔ میں تو سوچتی ہوں اسے فہمیدہ جیسی موٹی مٹلو سے عشق ہوا بھی تو کیسے؟

نجمہ :اور میں اس بات پر حیران ہوں کہ فہمیدہ اسے پسند ہی کیسے کرتی ہے۔ میں تو اسے پانچ منٹ کے لئے برداشت نہ کر سکوں۔ چہرے پر تو اس کے نحوست برستی ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے......

ثریا :برسوں غسل خانے کا رخ نہ کیا ہو۔

رضیہ :ارے برداشت تو کرنا پڑتا ہے۔ اس کے والد صاحب پروفیسر دین محمد سے بہت خوش ہیں۔ انھوں نے پروفیسر صاحب کو پڑھایا لکھایا اور اپنے کالج میں لگایا۔ مجید تو چار سال بی اے میں رہے اور پروفیسر دین محمد نے ریکارڈ توڑا تھا۔

ثریا :اب دونوں اکٹھے مل کر بچے پیدا کرنے کا ریکارڈ توڑیں گے۔

(سب ہنستی ہیں۔ کریمن چائے کی ٹرے لاتی ہے)

کریمن : (چائے لاتے ہوئے) لگاؤں چائے بیگم صاحب!

نجمہ : ارے یہیں میز پر رکھ دو اور ایک ایک پیالہ بنا کر ہمیں دو۔ اور یہ تپائی سرکا کر اس پر بسکٹ رکھ دو۔

رضیہ : (حیرت سے) نجمہ......

(اٹھنے کی کوشش کرتی ہے)

نجمہ : ارے اٹھ کر کہاں جاؤ گی۔ یہیں بیٹھی رہو۔ اس گرم بستر سے اٹھ کر اور ڈائنگ روم میں جا کر پینے سے آچکا چائے کا مزا....

ثریا : (اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہلکے سے غصے سے) نجمہ!

نجمہ : ہٹاؤ بھی۔ ابھی بیٹھی رہو یہیں۔

ثریا : (طنز سے) تو شادی کے بعد نجو بیگم نے اپنے سب اصول بدل ڈالے ہیں۔ اب ڈائنگ ٹیبل کے بجائے بستر ہی پر چائے پیتی ہیں اور بستر ہی پر کھانا بھی نوش فرماتی ہیں۔

رضیہ : کہاں تو یہ کہ پانی کا گلاس بھی پینا ہو تو ڈائنگ روم کی طرف بھاگتیں اور کہاں یہ کہ......

نجمہ : ارے کیا رکھا ہے ان تکلفات میں۔ سچ کہو اس وقت کس کا جی چاہتا ہے کہ اس گرم گرم بستر سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں جائے۔ بسکٹ لو اور چائے کا پیالہ اٹھاؤ۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

(سب چائے کے پیالے اٹھا لیتی ہیں اور چائے پیتے پیتے باتیں کرتی ہیں۔)

رضیہ : میں پوچھتی ہوں۔ اگر گر جائے بستر پر چائے۔

نجمہ : تو کیا ہوا چادر دھلوائی جاسکتی ہے۔ اور پھر کس دن اچانک پیش آنے والے حادثے کے خوف سے کوئی اپنے روز کے آرام و آسائش کو تو نہیں چھوڑ دیتا ہے۔

رضیہ : آرام و آسائش (طنزیہ ہنستی ہے) تم بستر پر چائے پینے کو بڑی بھاری آسائش سمجھتی ہو......

(پھر ہنستی ہے)

ثریا :اور پھر تہذیب، کلچر......

نجمہ :انسان کے فطری جذبوں پر ہر روز نت نئے چڑھتے چلے جانے والے غلافوں کا نام کلچر ہے۔ سوسائٹی کے ایک درجے کے لئے دوسرا درجہ ہمیشہ ان کلچرڈ اور غیر مہذب رہے گا۔ پھر آدمی کہاں تک تہذیب اور کلچر کے پیچھے بھاگے۔

رضیہ :یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ اتنا کچھ سیکھ سمجھ کر بھی آدمی پھر پہلے کی طرح برابر وحشی ہو جائے۔

نجمہ :نہیں۔ وحشی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آدمی انتہا تک کیوں جائے۔ درمیان کا راستہ کیوں نہ اختیار کرے۔ نہ اتنا کھلے کہ وحشی نظر آئے، نہ اتنا نفاست پسند کہ سنکی۔ لیکن ہٹاؤ کیا بے مزہ، بحث لے بیٹھی ہو۔ کریمن چائے کا ایک ایک کپ اور بناؤ۔

ثریا :(اٹھتے ہوئے) بس بھئی اب تو ہم چلیں گے۔ اتنی دیر ہوگئی ہمیں یہاں آئے۔

رضیہ :کریمن ہاتھ دھلا دو ہمارے۔

نجمہ :ارے ایک ایک پیالی تو اور لو۔

رضیہ :(اٹھتے ہوئے) نہیں بھئی نجو۔ اب چلیں گے۔ سب لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ہم نے کہا تھا ہم صرف نجو کا گھر دیکھنے جا رہے ہیں۔ ایک آدھ گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔ اور یہاں آتے آتے ہی دو گھنٹے صرف ہو گئے۔

ثریا :غسل خانہ کدھر ہے؟ ہم وہیں ہاتھ دھو آتے ہیں۔

نجمہ :ارے کیا دھوؤ گی اس سردی میں ہاتھ۔

رضیہ :نہیں بھئی ہاتھ تو ضرور دھوئیں گے۔ چپ چپ کر رہے ہیں۔

نجمہ :تو مرو۔ (کریمن سے) کریمن ان کے ہاتھ دھلوا دو۔

رضیہ :غسل خانہ......

نجمہ :ارے غسل خانہ میں جا کر کیا کرو گی۔ برآمدے ہی میں دھو لو۔

(کواڑ کھول کر رضیہ اور ثریا ہاتھ دھوتی ہیں۔ نجمہ چپ چاپ اپنے پیالے کی باقی چائے

پیتی ہے۔)

رضیہ :(گیلے ہاتھ لئے واپس آ کر) تولیہ کہاں ہے؟

نجمہ :تولیہ نہیں لے گئی کریمن۔ اچھا وہ لے لو جو کھونٹی پر ٹنگا ہوا ہے۔

رضیہ :(غصے سے) نجمہ تم اچھی طرح جانتی ہو......

نجمہ :کریمن! انہیں اندر سے ایک دھلا ہوا تولیہ لا دو۔

(ثریا بھی گیلے ہاتھ لئے ہوئے واپس آتی ہے۔ کریمن تولیہ لا دیتی ہے۔ دونوں ہاتھ پوچھتی ہیں)

میں کہتی تھی، ابھی کچھ دیر بیٹھیں۔

ثریا :نہیں بھئی، اب کل آنے کی کوشش کریں گے......

نجمہ :کوشش نہیں ضرور آنا۔ بھولنا نہیں اور کھانا بھی یہیں آ کر کھانا۔

ثریا ہاں ہاں ضرور آئیں گے۔ (نجمہ اٹھنے کی کوشش کرتی ہے) اب اٹھنے کا تکلف نہ کرو۔ بیٹھی رہو لحاف میں۔ دروازہ ہم بند کئے جاتے ہیں۔ برف سی ہوا اندر آ رہی ہے۔

(ہنستی ہوئی چلی جاتی ہیں۔)

نجمہ :مجھے ایک پیالی اور بنا دو کریمن۔

کریمن :(پیالہ بنا کر دیتے ہوئے) یہ کون تھیں بیگم۔

نجمہ :میری سہیلیاں تھیں۔ کالج میں ہم ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ اور ہاسٹل میں بھی ساتھ ہی رہتے تھے۔

(کچھ لمحے نجمہ چپ چاپ چائے پیتی ہے پھر)

کریمن

کریمن :جی بیگم

نجمہ :کریمن ذرا میری طرف دیکھ کر بتا تو۔ کیا میں سچ مچ بدل گئی ہوں۔

(کریمن چپ رہتی ہے)

نجمہ :(گویا اپنے آپ سے) میری سہیلیاں کہتی ہیں میں بدل گئی ہوں۔ پڑوسنیں بھی یہی

کہتی ہیں۔میری طرف ذرا دیکھ کر بتا تو کریمن۔کیا میں سچ مچ بدل گئی ہوں۔

کریمن :میں تو آٹھوں پہر آپ کے پاس رہتی ہوں بیگم میں کیا جانوں۔

نجمہ :(اپنی بات جاری رکھتے ہوئے)میری آنکھوں میں دیکھ کر بتا کریمن کیا یہ بالکل بدل گئی ہیں۔ان میں نفرت کی جھلک تو نہیں۔

کریمن :(حیرت سے)نفرت۔تینوں کو میں اپنے دل ودماغ سے نکال دینا چاہتی ہوں۔(جیسے اپنے آپ سے)دو مہینے پہلے وہ اسی بات پر مجھ سے لڑ کر چلے گئے تھے۔

کریمن :کیا کہہ رہی ہیں بیگم آپ۔نعیم صاب تو......

نجمہ :(خلا میں دیکھتے ہوئے)ان کا غصہ ابھی تک دور نہیں ہوا۔ان دو مہینوں میں انھوں نے مجھے ایک بھی خط نہیں لکھا۔

کریمن :ایک بھی خط نہیں لکھا۔لیکن......

نجمہ :(طنز سے)"میں خیریت سے ہوں۔اپنی خیریت کی اطلاع دینا۔"یا"منیجر ابھی تک بیمار ہے۔جونہی وہ تندرست ہوا چلا آؤں گا۔"انہیں تم خط کہتی ہو۔وہ مجھ سے ناراض ہیں۔انہیں شک ہے کہ ان سے میں نفرت کرتی ہوں۔

کریمن :(کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے)نفرت!

نجمہ :(گویا اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو)اب اگر بچپن سے میں ایسے ماحول میں پلی ہوں، جہاں صفائی اور نفاست کا بے حد خیال رکھا جاتا ہے، تو اس میں کیا قصور ہے۔(قریب قریب بھرے گلے سے)وہ میری نفاست پسندی کو نفرت پر محمول کرتے ہیں۔ میں بہتری کوشش کرتی ہوں کہ ان سب تکلفات کو چھوڑ دوں۔لیکن اپنی اس کوشش میں کبھی کبھی مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔(لمبی سانس لے کر)اپنے بچپن کے اثرات پر فتح پانا میرے لئے بے حد مشکل ہے۔(اچانک لہجے میں استحکام بھر کر)لیکن نہیں۔میں ان تکلفات کو چھوڑ دوں گی۔ان پرانے اثرات سے نجات حاصل کرلوں گی۔وہ سمجھتے ہیں ،میں ان سے نفرت کرتی ہوں۔

کریمن : آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم؟

نجمہ : وہ سمجھتے ہیں۔ میں ان سے، ان کی عادتوں سے، ان کے ماحول سے، ان کی ہر بات سے نفرت کرتی ہوں۔

کریمن : آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم؟

نجمہ : (سسکنے لگتی ہے) میں نے ان دو مہینوں میں اپنے آپ کو بدل لیا ہے۔ اپنے آپ کو بالکل بدل لیا ہے۔

(دروازہ اچانک کھلتا ہے اور نعیم داخل ہوتا ہے)

نعیم : ہیلو نجمہ۔ کیسے مزاج ہیں۔ جناب کے۔ (کریمن سے) کریمن تانگے سے سامان اتروادو۔ اور یہ لوڈیڑھ روپیہ۔ تانگے والے کو دے دو۔ (اسے ڈیڑھ روپیہ دیتا ہے۔ پھر نجمہ کی طرف متوجہ ہوکر) کہو بھئی کیسے مزاج ہیں۔ یہ صورت کیسی رونی بنا رکھی ہے۔ طبیعت کچھ ناساز ہے کیا؟

(کریمن پیسے لے کر جاتی ہے)

نجمہ : (جو اس دوران میں پلنگ سے اتر آئی ہے۔ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے) سوکھا جاڑا پڑ رہا ہے۔ زکام ہے۔ مجھے تین چار روز سے۔

نعیم : میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ صحت۔ صحت۔ صحت۔ دنیا میں جو کچھ ہے صحت۔ اگر صحت خراب رہتی ہے تو یہ نزاکتیں کس کام کی۔ اور اگر صحت ٹھیک ہے تو پھر ان کی کوئی ضرورت ہے؟ (اپنی اس نکتہ رسی پر خود ہی محظوظ ہوتا ہے۔ اور پھر حیرت سے اردگرد دیکھتا ہے۔) ارے یہ کایا پلٹ کیسی؟ یہ پلنگ ڈرائنگ روم میں کیسے آ گیا۔ اور یہ ٹرے اور پیالے......

نجمہ : میں نے پلنگ ادھر ہی بچھا دیا ہے۔ تاکہ آپ اور آپ کے دوستوں کو ذرا بھر تکلیف نہ ہو۔ مزے سے لحاف لے کے بیٹھئے۔ ٹیلیفون آپ کے سرہانے رہے گا۔

نعیم : (مسرت سے) واہ میں کہتا ہوں تم تو...... تم تو...... کیا کہنا چاہئے۔ یعنی کہ بے حد

اچھی ہو۔

نجمہ :میں خود اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسی لحاف میں بیٹھی رہی ہوں۔

نعیم :(حیرت اور مسرت سے) سچ!

نجمہ :(داد طلب نگاہوں سے نعیم کو دیکھتے ہوئے) اور چائے بھی ہم نے یہیں پی ہے۔

نعیم :(مسرت سے) واہ۔ میں کہتا ہوں۔ اب تم زندگی کا راز سمجھ پائی ہو۔ زندگی کا راز تکلفات میں نہیں، نزاکت نفاست میں نہیں، باہر کی ترک بھڑک میں نہیں، زندگی کی مضبوطی میں ہے۔ اگر قوت مدافعت قائم ہے.....

نجمہ :چائے بھی اب آپ یہیں پیا کیجئے۔ اپنے نرم گرم بستر پر۔

نعیم :(مسرت سے) واہ۔ واہ۔ واہ۔ اب اسی بات پر تم کریمن سے کہو۔ میرے لئے چائے کا پانی رکھے۔

نجمہ :اب تو آپ ناراض نہیں ہیں۔

نعیم :(حیرت سے) ناراض!

نجمہ :آپ اتنے دنوں تک دل میں غصہ رکھ سکتے ہیں۔ یہ میں نے کبھی خواب میں بھی خیال نہ کیا تھا۔

نعیم :(اور بھی حیرت سے) غصہ!

نجمہ :دو ماہ سے آپ نے خط نہیں لکھا۔

نعیم :لیکن میں نے......

نجمہ :خط لکھے تھے۔ جی۔ ''میں خیریت سے ہوں۔ اپنی خیریت کی اطلاع دینا''۔ اسے خط لکھنا کہتے ہوں گے۔

نعیم :(زور سے قہقہہ لگاتا ہے) تو اسے تم میرے غصہ پر محمول کرتی ہو۔ پگلی۔ تم سے کبھی کوئی خفا ہو سکتا ہے۔ ہوں؟

نجمہ :لیکن دو سطریں......

نعیم :دو سطریں لکھنے کی بھی فرصت مل گئی، اسی کو غنیمت سمجھو۔

نجمہ: اچھا آپ غسل خانے میں جا کر ہاتھ دھو لیجئے، میں چائے بناتی ہوں۔

نعیم: میں کہتا ہوں تم کتنی ...... تم کتنی ...... کیا کہنا چاہیے؟ یعنی کہ ...... کتنی اچھی ہو۔

نجمہ: (مسکراتے ہوئے) اچھا اچھا۔ چلئے، پہلے ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیجئے۔

نعیم: یہ پھر تم نے کپڑے بدلنے کی چیخ لگائی۔

نجمہ: کیوں کپڑے نہ بدلئے گا۔ ایک رات اور ایک دن گاڑی میں سفر کر کے آئے ہیں۔ راستے کی خاک دھول سارے جسم پر پڑی ہوئی ہے۔ چلئے چلئے جلدی ہاتھ دھو کر کپڑے بدلئے۔ میں اتنے میں چائے بناتی ہوں۔ (نعیم کو غسل خانے کے دروازے کی طرف دھکیل کر نوکرانی کو آواز دیتی ہے۔ کریمن

کریمن: (دوسرے کمرے کے دروازے سے جھانک کر) جی بیگم۔

نجمہ: سامان رکھوا لیا۔

کریمن: جی بیگم۔

نجمہ: یہ ٹرے اور پیالیاں اٹھا لے۔ پانی تو چائے کا ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ صاب ادھر ہاتھ منہ دھونے گئے ہیں۔ میں اور پانی رکھتی ہوں۔ اتنے میں یہ پانی پھینک کر چائے دانی اور پیالیاں اچھی طرح دھو ڈال۔

(کریمن پیالے وغیرہ اٹھاتی ہے، ایک چمچہ گر جاتا ہے۔)

(قدرے ترشی سے) یہ چمچہ پھر فرش پر گرا دیا تو نے بیس بار کہا ہے کہ چمچہ نہ گرایا کر۔ اب ٹرے باہر رکھ کر اس جگہ کو گیلے کپڑے سے صاف کر۔

نعیم: (غسل خانے میں سے) ارے بھئی صابن کہاں ہے؟

نجمہ: غور سے دیکھئے، وہیں غسل خانے میں پڑا ہے۔

نعیم: (وہیں سے) اور تولیہ؟

نجمہ: ہاتھ منہ دھو آیئے اور ادھر کمرے سے نیا تولیہ لے کر پونچھ لیجئے۔ (کریمن گیلا کپڑا لا کر فرش صاف کرتی ہے) کریمن فرش صاف کر رہی ہے اور میں چائے کا پانی بنانے جا رہی ہوں۔ (کریمن سے) تو فرش صاف کر، چائے دانی اور پیالیاں دھو ڈال۔ اور

میں پانی رکھتی ہوں چائے کا۔

(باورچی خانے کے دروازے سے چلی جاتی ہے۔ کچھ لمحے تک کریمن چپ چاپ فرش صاف کرتی ہے۔ پھر نعیم ہاتھ منہ دھو کر کرتے کی آستین چڑھائے گنگناتا ہوا آتا ہے۔)

ہنڈولا کیسے جھولوں میرا جیاڈولے رے

میں جھولا کیسے جھولوں میرا جیاڈولے رے

اور کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے اس تولئے سے منہ پونچھنے لگتا ہے، جس سے رضیہ اور ثریا ہاتھ پونچھ کے گئی تھیں)

نجمہ : (باورچی خانے سے) یہ کتیلی کیسی بنا رکھی ہے تو نے کریمن۔ منوں تو تیل جما ہوا ہے پیند سے پر۔ (کتیلی ہاتھ میں لئے باہر آجاتی ہے) تجھے کبھی برتن صاف کرنے نہ آئیں گے کریمن۔ کتنی بار کہا ہے کہ صفائی کا...... (اچانک نعیم کو رضیہ کے تولیئے سے منہ پونچھتے دیکھ کر تقریباً چیختے ہوئے) یہ سوکھا نیا تولیا ہے۔ آپ نے۔ میں کہتی ہوں آپ سوکھے اور گیلے تولئے میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔ ابھی تو رضیہ اور ثریا چائے پی کر اس تولئے سے ہاتھ پونچھ کر گئی ہیں۔

نعیم :(گھبرا کر) لیکن نیا......

نجمہ :نیا تولیہ ادھر کمرے میں ٹنگا ہے۔

نعیم :اوہ۔ یہ کمبخت تولیئے۔ مجھے خیال ہی نہیں رہتا۔ دراصل دونوں تولیئے

نجمہ :صاف ہیں۔ جی۔ ذرا آنکھ کھول کر دیکھئے۔ گیلے اور سوکھے......

نعیم :میں نے عینک اتار رکھی ہے اور عینک کے بغیر تم جانتی ہو ہماری دنیا......

نجمہ :جی آپ کی دنیا۔ نہ جانے آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ اب تو خیر عینک نہیں۔ پر عینک ہو بھی تو کون سا آپ کو کچھ نظر آتا ہے۔

(منہ لٹکا کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

نعیم : یہ تم نے پھر منہ لٹکا لیا۔ ناراض ہوگئی ہو......

نجمہ : (طنز سے ہنس کر) جی۔ میں ناراض نہیں۔

نعیم : (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ غصہ سے چلا کر) تمہارا خیال ہے کہ میں اتنا بیوقوف ہوں جو یہ بھی نہیں پہچان سکتا کہ......

(پردہ اچانک گرتا ہے)

داراشکوہ

• ڈاکٹر محمد حسن

(خسرو کی غزل کے دو شعر گائے جاتے ہیں)

ہمیں ریزی بہ بازی خون یاراں
چنیں باشد سزائے دوستداراں
منِ رسوا و ہر سُو خندۂ خلق
چوں مستے درمیانِ ہوشیاراں

پہلا منظر

(رواشن آرا کا ایوان۔ رقاصہ ناچ رہی ہے۔ محفل رقص کا سماں بندھ گیا ہے)

روشن آرا : (اچانک تلخی سے) رقص بند کرو۔ ہمارا دل سکون نہیں پاتا زرافشاں۔

زرافشاں : حضور

روشن آرا : کنیزوں سے کہو جائیں۔ ہمیں تنہائی چاہیے۔ (سب چلی جاتی ہیں صرف زرافشاں رہ جاتی ہے)

زرافشاں : (قریب آکر) نصیب دشمناں حضور شہزادی صاحبہ کا مزاج کیسا ہے۔ لیجئے۔ اب تو تخلیہ ہوگیا۔ اب تو حضور باندی سے دل کا حال

روشن آرا : (بات کاٹ کر) دل کا حال پوچھتی ہو۔ روشن آرا کے سر پر قیامت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ہمارے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ہمارا خون کھول رہا ہے۔ زرافشاں ہم سب کچھ کر ڈالیں گے۔ مسل کر رکھ دیں گے۔ آج ظل سبحانی نے دارا کو سردربار دوسرے تخت پر بیٹھنے کی اجازت دی۔ دارا کو ہاتھیوں کی لڑائی سے دل بہلانے کی رخصت دی گئی ہم یہ نہیں دیکھ سکتے۔

زرافشاں : مگر حضور ظل سبحانی کا حکم

روشن آرا : (بات کاٹ کر) روشن پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ یہ سارا بس انہیں بی جہاں آرا بیگم کا بویا

ہوا ہے۔ وہ ظل سبحانی کی ایسی چہیتی بنی ہیں کہ ظل سبحانی کے جیتے جی تخت وتاج کا فیصلہ کیئے دے رہی ہیں ہم جانتے ہیں زرافشاں ہندوستان کے تخت پر دارا کی پرچھائیں نہیں پڑے گی۔

زرافشاں :اے ہے۔ حضور شہزادی صاحبہ اس کی کیا فکر ہے۔

روشن آرا :تو نہیں سمجھتی دارا ہمارا بھائی ہے ہم اسے پہچانتے ہیں وہ جیت گیا تو جہاں آرا بیگم کا طوطی بولے گا۔ یہ دونوں مل کر تگنی کا ناچ نچائیں گے۔

زرافشاں :اے ہے حضور، آخر تو آپ کے بھائی ہیں۔ ذرا چل کر مبارکباد تو دے آیئے۔ لوگ کہیں گے۔ بھائی کو عزت ملی تو بہن کے منہ سے مبارکباد کا ایک حرف بھی نہ نکلا

روشن آرا :ابھی ہمارے مبارکباد دینے کا وقت نہیں آیا۔ ہم اس وقت مبارکباد دیں گے جب وہ پابہ زنجیر طوق پہنے کشاں کشاں دربار میں لائے جائیں گے۔

زرافشاں :ایسا نہ کہیے سرکار

روشن آرا : کیوں نہ کہوں۔ تمہارا دل ڈرتا ہے زرافشاں۔ اس لئے کہ تم لونڈی ہو ہم شہزادی ہیں۔ شہزادیوں کے بھائی بہن نہیں ہوتے وہ سنپولیوں میں پلتی ہیں یا وہ کسی کو ڈس لیتی ہیں یا وہ خود ڈس لی جاتی ہیں۔

زرافشاں :حضور کا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی

روشن آرا :کہو۔

زرافشاں :آخر صاحب عالم آپ کے بڑے بھائی ہیں۔ خون آخر خون ہے۔ آخر ماں جایا بھائی ہیں۔

روشن آرا : جاہلوں کی سی باتیں مت کرو۔ تم بزدلوں نے کبھی اپنے بھائیوں کو زنجیروں پہنے تلواروں کے زخم کھاتے نہیں دیکھا۔

زرافشاں :(گھبرا کر) نوج سرکار خدا نہ کرے

روشن آرا :ہم شہزادیوں کے لئے یہ کھیل ہے اور یہ کھیل دارا کے ساتھ بھی کھیلا جائے گا۔

(دارا داخل ہوتا ہے)

دارا : ہم آسکتے ہیں روشن!

روشن آرا : بھائی جان آپ!

(زرافشاں سلام کر کے چلی جاتی ہے)

دارا : کیا کھیل کھیل رہی تھیں

روشن آرا : کچھ نہیں یوں ہی شطرنج کی بازی کا ذکر تھا

دارا : خوب۔

روشن آرا : میں تو خود آپ کو مبارکباد پیش کرنے کے لئے حاضر ہونے والی تھی میں نے جب سے یہ خبر سنی ہے۔ دل ہی دل میں واری صدقے جارہی ہوں۔ خدا یہ تخت آپ کو مبارک کرے۔

دارا : کون سا تخت روشن

روشن آرا : واللہ حد ہوگئی ہے بے خبری کی۔ محل کے کونے کونے میں چرچا ہے کہ حضور ظل سبحانی نے آپ کو سر دربار دوسرے تخت پر بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

دارا : دلی کا تخت بہت چھوٹا ہے روشن۔ مجھے اس سے بہت بڑی دولت ملی ہے خواب میں مجھے بشارت دی گئی ہے۔ تجھے اللہ تعالیٰ ایسی نعمت عطا فرمائیے گا جو ساری دنیا میں کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سے دونوں جہان کی محبت میرے دل سے اٹھ گئی ہے اور فضل و رحمت کے دروازے میرے دل پر کھل گئے ہیں۔ یہ روحانی دولت دلی کے تخت و تاج سے کہیں زیادہ ہے۔

روشن آرا : بھیا۔ میں نہ چندر بھان برہمن ہوں نہ سرمد فقیر کہ آپ کی باتیں سمجھ سکوں۔ آپ تو مطالعہ و تصنیف میں ایسے کھوئے رہتے ہیں کہ تخت سے بھی بے نیاز ہوتے جارہے ہیں۔

دارا : میرے مرشد ملا جیو اور شاہ محمد نے مجھے یہی ہدایت دی ہے۔ (خاموش ہو جاتا ہے پھر تھوڑی دیر بعد سوچ کر) تمہارا نمازی بھیا محی الدین مجھے کافر کہتا ہے بات اتنی ہے کہ میں خدا کو ایک مانتا ہوں اس کے سوا دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔ ہر انسان کے دل میں اس کے نور کی چنگاری ہے۔ اس تک پہنچنے کے راستے الگ الگ ہیں۔ مگر سب کی منزل تو ایک ہے پھر میں دوسرے راستوں دوسری سچائیوں کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہ

کروں۔اپنشد اور بھگوت گیتا کے فارسی ترجمے ہوئے تو کتنے چھپے ہوئے بھید کھل گئے۔کیا بھید کھولنا کفر ہے۔کیا دوسرے مذاہب کو سمجھ کر حقیقت تک پہنچنا کفر ہے (پھر کچھ سوچنے لگتا ہے اور کھو جاتا ہے) تم نے بابا لال فقیر سے میرے سوال و جواب پڑھے ہیں۔

روشن آرا : آپ کی کتابیں اور رسالے تو اب اتنے ہیں کہ کوئی کہاں تک پڑھے۔

دارا : ان مکالموں کو پڑھنا۔ان میں میں نے حقیقت کو ایک نئے انداز سے بے نقاب کیا ہے۔

روشن آرا : بھیا صوفیوں اور فقیروں سے زیادہ اب آپ کو امراء سے کام لینا ہے

دارا : زمانہ بادشاہوں کے نام بھلا دیتا ہے فقیروں کا یاد رکھتا ہے۔

روشن آرا : خیال ہے آپ کا

دارا : نہیں۔تم کبھی علاء الدین خلجی کے مزار پر گئی ہو۔

روشن آرا : نہیں۔مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں دفن ہے۔

دارا : اور نظام الدین اولیاء

روشن آرا : ان کا مزار تو خیر و برکت کا دربار ہے۔

دارا : علاؤ الدین کو زمانے نے بھلا دیا مگر نظام الدین اولیاؒ اور امیر خسروؒ کو کون بھلا سکتا ہے۔مجھے ایک بات کا خیال نہ ہوتا تو میں ہندوستان کا تخت اپنے تینوں بھائیوں میں سے کسی ایک کے لئے چھوڑ دیتا۔

روشن آرا : (حیرت سے) بھیا! (تھوڑی دیر بعد) ایسی فال بد زبان سے نہ نکالئے۔

دارا : مگر خواہر عزیز میں اس ملک میں رواداری محبت اور ملاپ کی فضا چاہتا ہوں جو جد اعلیٰ شہنشاہ اکبر نے قائم کی تھی۔مذہب کو ملاپ کا ذریعہ ہونا چاہئے نفرت کا نہیں۔ہمارے دیس میں رام اور رحیم کے ماننے والے ہمہ اوست اور تت توام اسی میں اسی کا جلوہ دیکھیں۔میں تخت و تاج صرف اسی لئے چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر سارے مذہبوں کو ایک دوسرے سے قریب لاسکوں۔ایک بار پھر ہندوستان ایک ہو جائے یہی میرا خواب ہے یہی مرا ارمان ہے۔

روشن آرا : بھائی جان! آپ پر کفر کا جادو چل گیا ہے۔

دارا : کفر میں بھی اس کا جلوہ ہے۔اسلام میں بھی

روشن آرا : خیر آپ جانئے۔مگر ہندوستان ان خیالات کی تاب لا سکے گا۔

دارا : ممکن ہے میں ہندوستان کو ایک نہ کر سکوں ممکن ہے میرا سر بھی لال قلعے کے کنگوروں پر لٹکایا جائے۔ممکن ہے میں تخت و تاج کی لڑائی ہار جاؤں مگر میرا کام صرف کوششیں اور عمل ہے۔انجام سے مجھے سروکار نہیں۔

روشن آرا : آپ جو خواب دیکھتے ہیں بھائی جان۔ان کی تعبیریں کہاں سے آئیں گی۔

دارا : دارا اپنے خون سے ان خوابوں کو جگمگا کر چھوڑ جائے گا کہ آنے والی نسلیں ان سے اپنے چراغ روشن کر سکیں۔تاریخ ان خوابوں سے اپنی مانگ میں سیندور بھر سکے۔

(زرافشاں داخل ہوتی ہے)

زرافشاں : صاحب عالم! ظل سبحانی نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔

دارا : ابھی!

زرافشاں : تاکید فرمائی ہے۔

دارا : اچھا روشن: خدا حافظ

(روشن کھڑی ہو کر تعظیم دیتی ہے اور سلام کرتی ہے۔دارا چلا جاتا ہے تو کنیز کو روشن آرا اپنے پاس بلاتی ہے)

زرافشاں : حضور ایک راز کی بات معلوم ہوئی ہے۔

روشن آرا : جلدی بول

زرافشاں : ظل سبحانی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔

روشن آرا : کیا بکتی ہے۔

زرافشاں : سچ! شاہی چوبدار کہتا تھا کہ صاحب عالم کو اسی لئے بلایا گیا ہے۔

روشن آرا : ظل سبحانی کی طبیعت ناساز ہے.....(سوچتے ہوئے) ظل سبحانی کی طبیعت ناساز ہے۔

(اندھیرا)

دوسرا منظر

(کچھ مدت بعد۔ شاہجہاں کی خواب گاہ)

شاہ جہاں : ہماری علالت نے بھی کتنا طول کھینچا ہے

دارا : ظل سبحانی کی طبیعت چند ماہ سے علیل ہے۔ اب انشاءاللہ جلد ہی شفایاب ہو جائیں گے۔

شاہ جہاں : تم نے اور جہاں آرا نے ہمیں بچایا ہے۔

دارا : آپ کیا فرماتے ہیں!

شاہ جہاں : ہم حیران ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج اور مرے ہوئے شہنشاہ کو کون بچانا چاہتا ہے۔ سب ابھرتے ہوئے سورج کے پجاری ہوتے ہیں۔ تم عجیب شہزادے ہو کہ تخت کے وارث ہونے میں بھی جلد بازی سے کام نہیں لیتے۔

دارا : کیا تخت وتاج کی ہوس انسانیت سے بڑھ کر ہے۔ آپ کا سایہ سر پر ہے تو میرے لیئے یہی تخت وتاج سے کم نہیں۔

شاہ جہاں : اس بیماری میں ہمیں تمھاری قدر معلوم ہوئی۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ دارا ہمیں اتنا چاہتا ہے۔

دارا : ظل سبحانی۔ شرمندہ ہوں کہ آپ کے تمام احکام نہ بجالا سکا۔

شاہ جہاں : تم نے کون سے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

دارا : آپ کی علالت کی خبر راز نہ رہ سکی قلعے سے آمد ورفت پر سخت پابندی رکھی گئی مگر پھر بھی

افواہیں دکن اور گجرات تک جا پہنچیں ہیں۔مراد نے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔
محی الدین کی فوجیں راجدھانی کی سمت بڑھ رہی ہیں۔

شاہ جہاں : ہم دربار کریں گے۔کیا ہمارے جیتے جی وہ جانشینی کے لئے خون خرابہ کرنا چاہتے ہیں۔ہم انہیں حکم دیں گے کہ وہ بغاوت سے باز آئیں۔

دارا : ظل سبحانی۔یہ ہماری تقدیر ہے۔سارے مغل شہزادوں کی تقدیر ہے۔یا تو ان کے ہاتھ ان کے بھائیوں کے خون سے رنگے جائیں یا ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں اور انہیں دار پر لٹکایا جائے۔

شاہ جہاں : سرکاری فوجوں کو تیاری کا حکم دو۔ہم تمہارے ساتھ چلیں گے ان سرپھروں کو راجدھانی میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

دارا : نہیں ابا جان۔آپ کی صحت ابھی اس قابل نہیں۔میں آپ کا حکم ان تک پہنچا دوں گا آپ کے حکم کی بجا آوری میں مجھے جان بھی دینی پڑے تو میرے لئے عین سعادت ہے۔

شاہ جہاں : میرے بیٹے۔میرے سینے سے لگ جا۔کاش ہم ایک بوڑھے معمار ہوتے جو ہر روز مزدوری کرنے کے بعد شام کو اپنے بچوں کو سینے سے لگا سکتا ہے۔جسے اپنے بیٹوں کے خون سے ہولی نہیں کھیلنی پڑتی۔مگر دارا۔ہمت نہ ہارنا میرے بیٹے نیکی کبھی نہیں ہارتی۔یاد رکھنا حق تیرے ساتھ ہے۔

دارا : میرے اوپر بھروسہ کیجئے ابا جان۔دارا آپ کا حکم بجالائے گا اکبر اور شاہجہاں کے ہندوستان کے لئے دارا کو اپنا سب کچھ نچھاور کرنا پڑے تو بھی میرا قدم پیچھے نہ ہٹے گا فتح آپ کی ہوگی

شاہ جہاں : اچھا رخصت۔خدا کرے فتح وکامرانی تیرے قدم چومے۔خدا کرے تیرے ناعاقبت اندیش بھائی خانہ جنگی سے باز آئیں۔

(دارا رخصت ہوتا ہے)

(اندھیرا)

تیسرا منظر

(پنجاب کے میدانوں میں شاہی خیمے کے اندر رات کے وقت)

دارا :(خود کلامی کے انداز میں) دھرمٹ کی لڑائی ہاری جا چکی۔ صاحب عالم سے بے خانماں بے آسرا ہو کر پنجاب کے ان میدانوں میں بھٹکنا ہمارا مقدر ہے۔

نادرہ :اب کیا ہوگا میرے سرتاج!

دارا :اپنا جی میلا نہ کرو نادرہ۔ زمانہ کروٹیں بدلتا ہے۔ ہم نے جنگ ہاری ہے ہمت نہیں ہاری۔

نادرہ :یہ سب کچھ کیسے ہو گیا میرے آقا!

دارا :تقدیر کا کھیل ہے۔ ہماری فوج ساموگڑھ میں بہادری سے لڑی۔ اگر خلیل اللہ خاں غداری نہ کرتا تو فتح ہماری ہوتی۔ ہاتھی سے اتر کر ہمارا گھوڑے پر سوار ہونا غضب ہو گیا۔ ہودہ خالی دیکھ کر ہماری فوجوں کی ہمت پست ہو گئی۔ پانسہ پلٹ گیا۔

(نادرہ کی سسکی)

دارا :اب ہم تمہیں شاید ہندوستان کی ملکہ تو نہ بنا سکیں گے۔ صرف اپنے دل و جان کی سلطنت ہی تمہیں سونپ سکتے ہیں۔

نادرہ :میرے لئے آپ کے قدموں سے لگا رہنا ہی بڑی عزت ہے۔

دارا : ہمارا راستہ خطرناک ہے۔

نادرہ : میرے لئے آپ کے ساتھ موت بھی قبول ہے۔

دارا : تمہاری صحت ٹھیک نہیں رہتی نادرہ۔ میرے ساتھ تمہارا مارے مارے پھرنا ٹھیک نہیں

نادرہ : مگر یہاں پنجاب میں آپ کے جان نثار موجود ہیں۔ یہاں کے صوبیدار داؤد خاں پر تو آپ کے بڑے احسانات ہیں

(داؤد خان خیمے کے دروازے پر اپنا ذکر سن کر ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے)

دارا : احسان ایسا لفظ ہے جس کے معنیٰ بدلتے رہتے ہیں۔ وقت اور تقدیر سب کچھ بدل دیتی ہے۔

نادرہ : تو کیا آپ کو اس کی وفاداری پر شبہ ہے۔

دارا : اس کے بھی بیوی بچے ہیں۔ خاندان ہے اسے بھی عزت چاہئے اطمینان چاہیے۔ مگر دارا شبہ میں نہیں پڑتا۔ ہمیں یقین ہے نادرہ کہ موت اور زندگی سب خدائے عزوجل کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک وہ ہمیں زندہ رکھنا چاہے گا ہمیں کوئی بھی مار نہیں سکتا۔

نادرہ : ایسی باتیں نہ کیجئے۔

دارا : ہم نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے۔ مگر تمہیں اس آزمائش میں ڈالتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

نادرہ : میں کچھ نہیں سمجھی میرے سرتاج

دارا : (خط نکال کر دیتا ہے) یہ خط پڑھو۔

نادرہ : کیسا خط ہے

دارا : آج ہمارے جاسوس یہ خط اڑا لائے ہیں

نادرہ : کس کا خط ہے (خط لیتی ہے) محی الدین اورنگ زیب کا خط داؤد خاں کے نام! کیا یہ سچ ہے میرے سرتاج۔ کیا! ابھی ہماری مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا۔ کیا ہم خود جان بوجھ کر دشمنوں کے نرغے میں آ گئے ہیں۔

دارا : شاید جسم و جان کی نجات قریب ہے۔ ہم موت سے نہیں گھبراتے وہ تو وصال محبوب کا

پیام ہے۔ مگر نئے ہندوستان کے میرے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔ خواب مرتے نہیں دیتے نہیں تو میں اپنے کو محی الدین کے حوالے کردیتا اور کہتا: ''لواس تھکے ہارے جسم کو پھانسی پر ٹانگ دو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالو۔ میری روح اس سے بہت بلند ہے اس تک تمہارے ناپاک ہاتھوں کی رسائی نہیں۔''

نادرہ : ایسا نہ کہیئے۔ فال بد زبان سے نہ نکالئے۔ یہاں سے کوچ کی تیاری کیجئے۔ داؤد خان نمک حرام کے چنگل سے.....

(اتنے میں داؤد خان کی کرخت مگر باادب آواز سنائی دیتی ہے۔)

داؤد : شہزادہ بلند اقبال داؤد خاں شرف باریابی چاہتا ہے۔

(داؤد خاں اندر آتا ہے۔ مگر اس کی تلوار اور لباس خون آلود ہے)

دارا : خوش آمدید۔ مگر اس طرح کیوں۔ یہ خون میں ڈوبی ہوئی تلوار تمہارے ہاتھ میں۔ جسم پر یہ خون میں لت پت پوشاک کیا ہوا تمہیں۔

داؤد : کچھ نہیں۔ یہ خون کے چھینٹے نہیں وفاداری کی مہریں ہیں۔ میں نے انہیں قتل کرڈالا میں نے اپنے بیوی بچوں کو قتل کرڈالا صاحب عالم۔ ان ہی بیوی بچوں کی خاطر تو آپ میری وفاداری پر شک کرتے تھے آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں ان کی خاطر آپ سے نمک حرامی کروں گا اس شہزادے کو دغا دوں گا۔ جس کے احسانات میرے ریشے ریشے میں سمائے ہوئے ہیں۔ میں نے سب کا خون کردیا۔ سب کا خون کردیا۔

دارا : داؤد خاں۔ یہ تم نے کیا کیا ایک بے آسرا شہزادے کے لئے خود بے آسرا ہو گئے۔ میرے جاں نثار دوست۔ تم نے یہ کیا کیا۔ ہم تمہارے بیوی بچوں کو کیا جواب دیں گے۔ جب وہ حشر کے دن ہمارے دامن گیر ہوں گے اور پوچھیں گے کہ ان کی زندگی ان کی مسرت اور ان کا بچپن ہم نے کیوں چھین لیا۔

داؤد : میری وفاداری پر بھروسہ کیجئے صاحب عالم۔ پنجاب میں قیام فرمایئے یہاں کا بچہ بچہ آپ کے لئے جان نچھاور کردے گا۔

دارا : نہیں۔ اب ہمیں جانا ہی ہوگا۔

داؤد : خدارا ایسا نہ کہئے۔ فتح ونصرت آپ کے قدموں سے لگی ہوئی ہے پنجاب آپ کے لئے سردھڑ کی بازی لگادے گا۔

دارا : داؤدخاں۔ بادشاہ کورحمت کا پیغام ہونا چاہئے۔ جب موت اس کی ہم رکاب ہو جب اس کا سایہ اس کے رفیقوں کے گھر بے چراغ کردے تو اس کی شکست یقینی ہے۔

داؤد : میں جان دے دوں گا مگر صاحب عالم کو پنجاب نہ چھوڑنے دوں گا۔

دارا : ہمارے ضمیر پر تمہارے خاندان کے خون کا بار بہت ہے۔ داؤد یہ بہت بڑا بوجھ ہے۔

داؤد : تو اس غلام کو اجازت مرحمت فرمائیں کہ آپ کے قدموں سے لگا رہے۔

دارا : نہیں داؤد۔ دارا کو اگر ناکامی اور وفاداری کی موت مرنا ہے تو دوسروں کے لئے وہ تباہی کا پیغام کیوں بنے۔ ہمیں تنہا چھوڑ دو۔ یہ ہمارا حکم ہے۔

داؤد : تو خدارا مجھے بتایئے کہ صاحب عالم کے احسانات کا بدلہ کیسے ادا کروں۔ اگر مجھے ایک ہزار زندگیاں بھی ملتیں تو میں ہر بار آپ ہی کے قدموں پر نچھاور کرتا۔

دارا : جاؤ ہمیں تنہائی چاہئے۔ خدا تمہاری مدد کرے میرے جانثار دوست۔ خدا حافظ۔

(اندھیرا)

چوتھا منظر

(بلوچستان کا علاقہ ۔ وہی خیمہ)

نادرہ : **(کھانستے ہوئے)** اب ہم کہاں ہیں۔

دارا : ہمارا قافلہ بلوچستان کے قریب آ پہنچا ہے۔

نادرہ : داؤد خان ٹھیک کہتا تھا میرے سرتاج ۔ اگر ہم راتوں رات پنجاب سے نہ بھاگتے تو ان مصیبتوں میں نہ پھنستے۔

دارا : ملتان اور سندھ کے سفر کی مصیبتیں کاٹھیاوار اور اجمیر کے سفر کی صعوبتیں دیورائی کی فیصلہ کن لڑائی کی مصیبتیں ۔ اب دارا کے لئے زندگی مصیبتوں کی ایک طویل داستان ہے۔

نادراہ : کتنا سفر اور باقی ہے۔

دارا : نادرہ ۔ تمہاری طبیعت بہت خراب ہے۔ طبیب کہتا ہے سفر خطرناک ہے۔

نادرہ : میں اچھی ہوں مالک

دارا : ہر طرف اندھیرا ہے۔ ہر طرف مایوسی کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ فرار کے راستے بھی بند ہیں ۔ البتہ بلوچی سردار ۔ میرزا آیا تھا وہ ہمیں قندھار تک حفاظت سے پہنچانے کا وعدہ کرتا ہے۔

نادرہ : کیا اور کوئی راستہ نہیں ہے کیا ہندوستان چھوڑنا ہی پڑے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ مرنے کے بعد اسی ملک میں دفن کی جاؤں جس کی خاک کو ہم نے اپنے خون سے سینچا ہے۔

دارا : قندھار سے ہم کمک لیکر ہندوستان آئیں گے۔ ہم کامیاب ہوں گے مگر اس وقت تو جانا ہی ہوگا۔

نادرہ : میرا دل ڈرتا ہے میرے مالک۔ قبائلیوں کے ہاتھ میں اپنی عزت سونپنا نہیں چاہتی۔ اس اجنبی ملک کا کیا بھروسہ۔

دارا : ایک راستہ اور ہے۔ درہ بولن کے قریب دادار کے صوبے دار ملک جیون کو میں نے ایک بار ہاتھی کے پاؤں تلے روندے جانے سے بچایا تھا۔ اس کی جاں بخشی کے لئے ہی میں نے جہاں پناہ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔ چلو دادر میں اس کی پناہ میں چلتے ہیں۔ پھر دیکھا جائے گا۔

(اندھیرا)

پانچواں منظر

(وہی خیمہ۔کوہستان کا پس منظر)

نادرہ :دادر کتنی دور ہے مالک۔

دارا :بہت قریب ہے۔

نادرہ :میں دادر پہنچ سکوں گی۔

دارا :کیوں نہیں۔راستہ زیادہ دشوار نہیں ہے۔

نادرہ :نہیں میرے سرتاج مجھے بہت دشوار لگتا ہے۔

دارا :ایسا نہ کہو نادرہ۔دنیا میں دارا کا آسرا تم ہی ہو۔

نادرہ :مجھے دکھ ہے صاحب عالم۔آپ کو تنہا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔مصیبتوں میں دشمنوں میں تنہا چھوڑ کر۔

دارا :نہیں نادرہ نہیں۔قدرت اس قدر بے رحم نہیں ہو سکتی۔میرے خدا! بے آسرا اور بے خانماں دار پر رحم۔بار خدایا! ہمیں اور زیادہ آزمائش میں نہ ڈال۔

نادرہ :میری ایک آرزو ہے صاحب عالم!

دارا :کہو! دارا کی جان تیرے لفظ پر قربان ہو۔

نادرہ :میں اس شہر میں دفن کی جاؤں جہاں ملکہ نور جہاں دفن ہیں۔وہ اپنے شوہر کی چہیتی

تھیں اور مجھے آپ کا غیر فانی پیار ملا۔ میرے لئے یہی سب سے بڑی دولت ہے۔

دارا : میری البیلی ملکہ۔ نادرہ۔تم نے دارا سے مانگا بھی تو کیا مانگا مدفن کے لئے زمین۔تم نے آسمان کے تارے مانگے ہوتے دارا اپنی جان دے کر بھی انہیں کہکشاں سے توڑ کر تمھارے قدموں پر نچھاور کرتا۔ چاند اور سورج مانگے ہوتے کہ پیار سے آرتی اتارتے۔تم نے اس تہی دست سے مانگی بھی تو قبر کے لئے زمین۔

نادرہ : (بے ہوشی کے عالم مین) چاروں طرف اندھیرا ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ مجھے معاف کرنا صاحب عالم مجھے معاف کرنا۔

(موت کی ہچکی)

دارا : نادرہ! نادرہ! نادرہ!

(اندھیرا)

چھٹا منظر

(وہی خیمہ۔ وہی جگہ۔ صبح تڑکے)

قافلہ سالار :**صاحب عالم! سپاہیوں** کے لئے کیا حکم ہے۔

دارا :شہزادی صاحبہ کے جنازے کو لے کر گل محمد اور مقبول کو پنجاب بھیج دیا گیا؟

قافلہ سالار :حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔

دارا :خوب (کچھ سوچ کر) کوچ کی تیاری کرو۔ درہ بولن کی طرف چلو۔ اسے پار کر کے ہم قندھار چلیں گے۔

ساتواں منظر

(اسٹیج خالی ہے قافلہ داخل ہوتا ہے۔ دارا سب سے آگے ہے دوسری سمت زرہ پوش ملک جیون داخل ہوتا ہے اس کے ساتھ زرہ پوش دو چار سپاہی اور بھی ہیں۔)

ملک جیون :ٹھہرو! یہ قافلہ آگے نہیں جائے گا۔

دارا :کون (ملک جیون نقاب الٹ دیتا ہے) ملک جیون! کیا چاہتے ہو۔

ملک جیون :اپنا انعام!

دارا :اب دارا کے پاس کچھ نہیں ہے۔

ملک جیون :مگر شکست خوردہ دارا کو محی الدین کے حوالے کر کے ہی اب بھی بہت کچھ پا سکتا ہوں

دارا :ملک جیون! کیا انسان اتنا ذلیل بھی ہو سکتا ہے۔ کیا اس قدر احسان فراموش اور کمینہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا تو وہ دن بھول گیا جب دارا نے تجھے ہاتھی کے پاؤں تلے کچلے جانے سے بچالیا تھا۔

ملک جیون : وہ شہزادہ دارا تھا۔ یہ باغی دارا ہے۔ یہ دنیا ہے۔شہزادے یہاں جب بھائی بھائی کا خون پیتا ہے۔ بیٹا باپ کا گلا گھونٹتا ہے۔ ایسی دنیا میں احسان اور محسن کی کیا قیمت ہے۔

دارا : مجھے احسان اور محسن کی قیمت نہ بتا۔ غدار۔ تو کیا چاہتا ہے۔

ملک جیون : دہلی تک آپ کی ہم رکابی کا شرف

دارا : تو ہمیں حراست میں لینا چاہتا ہے

ملک جیون : سپاہیو! دیکھتے کیا ہو صاحب عالم کو حراست میں لے لو۔ شہزادہ سپہر شکوہ کو پیٹھ کے پیچھے باندھ دو۔

دارا : احسان فراموش ذلیل کتے! قسمت کے اس کھیل میں تو جلاّد ہے اور ہم مظلوم۔ ہم نے تیری جان بچائی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں ہماری جان لے لے۔ مگر شہزادہ سپہر شکوہ نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ خبردار! کبھی کسی مغل شہزادے نے یہ ذلت برداشت نہیں کی۔

(سپاہی شہزادہ سپہر شکوہ کو گھیر لیتے ہیں۔ دارا ان کی طرف جھپٹتا ہے۔ مگر مجبور ہو جاتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے۔)

آٹھواں منظر

(قلعہ کا ایک حصہ۔ اورنگ زیب کا ایوان۔ اورنگ زیب سوچ میں ٹہل رہا ہے۔)

روشن آرا : (ہنستی ہے) محی الدین بھیا بھی خوب ہیں۔ ہندوستان کی بادشاہی دروازے پر دستک دے رہی ہے اور اب بھی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بخدا اس سادگی کا بھی جواب نہیں۔

اورنگ زیب: ہمیں بڑا اہم فیصلہ کرنا ہے۔

روشن آرا : اے ہے۔ ذرا ہم بھی تو سنیں کون سا ایسا اہم فیصلہ ہے وہ ذرا سی دیر میں ابھی ہوا جاتا ہے۔

اورنگ زیب: کل دارا کی تشہیر کی گئی۔ ایک بے حال اور بدرونق ہتنی پر بٹھا کر اس کو ذلت کے ساتھ بازاروں میں گھمایا گیا۔

روشن آرا : (ہنستی ہے) خوب ہوا۔ تو اس میں بھلا اس قدر سوچ کی کیا بات ہے۔

اورنگ زیب: جانتی ہو کیا ہوا۔ دارا سر جھکائے ہتنی پر بیٹھا تھا۔ ایک فقیر اس کی ہتنی کے پاس آیا اور چلایا۔ دارا جب تو صاحب ثروت تھا تو ہمیشہ مجھے خیرات دیا کرتا تھا اب کس کے پاس جاؤں۔ آج تو تیرے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ دارا نے سر سے اپنا عمامہ اتار کر فقیر کی طرف پھینک دیا۔

روشن آرا : تو کیا ہوا۔ فقیروں ہی نے دارا کا دماغ خراب کیا ہے۔

اورنگ زیب: عوام میں بہت مقبول ہے۔ آج صبح ملک جیون اور اس کے ساتھیوں پر دلی والوں نے حملہ کر دیا۔ وہ جس راستے سے گزرتے تھے لوگ ان پر گندگی اور کوڑا کرکٹ پھینکتے تھے۔ اگر دارا کو قتل کر دیا گیا تو ڈر ہے کہیں عوام شورش نہ کریں اس کا قتل مصلحت کے خلاف ہے۔

روشن آرا : دشمن کو اپنے چنگل میں لا کر چھوڑ دینا کون سی مصلحت ہے۔

اورنگ زیب: عوام بغاوت کر دیں گے۔ میں بھائی کے قتل سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔

روشن آرا : تو آپ بھی مذہب اور معاملات میں باپ اور بھائی کا امتیاز کرتے ہیں۔ انصاف اندھا ہوتا ہے بھائی جان۔

اورنگ زیب: تقریب خاں، دانشمند خاں اور خلیل اللہ خاں کے علاوہ سبھی امرائے سلطنت کا یہی مشورہ ہے کہ دارا کو گوالیار کے محفوظ قلعے میں قید رکھا جائے۔

روشن آرا : امراء سب بزدل اور بے وقوف ہیں۔ میں کہتی ہوں بھائی جان کیا آپ بھول گئے کہ دارا نے آپ کے خلاف کیا کیا سازشیں کی تھیں۔ بیجاپور میں کس طرح آپ کو لڑائی سے واپس بلایا تھا۔ کس طرح جاگیر اور دولت کے لئے ترسایا۔ کس طرح اپنا نیا محل دکھانے کے بہانے آپ کو ایسے کمرے میں قید کرنے کا منصوبہ بنایا جس کا صرف ایک دروازہ تھا۔ کس طرح ابا جان کی بیماری کی خبر آپ سے چھپائی گئی اور اپنی تخت نشینی کا پورا پورا انتظام کیا گیا۔ کیا جاہل عوام کے جذبات کی خاطر آپ سلطنت دین اور انصاف کا خون کر دیں گے۔ آپ سانپ کو دودھ پلا پلا کر پالیں گے کہ وہ ایک دن تخت طاؤس کو ڈس لے۔ اگر آپ اور آپ کے امراء اس قدر بزدل ہیں تو میں کہتی ہوں تلوار مجھے دیجئے میں اس کا سر اتار لوں گی۔

اورنگ زیب: بس روشن آرا۔ ہمارے قہر کو مت للکارو۔

روشن آرا : بھائی جان مجھے دارا کا سر چاہئے۔ میں اسے ابا جان اور ان کی چہیتی جہاں آرا کو تحفے

میں بھیجوں گی۔

اورنگ زیب: ہم وعدہ کرتے ہیں روشن ۔مرتد کو قتل کیا جائے گا۔کل اس کی لاش بازار میں ذلت کے ساتھ گھسیٹی جائے گی اوراس کا سر تیرے قدموں میں ڈال دیا جائے گا۔(غصے میں تلوار سنبھالتا ہوا محل سے باہر چلا جاتا ہے۔روشن خوشی اور غرور سے مست تھوڑی دیر اس کو جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔)

(اندھیرا)

نواں سین

(قید خانے میں دارا کی کوٹھری)

دارا : (قید خانے کا دراوزہ کھلتا ہے اور نذر خاں کو داخل ہوتا دیکھ کر) تم آ گئے نذر خاں۔ وہ گھڑی آ گئی آخر کار۔

نذر خاں : ہم لوگ تو صرف ظل سبحانی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔

دارا : ظل سبحانی۔ کون ظل سبحانی!

نذر خاں : محی الدین اورنگ زیب عالم گیر فرماں روائے ہندوستان۔

دارا : تم تخت و تاج کے اندھے پجاری کو ظل سبحانی کہتے ہو۔

نذر خاں : ظل سبحانی کا پیغام ہے اگر آپ اپنے ملحدانہ خیالات سے توبہ کر لیں تو خدا اب بھی بڑا غفار ہے۔

دارا : اس سے کہنا دارا بیوپاری نہیں ہے۔ وہ خوابوں کے لئے مر سکتا ہے خوابوں کی تجارت نہیں کرتا۔ اگر ساری انسانیت کو پیار کرنا کفر ہے تو ہم کافر ہیں۔ میرے نادان بھائی سے پوچھنا کہ انسانیت کو پیار کرنا کفر ہے۔ تخت و تاج کے لئے باپ بھائی کو قتل کرنا کفر نہیں ہے۔ اس سے کہنا یہ بھی خدا ہی کا کرشمہ ہے ہم میں سے

ایک کو جلاد کا روپ ملا ہے۔ دوسرے کو شہید کا۔ ایک قاتل بنا ہے دوسرے کا سر نذر کرنے کو تیار ہے۔ اس کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے کہ صحیح راستے پر کون تھا۔ کون ہندوستان کا محسن تھا اور کون غدار۔

نذرخاں :تو آپ تائب ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

دارا :ہاں

نذرخاں :آپ ظل سبحانی محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

دارا :ہمیں وحدہٗ لاشریک کے سوا اور کسی کی اطاعت قبول نہیں

نذرخاں : تو مجھے مجبوراً احکام کی تعمیل کرنی ہوگی۔ مجھے مجبوراً انصاف کا ناخوشگوار فرض ادا کرنا ہوگا۔

دارا :اس بزدل حکمراں سے کہو کہ ہمارے ہاتھ میں تلوار دے کر خود مقابلہ کرے۔ کیا انصاف یہی ہے کہ ایک نہتے مغل شہزادے پر قید خانے میں تم سب ٹوٹ پڑو۔ کیا یہی انصاف ہے کہ ابا حضور کے جیتے جی ملک گیری کے خواب دیکھنا اپنے شفیق باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا انصاف ہے کیا بھائی کے خون سے ہاتھ رنگنا انصاف ہے۔

نذرخاں :شہزادے انصاف کا فیصلہ تلوار کیا کرتی ہے۔

دارا : تو پھر کیوں ڈرتے ہو۔ دارا کا سر کاٹ لو۔ مگر کیا تم ہمارے خیالات کا سر بھی قلم کرسکو گے۔ ہماری روح کو بھی قتل کرسکو گے۔ ہمارے ساتھ ہمارے تصورات کو دفن کرسکو گے۔ دنیا کے سارے شہنشاہ مل کر بھی ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ ہمارے لئے یہی کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے عظیم خیالات کے لئے جان دینے کی سعادت بخشی ہے۔

نذرخاں : سپاہیو! تلواریں نکالو۔

دارا :تلوار کھینچتا ہے۔ ذلیل کتے ٹھہر (چاقو نکالتا ہے) ہمارے اس چاقو کی ضرب سنبھال تا کہ تاریخ میں یہ نہ لکھا جائے کہ مغل شہزادے بزدل تھے۔ جو مقابلے کے بغیر ہتھیار

ڈال دیتے تھے ہم مقابلہ کریں گے۔

(نذر خان کی تلوار سے داراشکوہ گھائل ہو کر گرتا ہے)

آہ۔ خداوند! تیرا شکر ہے تو نے اس حقیر بندے کو شہادت کی خلعت بخشی۔ سپہر شکوہ کو اور اپنے ملک ہندوستان کو تیری پناہ میں چھوڑتا ہوں۔ خدایا ہمارے خیالوں کی مہک سارے ہندوستان میں پھیلانا۔ خدایا!!

(پردہ گرتا ہے)

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

● قادر خان

کردار

آدمی

سپرنٹنڈنٹ گاے ٹونڈے

اجنبی

سکریٹری Horticultural Dept.

چپراسی Peon

سکریٹری Agricultural Dept.

کلرک

سکریٹری Cultural Dept.

ہیڈکلرک

(اس ڈرامے کا مرکزی خیال جناب کرشن چندر کے افسانے "جامن کا پیڑ" سے لیا گیا ہے)

سچوالیہ کے کمپاؤنڈ کا یہ ایک حصہ ہے۔ اسٹیج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اگلے حصے میں جامن کا ایک پیڑ گرا ہوا ہے۔ شاخیں اور ٹہنیاں نمایاں نظر آ رہی ہیں۔ اس کے نیچے ایک آدمی دبا ہوا ہے۔ جس کا چہرہ سامعین کی طرف ہے اور پچھلے حصے میں سچوالیہ کا آفس ہے۔ وہاں تین مختلف شعبوں کے آفس ہیں۔ پہلا ہارٹی کلچرل (ڈپارٹمنٹ) دوسرا دیاپار یہ وبھاگ اور تیسرا اگریکلچرل ڈپارٹمنٹ ہے۔ ہر شعبے میں ایک ٹیلی فون اور دوسرے حصے میں دو ٹیلی فون ہیں۔ جس وقت ڈرامہ شروع ہوتا ہے ایک روشنی کا دائرہ اگلے حصے کی طرف جہاں ایک آدمی پیڑ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ وہاں آتا ہے اور بتدریج وہ روشنی اگلے حصے کو منور کرتی ہے۔ پچھلے حصے میں مکمل اندھیرا ہے۔ اور جس وقت پچھلے حصے میں روشنی ہوتی ہے اگلے حصہ اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے یہ دوبار ہوتا ہے۔ ایک اجنبی گھومتے پھرتے اس کمپاؤنڈ میں داخل ہوتا ہے۔

آدمی : اے بھائی۔

اجنبی : کون ہے بھائی؟

آدمی : ارے ادھر

اجنبی : ادھر یعنی کدھر

آدمی : اس پیڑ کے نیچے

اجنبی : پیڑ کے نیچے! اچھا تو حضور یہاں آرام فرمارہے ہیں واہ واہ کیا کمپوزیشن ہے۔ آدمی اوندھے منہ گرا ہوا ہے۔ پیٹھ پر جامن کا پیڑ گرا ہوا سامنے سچوالیہ کھڑا ہوا اے مسٹر تمہیں کیا ہوا۔

آدمی : ارے بھائی مجھے اس پیڑ کے نیچے سے نکالو

اجنبی : وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ اس پیڑ کے نیچے کیا کررہے ہیں

آدمی : کر کچھ نہیں رہا ہوں بھائی رات اس کمپاؤنڈ میں آیا تھا کچھ لکھنے کی غرض سے۔ بڑی زور کی ہوا چلی یہ جھاڑ کھڑکر میری پیٹھ پر گر پڑا۔ رات طوفان آیا تھا نا۔

اجنبی : رات طوفان آیا تھا۔ ارے میاں سچوالیہ میں دن میں طوفان آتے ہیں۔ یہ رات میں کب سے آنے لگے۔ پر میاں تم ہو بڑے قسمت والے۔

آدمی : میں جامن کے پیڑ کے نیچے دبا ہوں اور آپ کہتے ہیں قسمت والا ہوں۔

اجنبی : تم سمجھے نہیں یار تم کسی ویسے پیڑ کے نیچے تھوڑے ہی دبے ہو تم تو سچوالیہ کے پیڑ کے

نیچے دبے ہو میاں ۔ چوالیہ؟ ارے پھر یہ پیڑ تو قسمت والوں پر ہی گرتا ہے ۔ نہ جانے کتنے تو اس کی تمنا دل میں لئے ہی مر گئے ۔ اب دیکھنا تھوڑی دیر میں کیا ہنگامہ ہوتا ہے۔

آدمی : ہنگامہ۔

اجنبی : جی ہاں ہنگامہ منسٹر آئیں گے چیف منسٹر آئیں گے، ہاشم بھائی جیٹھا کا کرین منگوائیں گے ۔ اس پیڑ کو اٹھوائیں گے ۔ آپ کو منسٹر صاحب کے روم میں لے جائیں گے آپ کا انٹرویو ہر پیپر میں چھپوائیں گے ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ تو منٹوں ہی میں انٹرنیشنل فیگر بن جائیں گے اور ہم بے چارے منہ دیکھتے رہ جائیں گے ۔ تم نے تو سنا ہوگا ۔ کچھ دنوں پہلے ہمارے گورنر صاحب کے بنگلے میں ایک چور گھس گیا تھا وہ صاحب واہ کیا آؤ بھگت کی گئی تھی اس چور کی ہر اینگل سے فوٹو اتارا گیا اور آخر میں تمام منسٹر کے ساتھ اس کا گروپ فوٹو اتارا گیا جو آج تک چوالیہ میں لٹک رہا ہے۔

آدمی : لیکن جب تک تو میں مر جاؤں گا۔

اجنبی : ارے یہ چوالیہ والے تمہیں اتنی جلدی مرنے تھوڑے ہی دیں گے اچھا یار میں تو چلتا ہوں Best of luck۔

آدمی : ارے بھائی مجھے اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔

اجنبی : ارے اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا نا تو سمجھ بیٹھیں گے یہ پیڑ میں نے ہی گرایا ہے۔

آدمی : ارے بھائی مذاق چھوڑو ۔ اور مجھے اس پیڑ کے نیچے سے نکالو۔

اجنبی : میں نکالوں! اچھا پہلوان ڈھونڈھا ہے یار خیر کوشش کرتا ہوں ارے یہ پیڑ دس آدمیوں سے نہیں ہلنے والا ۔ پیڑ دیکھ کر دبنا تھا یار اب کیا کروں۔

ارے ہاں وہ سامنے سے peon آرہا ہے اسے خبر کرتا ہوں ۔ اے بھائی او بھائی صاحب ۔ ہاں ہاں تم ذرا ادھر آنا۔

(peon داخل ہوتا ہے)

peon : کیا ہے۔

اجنبی : ارے یار تم تو کاٹنے کو دوڑ رہے ہو۔ ارے بھائی کہاں چل دیئے۔

peon : کیا ہے

اجنبی : ذرا اوپر جا کر خبر کر دو کہ آدمی پیڑ کے نیچے دب گیا ہے۔

(peon ہاں ہاں کرتا ہوں)

اجنبی : واہ کیا چال پائی ہے۔ تم ایسے نہیں مانو گے۔ ارے بھائی سنو کیا نام ہے تمہارا۔

peon : پانڈورنگ۔

اجنبی : بڑا اچھا نام ہے کس نے رکھا۔

peon : باپ نے۔

اجنبی : کیوں ماں نے نہیں رکھا۔ یہ لو۔

peon سلام صاحب!

اجنبی : دیکھا۔

آدمی : کیوں کیا ہوا۔

اجنبی : مریل گھوڑے کو چونی کی گھاس کھلائی تو ریس کا گھوڑا بن گیا۔ اب دوبارہ کسی پیڑ کے نیچے دبنا تو چار آٹھ آنے جیب میں رکھ کر دبنا ورنہ یہ چپراسی والے تمہیں نکالیں گے نہیں۔

آدمی : میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔

اجنبی : پرانا ڈائیلاگ ہے یار کوئی نئی بات کرو۔ ارے ہاں وہ peon دو جنٹیل سے آدمیوں کو لے کر آرہا ہے۔

(کلرک، ہیڈ کلرک اور peon کی انٹری)

peon : اگا صاحب بگا۔

ہیڈ کلرک : ارے رے رے بے چارہ۔

اجنبی : کیوں کیا ہوا۔

ہیڈ کلرک : جامن کا پیڑ گر گیا۔

اجنبی :واہ صاحب واہ کیا standard ہے افسوس کرنے کا۔

کلرک :شرما صاحب یہ بڑے بڑے جامن لگتے تھے۔اس پیڑ میں کیا بھروسہ ہے زندگی کا۔

اجنبی :جی ہاں۔ یہاں بھی ایک زندگی ہے جس کا بھروسہ بہت کم ہے۔ارے ارے یہ آدمی اس پیڑ کے نیچے دب گیا ہے۔

ہیڈ کلرک :ہاں دیکھ لیا اس کو بھی۔اے ادھر آؤ تم اوپر جا کر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو خبر کرو ایک آدمی جھاڑ کے نیچے دب گیا ہے۔جاؤ۔

اجنبی :چلئے صاحب ہم اور تم ملکر اس پیڑ کو اٹھوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہیڈ کلرک :ہم اور تم! ہم تو ٹھیک ہے مگر تم کون ہے؟

اجنبی :اجی صاحب مجھے ماریئے گولی۔آیئے اس پیڑ کو اٹھاتے ہیں۔

ہیڈ کلرک :ارے بھائی ہم کیسے اٹھا سکتے ہیں؟

کلرک :ہو!

اجنبی :کیوں۔

ہیڈ کلرک :ارے بھائی، We are clerks, he is a clerk, I am H.C. and this is below our dignity اور پھر جب تک اوپر سے حکم نہیں آتا یہ جھاڑ یہاں سے ہل نہیں سکتا۔

اجنبی :اوپر سے یعنی!

ہیڈ کلرک :اوپر سے یعنی اوپر سے!

اجنبی :اچھا! اچھا! اوپر سے میں سمجھا اوپر سے ان اوپر والوں نے تو زندگی برباد کر رکھی ہے۔

کلرک :وہ کیسے۔

اجنبی :اب دیکھئے اوپر والے نے پیڑ گرایا۔ نیچے والا دب گیا۔اب اس نیچے والے کو نکالنے کے لیے پھر اوپر والے سے Permission لانی پڑے گی۔

آدمی :اب کیا ہوگا۔

اجنبی :وہی ہوگا جو تمہاری قسمت میں لکھا ہوگا۔تمہارا کوئی وارث ہے جس کو جا کر میں

خبر کر دوں۔

آدمی :جی نہیں میں لاوارث ہوں۔

اجنبی :کیوں وہ سب کے سب کسی پیڑ کے نیچے دب کر مر گئے۔ خیر رہتے کہاں ہو؟

آدمی :جی کہیں بھی نہیں۔

اجنبی :بہت خوب!

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

بھئی واہ کیا Introduction ہے بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر

آدمی :جی ہاں وہ تو میں پہلے ہی جانتا تھا۔ جب آپ نے مجھے آواز دی تھی۔

ہیڈ کلرک :اس کا کوئی وارث ہے۔

اجنبی :جی ہاں ایک میں رہ گیا ہوں۔

ہیڈ کلرک :اس کا نام کیا ہے؟ اجنبی ،غریب

ہیڈ کلرک :تمہارا نام کیا ہے۔

اجنبی :درد۔

ہیڈ کلرک :تم دونوں رہتے کہاں ہو!

اجنبی :غریب اور درد کہاں رہ سکتے ہیں۔ لکھ دیجئے ساتھ ہی میں رہتے ہیں۔

ہیڈ کلرک :غریب درد ساتھ میں رہتے ہیں

(سپرنٹنڈنٹ گاتے گاتے تو ندے داخل ہوتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ: ین می کاے کرنار سگڑی کاۓ جانگڑ چال لی لی ۔ آہے۔ ارے بابا پبلک اپنے کو بولے گا کہ کچرا اٹھانے کو تو اٹھاۓ گا ارے نہیں نہیں اٹھائیگا۔

(ہنسی)

آدمی :یہ کیا ہو رہا ہے؟

اجنبی :کٹھ پتلی ناچ رہی ہے۔

ہیڈ کلرک، کلرک، سپرنٹنڈنٹ :What

اجنبی : اجی میں نے کہا ہیڈ کلرک صاحب اب تو اس پیڑ کو بھی شرم آ رہی ہے اور آپ ہیں کہ۔!

ہیڈ کلرک : بگا صاحب۔ بگا۔

سپرنٹنڈنٹ : ہا کائے جھالا

اجنبی : دیکھ لیجئے

سپرنٹنڈنٹ : ہیں جاڑ پڑلا کروا

اجنبی : کیا

سپرنٹنڈنٹ : بھتنے یہ جھاڑ اگرا کیسے۔

اجنبی : جی وہی تو میں نہیں جانتا مگر کل رات یہ صاحب یہاں آئے تھے اور یہ پیڑ ان پر گر پڑا۔

سپرنٹنڈنٹ : جا من وامن چوری کرنے کو اوپر چڑھا ہوگا۔

اجنبی : لیجئے صاحب ایک میڈل تو آپ کا بھی مل گیا آپ کیا سمجھتے ہیں! یہ یہاں چوری کرنے آئے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ : نہیں تو کیا ریلیف فنڈ میں عطیہ دینے آیا تھا۔

اجنبی : اجی صاحب کل رات یہ صاحب یہاں سہارے کی تلاش میں آئے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ : کائے سہارا آڑی تے پڑ جھنڈ جا ورت ملاچ بنڈل مارتیش کا ے ایرپ۔ بنڈل ہم اروادین میں بہوت مارتا ہے۔

اجنبی : جی ہاں وہ تو میں جانتا ہوں مگر اب کیا کریں گے ارے اسے نکالنا چاہیے۔ مگر کیسے۔ یہ آپ کیا کرر ہے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ : میں غور کرر ہا ہوں۔

اجنبی : اجی صاحب اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ آپ حکم کیجئے۔ دس پندرہ آدمی مل کر اس جھاڑ کو اٹھالیں گے۔

سپرنٹنڈنٹ : کیا کھانے کا کام ہے کیا۔

اجنبی : کیوں۔

سپرنٹنڈنٹ: ارے بابا سمجھو ایسا Every work has to be done systematically

اجنبی : مگر آپ کا System کب شروع ہوگا۔

سپرنٹنڈنٹ: It has aleready started

اجنبی : معاف کیجئے صاحب آپ کی یہ گول مول باتیں مجھ غریب کے دماغ میں سمانے سے انکار کررہی ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ: بھئی کائے

اجنبی : جی میں کچھ سمجھ نہیں پارہا۔

سپرنٹنڈنٹ: بدھا

اجنبی : دیکھئے۔

سپرنٹنڈنٹ: ہاں System ایسا ہے پہلے فائل چلے گا پیچھے جھاڑ اٹھے گا۔

اجنبی : کیا مطلب!

سپرنٹنڈنٹ : ارے بابا کائے ڈوکا ہے تجھا دیکھو پہلا یہ فائل ہمارے پاس آئے گا پیچھو under Sec کے پاس جائے گا پیچھو سکریٹری کے پاس جائیگا چیف سکریٹری کے پاس جائے گا پھر منسٹر کے پاس جائے گا پیچھو چیف منسٹر کے پاس جائے گا۔

اجنبی : پھر!

سپرنٹنڈنٹ : پھر یہ فائل ریورس آئیگا۔ پھر ہم اس کو ڈیپارٹمنٹ Concern میں بھیجے گا۔ then they will call Emergency meeting

اجنبی : واہ صاحب واہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی پیاس سے مرتا ہوا آدمی آپ کے پاس آئے اور آپ سے کہے کہ بھائی مجھے ایک گلاس پانی کا پلوادو۔ تو آپ شاید اس سے یہی کہیں گے کہ یہاں ٹھہر وابھی برسات ہونے میں دو مہینے باقی ہیں۔

آدمی : ارے بھائی مجھ پر ترس کھاؤ مجھے اس پیڑ کے نیچے سے نکالو۔

اجنبی : پیارے! کچھ ایسی بھی گھڑیاں تیری تقدیر میں گزریں کہ انسان تو انسان خدا بھی کام

نہ آیا۔

سپرنٹنڈنٹ: اچھا ہم ایک کام کریں گے۔ I will take a short cut, I will take this file personally to the Horticultural Dept. because that is the Department concerned they will come and lift the tree۔ تو ہی اچھی بس آئی بگا کہ کوئی بھی آدمی یہ جھاڑ کو ہاتھ لگانے نہیں سکتا because you are no head clerk and this is your reponsibility this is your!

ہیڈ کلرک: Responibility

آدمی : یہ کیا شروع ہو گیا۔

اجنبی : پیچ ورشی یوجنا یہاں کے لوگوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔

آدمی : کیوں کیا ہوا۔

اجنبی : کچھ نہیں یار چپ چاپ پڑے رہو۔

آدمی : آپ خود ہی کیوں نہیں اس پیڑ کو دھکا دے کر باہر نکال دیتے۔

اجنبی : اگر میں نے اس پیڑ کو نیچے سے نکال دیا تو یہ لوگ مجھے پھر اس پیڑ کے نیچے ڈال دیں گے۔

آدمی : کیوں؟

اجنبی : ابھی آپ نے سنا نہیں Every work has to be done Systematically تو کمبخت اس مزے سے کہہ رہا تھا جیسے انارکلی اس کی بہن ہو۔

آدمی : یہ آدمی گیا کہاں؟

اجنبی : ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ میں۔

(سامنے کے حصے کی روشنی آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے اور آفس کے حصے پر روشنی آتی ہے۔ جہاں سپرنٹنڈنٹ سکریٹری ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ سے ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔)

سپرنٹنڈنٹ: ہیلو۔

سکریٹری بارئی کلچرل: بارئی کلچرل ڈپارٹمنٹ

سپرنٹنڈنٹ: نمستے صاحب۔

سکریٹری : نمستے

سپرنٹنڈنٹ: می گائے تونڈے بولتوں

سکریٹری : کون؟

سپرنٹنڈنٹ: گائے تونڈے۔

سکریٹری : کیا

سپرنٹنڈنٹ: ارے اپنا گائے تونڈے

سکریٹری : کیا؟

سپرنٹنڈنٹ: Cow, Cow

سکریٹری : Cow?

سپرنٹنڈنٹ: ماوتھ! ماوتھ (Mouth) Cow mouth؟

سکریٹری : اچھا اچھا گائے تونڈے

سپرنٹنڈنٹ: ہاں گائے تونڈے

سکریٹری : What news ہاں گائے تونڈے

سپرنٹنڈنٹ: Very bad news Sir

سکریٹری : کیوں کیا ہوا

سپرنٹنڈنٹ: اپنے کمپاؤنڈ میں ایک جھاڑ گر گیا ہے۔

سکریٹری : کون سا جھاڑ

سپرنٹنڈنٹ: جامن کا۔

سکریٹری : ارے جانے دو تم کو کیا کرنے کا ہے؟

سپرنٹنڈنٹ: کرنے کا کچھ بھی نہیں ہے. But the tree has fallen on a man.

سکریٹری : Has he died?

سپرنٹنڈنٹ: that is the only difficulty that he has not died yet.

سکریٹری :ابھی تم کیا کریں گا؟

سپرنٹنڈنٹ: ہم کیا کریں گا آپ کرو۔

سکریٹری :ہم کیا کریں گے۔

سپرنٹنڈنٹ: کریں گا منجھے جھاڑ کاٹ کے آدمی کو نکالو۔

سکریٹری :مسٹر گائے تونڈے یہ .H.C. Dept ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: ہم کو معلوم ہے۔

سکریٹری :اس ڈپارٹمنٹ کا کام جھاڑ لگانا ہے جھاڑ کاٹنا نہیں ۔آج ہمارڈ پارٹمنٹ دیش کے کونے کونے میں جنتا سے اس بات کی اپیل کر رہا ہے کہ جھاڑ لگاؤ اور تم جھاڑ کاٹنے کے لیے کہتے ہو! وہ بھی جامن کا جو ایک پھل دار درخت ہوتا ہے۔ ہمارا ڈپارٹمنٹ اس بات کی بالکل اجازت نہیں دیتا تم ایک آفیسر ہو کر ایسی بات کرتے ہو تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ میں تمہاری رپورٹ Higher Authorities کو کر دونگا۔

مسٹر گائے تونڈے۔۔مسٹر گائے تونڈے۔۔۔۔

سپرنٹنڈنٹ: ہاں صاحب، ہاں۔

سکریٹری :تم ایک کام کرو۔تم یہ فائل اگریکلچر ڈپارٹمنٹ میں بھیج دو۔وہ شاید تمہاری مدد کریں۔

سپرنٹنڈنٹ: دیکھئے صاحب میں Contact کرتا ہوں آپ فون مت بند کیجئے۔

(سپرنٹنڈنٹ دوسرا ٹیلی فون ایگریکلچر ڈپارٹمنٹ میں لگاتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ: ہیلو۔

سکریٹری :اگریکلچر ڈپارٹمنٹ

سپرنٹنڈنٹ: نمستے صاحب

سکریٹری :اگریکلچر ڈپارٹمنٹ اور .H.C ڈپارٹمنٹ۔نمستے۔

سپرنٹنڈنٹ: آپ کو نمستے صاحب۔ میں گائے تونڈے بول رہا ہوں۔

سکریٹری :اچھا گائے تونڈے What news

سپرنٹنڈنٹ:Very bad news Sir

سکریٹری : کیوں کیا ہوا!

سپرنٹنڈنٹ: اپنے کمپاؤنڈ میں ایک جھاڑ گر گیا ہے۔

سکریٹری : کون سا جھاڑ

سپرنٹنڈنٹ: جامن کا

سکریٹری : ارے جانے دو نا تم کو کیا کرنے کا ہے؟

سپرنٹنڈنٹ: کرنے کا کچھ بھی نہیں ہے۔ But tree has fallen on a man

سکریٹری :Has he died?

سپرنٹنڈنٹ:.That is the only diffculty that he has not died yet

(پیچھے کی روشنی بجھ جاتی ہے اور اگلا حصہ دوبارہ منور ہو جاتا ہے)

آدمی : سنئے

اجنبی : فرمایئے

آدمی : میری حالت بگڑتی جارہی ہے۔

اجنبی : تمہاری حالت پر تو میں بھی کویتا لکھ سکتا ہوں۔

آدمی : وہ کیسے؟

اجنبی : کیسے! سنو اس طرف آسمان کو چھوتی ہوئی لائف انشورنس کی بلڈنگ کھڑی ہے اور یہاں تمہاری لائف بغیر انشورنس کے پڑی ہے۔ سامنے نریمن پوائنٹ ہے اور یہاں ایک زندگی خود سے disappoint ہے۔ پیارے اگر میری کسی روز بھگوان سے ملاقات ہو جائے تو میں اس سے پوچھونگا کہ کیوں بھائی! تو تو کہتا تھا کہ تو نے انسانوں کو مارنے کے لئے صرف ایک یمدو (ملک الموت) پیدا کیا ہے۔ یہاں تو ڈپارٹمنٹ کا ڈپارٹمنٹ کھلا ہوا ہے۔ میں نے کہا ہیڈ کلرک صاحب اب ذرا اس کلرک کو الگ رکھ کر ذرا ہیڈ سے کام لیجئے۔ اس دیئے کا تیل ختم ہو رہا ہے صرف چند قطرے باقی ہیں اس میں۔

ہیڈکلرک : بس ابھی خبر آتی ہوگی۔خبر آتے ہی ان کو نکال دیا جائے گا۔

آدمی : ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک!

ہیڈکلرک : کیا سچویشن پر شعر پڑھا ہے۔کیوں بھائی! کوی ہو کیا؟

آدمی : جی ہاں

ہیڈکلرک : ارے یہ آدمی کوی ہے۔ارے آدمی کوی ہے۔ارے باپ رے باپ پھر تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔

آدمی : اسے کیا ہوا۔

اجنبی : پتہ نہیں ابھی تو اچھا تھا اور ایک دم..........

(اگلے حصے کی لائٹ فوراً بجھ جاتی ہے اگلا حصہ منور ہو جاتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ: دیوانہ ہو گیا

دونوں سکریٹری:What

سپرنٹنڈنٹ: سچ مچ میں ایک دم دیوانہ ہو گیا ہوں۔آپ بولتے ہیں، یہ جھاڑ نہیں کاٹیں گے۔

سکریٹری H.C.: نہیں

سپرنٹنڈنٹ: آپ کہتے ہیں آپ بھی نہیں کاٹیں گے۔

سکریٹری A.D.: نہیں

سپرنٹنڈنٹ: تو پھر کون کاٹے گا۔

(دونوں سکریٹری مسلسل پہلے سین کے ڈائیلاگ دہرانا شروع کر دیتے ہیں اتنے میں ہیڈکلرک آکر کچھ سپرنٹنڈنٹ سے کہتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ: ہیلو، ہیلو، ہیلو، ابھی ابھی مجھ کو خبر ملی ہے کہ وہ آدمی کوی ہے۔

سکریٹری : کوی ہے(कवी) تو بھائی کویتا کا سمبندھ ایگریکلچر ڈپارٹمنٹ سے نہیں کلچرل ڈپارٹمنٹ سے ہوتا ہے۔Please contact Cultural Dept.

سپرنٹنڈنٹ: Ok(چاروں ٹیلفون بند ہو جاتے ہیں) کلچرل ڈپارٹمنٹ (ہیڈ کلرک کلچرل

ڈپارٹمنٹ کوفون لگاتا ہے۔

ہیڈ کلرک : ہیلو کلچرل ڈپارٹمنٹ۔

سپرنٹنڈنٹ: میں گائےتونڈے بول رہا ہوں صاحب۔ اپنے کمپاؤنڈ میں ایک جامن کا درخت

گر گیا ہے۔ اس کے نیچے ایک آدمی دب گیا ہے۔ No, No, he has not

died yet. اس کو نکلوائیے۔

(آفس کے حصے کی روشنی بجھ جاتی ہے اور اگلا حصہ منور ہو جاتا ہے)

آدمی : سنئے

اجنبی : فرمائیے۔

آدمی : اگر میں مر گیا تو کیا ہوگا۔

اجنبی : تو یہ پیڑ یہاں سے اٹھوالیا جائے گا۔

آدمی : تو پھر آپ جائیے۔ آپ کا کافی وقت برباد ہو رہا ہے۔

اجنبی : میرا تو صرف یہاں وقت برباد ہو رہا ہے۔ آپ کی تو زندگی برباد ہو رہی ہے۔ اور یہ

زندگی برباد کرنا۔۔۔۔

(سکریٹری کلچرل ڈپارٹمنٹ داخل ہوتا ہے)

(ساتھ میں کلرک اور ہیڈ کلرک ہیں)

سکریٹری کلچرل ڈپارٹمنٹ: ہمارا کام۔ ارے بھائی اگر کوی کی سیوا ہم نہیں کریں گے تو کون کریگا۔

کیوں مہاشے آپ کوی ہیں؟

آدمی : جی ہاں۔

سکریٹری : آپ کس نام سے کویتا لکھتے ہیں

آدمی : اوس۔

سکریٹری : اوس۔ وہی اوس جس نے وہ کویتا لکھی تھی کہ انسان سے حیوان ہے بہتر۔

آدمی : جی ہاں۔

S.D. : اتنا مہان کوی اور گمنامی کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔

اجنبی : جی نہیں۔ جامن کے پیڑ تلے دبا ہوا ہے۔۔۔

S.D. : جی ہاں۔ وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ارے بھائی۔ او صاحب۔ آپ کی اس کو یتا پر تو آپ کو نیشنل ایوارڈ ملنے والا تھا۔ ہم آپ کو کہاں کہاں تلاش کر رہے تھے۔ اور آپ ہیں کہ یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اچھا ہوا کہ جو آپ سے ملاقات ہوگئی۔ کیا سیوا کی جائے آپ کی۔

آدمی : بس مجھے اس پیڑ کے نیچے سے نکلوائیے۔

S.D. : بس ابھی لیجئے۔ ارے مطلب کی بات تو میں پوچھنا ہی بھول گیا۔ آپ ہماری اکیڈمی کے ممبر تو ہیں نا۔

آدمی : جی نہیں۔

S.D. : بھئی تب تو بڑی مشکل ہے۔ ہم اس کوی کو پیڑ کے نیچے سے نکلوا سکتے ہیں جو ہماری اکیڈمی کا ممبر ہو۔

اجنبی : تو حضور۔ ایک کام کیجئے۔ اس آدمی کو ہی کٹوا دیجئے۔ آدھا ادھر سے نکال دیتے ہیں۔ آدھا ادھر سے

S.D. : یہ کلچرل ڈپارٹمنٹ کا نہیں۔ میڈیکل ڈپارٹمنٹ کا کام ہے سمجھے۔ خیر میں آپ کو بس ممبر بنائے دیتا ہوں وہاں سے ایک فارم لاؤ۔۔۔ آپ ایک کام کیجئے۔ آپ اس فارم کو بھر کے بھجوالیہ کی Main building میں تھرڈ فلور جائیے۔ وہاں ایک کلرک بیٹھا ہوگا۔ کلرک کو 25 Rupees دے کر۔ ممبر بنتے ہی میرے پاس آئیے۔ میں آپ کو نکلوا دیتا ہوں۔۔۔ Oh, I am sorry آپ اوپر کیسے جا سکتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آپ یہاں دستخط کر دیجئے۔

آدمی : جی میں لکھ نہیں پا رہا ہوں۔

S.D. لکھ نہیں پا رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ انگوٹھا لگا دیجئے۔ مبارک ہو۔ منہ میٹھا کرائیے۔

اجنبی : کس خوشی میں۔

S.D. : ارے بھئی۔ یہ ہماری اکیڈمی کے ممبر جو بن گئے۔

اجنبی :واہ صاحب واہ۔

اے آسمان ترے خدا کا نہیں ہے خوف

ڈرتے ہیں اے زمین ترے آدمی سے ہم

S.D. :کیوں مہاشے۔کوی تو آپ بھی معلوم ہوتے ہیں۔

اجنبی :کیون مجھے بھی کسی پیڑ کے نیچے ہونا چاہیے تھا۔

S.D. :مذاق اچھا کر لیتے ہیں آپ۔

اجنبی :نہیں صاحب۔مذاق تو آپ کر رہے ہیں۔

S.D. :ہم مذاق کر رہے ہیں۔ہم تو اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں۔

اجنبی :دونوں ایک ہی بات ہے۔اب آپ ایک کام کیجئے۔اس آدمی کو یہاں سے نکلوایئے۔

S.D. :yes, yes اے come here دیکھو۔تم فارم لے کر اوپر جاؤ Cashier سے کہنا کہ میں نے -/Rs. 25 وصول کر لیے اور تم اس پیڑ کو کٹوانے کا انتظام کرو۔

چلو :Come on

(سپرنٹنڈنٹ گائے تونڈے داخل ہوتا ہے)

S.P. :ٹھہرو۔ہم یہ جھاڑ کاٹ نہیں سکتے۔

اجنبی :کیا؟

S.P. :ارے بھئی۔یہ جھاڑ کاٹ نہیں سکتے ہیں۔

اجنبی :لیکن کیوں؟

S.P. :Because this is an International tree

اجنبی :میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

S.P. :مطلب یہ ہے کہ آج سے دس سال پہلے سوویٹ رشیا کے پرائم منسٹر نے یہ جھاڑ اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔اب اگر ہم یہ جھاڑ کاٹیں گے تو ہماری friend ship رشیا کے ساتھ ٹوٹ جائے گی۔

اجنبی :لیکن صاحب۔یہ تو ایک آدمی کی زندگی کا سوال ہے۔

S.D. : یہ دو دیشوں کی دوستی کا سوال ہے۔

اجنبی : ٹھیک ہے۔ ایک آدمی کی زندگی کے لیے دو دیشوں کی دوستی توڑی نہیں جا سکتی۔

S.P. : Correct

اجنبی : اور اگر یہ مر گیا تو۔

S.P. : امر ہو جائے گا۔

اجنبی : لیکن امر ہونے کے بعد بھی تو مر جائے گا۔

S.D. : لیکن مرنے کے بعد دنیا میں اپنا نام کرے گا۔ دنیا کے کونے کونے میں اس کا نام لیا جائے گا کہ یہ ہے وہ آدمی جس نے اپنے دیش کا نام اونچا رکھنے کے لیے اپنی جان۔۔

اجنبی : جامن کے پیڑ کے نیچے دے دی۔۔۔۔ ٹھیک ہے تب تو اسے مرنا ہی ہوگا۔ اس کا زندہ رہنا بیکار ہے۔ مر جا پیارے۔ تو مر جا۔ یہ مردہ پرستوں کی بستی ہے جہاں زندوں کو مار دیا جاتا ہے اور پھر ان کے پتلے بنا کر ان پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ مر جا پیارے۔ مر جا۔

S.P. : مگر تم کیوں اپنا دل چھوٹا کرتے ہو؟

اجنبی : ارے صاحب۔ جب دل ہی نہ رہا تو پھر چھوٹا کیا بڑا کیا۔

S.P. : ہمارے فارن ڈپارٹمنٹ نے Soviet Embassy سے Contact کیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں خبر آتی ہوگی۔۔۔۔

اجنبی : یعنی اس تک پہنچنے کے لیے زندگی اور موت میں دوڑ ہو رہی ہے۔ دیکھیں کس کی جیت ہوتی ہے۔ زندگی یا موت کی۔۔۔۔

(Peon بھاگتا ہوا آتا ہے اور S.P. کو ایک کاغذ دیتا ہے)

(سکریٹری اور S.P. دونوں پڑھتے ہیں)

SD اور SP: اوہ مبارک Congratulation

S.D. : We can cut this tree......

S.P. : ہم یہ جھاڑ کاٹ سکتے ہیں۔ انہیں بھی یہ خوشخبری سناؤ۔

اجنبی : شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔۔۔۔

اوس صاحب۔ اے اوس صاحب۔ خبر آ گئی ہے۔ اوس

(اوس مر چکا ہے۔ اجنبی آہستہ آہستہ اٹھتا ہے اور باہر کی طرف جانے لگتا ہے)

S.P. : کیا ہوا؟

S.D. : کیا ہوا؟

Peon : کیا ہوا؟

اجنبی : آپ خوشخبری لے تو آئے۔ پر بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔

(پردہ گرتا ہے)

مجھے ڈرائیونگ سکھادو

• ساجدہ زیدی

کردار

میاں بیوی

(جوان قبول صورت، اسمارٹ

تعلیم یافتہ اور ہندوستانی ہیں)

مقام: **لندن کی ایک،** کسی حد تک سیاہ، چھے منزلہ عمارت کے متعدد چھوٹے بڑے کمروں میں سے ایک معمولی سائز کا کمرہ (جس سے ملحق ایک مختصر سا کچن ہے، جس کا دروازہ کمرہ میں کھلتا ہے) جسے عرف عام میں ڈک کہتے ہیں۔ فرنیچر بس عام قسم کا ولایتی فرنیچر ہے ۔ چند کرسیاں، ایک صوفہ بیڈ، ایک طرف تپائی پر لیمپ اور ٹیپ ریکارڈ وغیرہ رکھے ہیں ۔ایک سمت شیلف ہے ۔جس میں زیادہ تر پیپر بیک اور کچھ دوسری کتابیں ہیں ۔ سامنے دیوار پر پکاسو کی ایک پینٹنگ ہے۔ایک کرسی کے پاس قریب چھوٹے سائز کی کسی نئے اور گمنام آرٹسٹ کی اورجنل پینٹنگ ہے ۔ ایک کرسی کے پاس ایک لیمپ رکھا ہے۔ مشترک گیلری کے دروازے کے سامنے اور دو ایک فائل بے ترتیبی سے پڑے ہیں ۔ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفہ بیڈ کی سمت جو پردہ پڑا ہے، رات کو وہی کھینچ لیا جاتا ہے اور یہ ڈرائنگ روم، بیڈروم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

وقت: شام ۸ بجے ——— دن اتوار

بیوی: (کتاب میز پر الٹی رکھ کر)......... چلو مجھے ڈرائیونگ سکھا دو۔

میاں: (اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر) نہیں

ب: کیوں نہیں؟

م: اس لئے کہ کل تم نے پھر وہی غلطی کی تھی۔

ب: اوّل تو میں نے کوئی غلطی کی ہی نہیں تھی.........مگر بتاؤ کون سی غلطی؟

م: (اخبار کرسی پر پھینک کر میدان میں اتر آتا ہے) وہی جس پر میں زور سے چیخا تھا۔

ب: تم تو ہر بات پر زور سے چیختے ہو۔

م: میں چیختا ہوں یا تم چیختی ہو۔

ب: تم۔

م: تم۔

ب: تم اور صرف تم

م: تم۔تم۔تم

ب: تم آخر تم کٹ حجت کیوں ہو؟

م: تمہارے ساتھ رہ کر بھینس بھی کٹ حجت بن سکتی ہے۔

ب: آج زندگی میں پہلی بار تم نے سچ بولا ہے۔

م: کہ تم ہر شخص کو کٹ حجت بنا سکتی ہو۔

ب: کہ تم اور بھینس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

م: تم کٹ حجتی Inspire کرتی ہو۔

ب: تم جیسی بھینسوں تک میں؟

م: تم خود بھینس ہو۔

ب: ابھی تم نے خود کہا تھا کہ ''میں بھینس ہوں''۔

م: میں نے یہ نہیں کہا تھا۔

ب: یہی کہا تھا۔

م: نہیں کہا تھا۔

ب: یہی کہا تھا۔

م: نہیں کہا تھا۔

ب: اس کا مطلب یہی تھا۔

م: اچھا خاموش رہو اور اپنی کتاب پڑھو۔

ب: جب تم سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو تم موضوع بدل دیتے ہو۔

م: محض رفع شر کی خاطر۔

ب: محض، اس لئے کہ تمہارا دماغ ایک حد سے آگے کام ہی نہیں کرتا۔

م: تمہارے ساتھ رہ کر دماغ کو کام میں لانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ب: اگر ضرورت ہوتی تب بھی نہیں کر سکتا تھا .... تم بہت محدود دل و دماغ کے مالک ہو۔

م: تم خود بہت محدود دل و دماغ کی مالک ہو۔

ب: یہ بحث کا نہایت فرسودہ طریقہ ہے۔

م: کیا؟

ب: یہی کہ آدمی اپنے مخالف کا Argument اسی کے لئے استعمال کرے۔

م: تم اپنی فضول بکواس کو Argument کہتی ہو۔

ب: ہر وہ بات جس کی بنیاد منطق پر ہو Argument ہوتی ہے۔

م: Argument کی ایک کوالٹی ہوتی ہے۔

ب: منطق کا تعلق کوالٹی سے نہیں ہے۔

م: بالکل ہے۔

ب: ثابت کرو کہ ہے۔

م: تم ثابت کرو کہ نہیں ہے۔

ب: تم ثابت کرو۔ کیونکہ تم نے یہ قصہ شروع کیا ہے....

م: کوالٹی کی بات پہلے کس نے کہی تھی.....؟ میں نے یا تم نے؟

ب: Argument کی بات پہلے کس نے کہی تھی؟ میں نے یا تم نے؟

ب: بحث کوالٹی پر ہو رہی ہے Argument پر نہیں۔

م: Argument کی کوالٹی پر ہو رہی ہے۔

ب: اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

م: بالکل پڑتا ہے۔

ب: تو بتاؤ کیا فرق پڑتا ہے......

م: ہر بات میں کیوں بتاؤں......تم خود بتاؤ۔

ب: اچھا اب یہ قصہ ختم کرو......تمہارے ساتھ کوئی بات آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔

ب: آگے بڑھ نہیں سکتی یا تم بڑھا ہی نہیں سکتے؟

م: بڑھ نہیں سکتی۔

ب: تم بڑھا نہیں سکتے۔

م: بڑھ نہیں سکتی۔

ب: میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ تم بہت محدود دل و دماغ کے مالک ہو۔

م: یہی بات میں نے بھی تم سے کہی تھی۔

ب: تم کوئی اورجنل بات کیوں نہیں کرتے۔

م: تم میں کوئی اورجنل خصوصیت ہی نہیں جو میں تمہارے لئے کوئی اورجنل بات کروں۔

ب: اس کا تعلق میری Originality سے نہیں، تمہاری Originality سے ہے۔

م: تمہاری سے ہے۔

ب: تمہاری سے ہے۔

م: تمہاری سے ہے۔

ب: یہ سب ڈرائیونگ نہ سکھانے کے بہانے میں..........

م: میں کہہ چکا ہوں میں تمہیں ڈرائیونگ نہیں سکھا سکتا۔

ب: کیوں نہیں سکھا سکتے؟

م: اسلئے کہ تم بہت غلطیاں کرتی ہو۔

ب: کسی ایک غلطی کی مثال دے کر بتاؤ۔

م: ایک بار تم نے......ایک بار تم نے..........تم آخر ہر چیز کی مثال کیوں چاہتی ہو۔
بس میں نے کہہ دیا کہ تم نے بہت غلطیاں کی تھیں۔

ب: کوئی CONCRETE مثال دو۔

م: تمہاری ہر غلطی CONCRETE ہوتی ہے کوئی ایک ہو تو بتاؤں!

ب: میں CONCRETE مثال کی بات کر رہی ہوں ...CONCRETE غلطی کی نہیں۔

م: دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

ب: بنیادی فرق ہے — لیکن یہ تمہاری سمجھ سے بالاتر باتیں ہیں۔

م: تم ہمیشہ میری سمجھ پر حملہ کیوں کرتی ہو۔

ب: جس چیز کا وجود ہی نہیں، میں اس پر حملہ کیسے کر سکتی ہوں۔

م: یہی تو حیرت ہے کہ پھر بھی کرتی ہو۔

ب: (خوشی سے اچھل کر) دوسرا سچ۔ تم نے مان لیا نا کہ سمجھ نام کی کوئی چیز تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔

م: میں نے یہ نہیں کہا۔

ب: تم نے کہا۔

م: کب؟

ب: ابھی جب تم نے حملے کا ذکر کیا۔

م: تم صرف کٹ حجت ہی نہیں کم فہم بھی ہو۔ ذکر حملے کا تھا نہ کہ میری سمجھ کا۔

ب: میرے اس حملے کا، جو تمہاری اس سمجھ پر ہے۔ جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

م: (دانت پیس کر) میں تمہارے دوسرے حملوں کا ذکر کر رہا تھا۔

ب: پہلے حملے کے ذکر میں تم دوسرے حملوں کا ذکر کیسے لا سکتے ہو؟

م: بالکل لا سکتا ہوں......کیونکہ میرا دماغ تمہاری طرح بند نہیں ہے۔ میں بات سے بات

نکالتا ہوں........

ب: تم نے آج تک بات سے بات نہیں نکالی۔

م: ہمیشہ نکالی ہے۔

ب: کبھی نہیں نکالی۔

م: اگر نکالی تو اس لئے کہ تم نکلنے ہی نہیں دیتی ہو۔

ب: ابھی تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے ہمیشہ نکالی ہے۔

م: افوہ........تم سے بات کرنا بالکل فضول ہے۔ فضول ہے۔فضول ہے......تم اپنا کام کرو میں اپنا کام کرتا ہوں۔

ب: اپنا کیا کام کرتے ہو؟ دفتر سے آ کر تم صرف VEGETATE کرتے ہو۔

م: VEGETATE میں کرتا ہوں یا تم کرتی ہو۔

ب: میں کبھی VEGETATE نہیں کرتی۔

م: تمہارے پاس VEGETATE کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام ہے ہی نہیں

ب: اور تمہارے پاس بھی VEGETATE کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔

م: اچھا—— آؤ صلح کرلو۔چلو دونوں VEGETATE کریں۔

ب: میں VEGETATE نہیں کرسکتی—— میں ڈرائیونگ سیکھنا چاہتی ہوں۔

م: میں نہیں سکھانا چاہتا کیونکہ کل تم نے پھر وہی غلطی کی تھی!

ب: آخر منہ سے پھوٹتے کیوں نہیں کیا غلطی؟

م: (خوشی سے اچھل کر) یاد آ گیا ......تم رائٹ کو مڑنے والی تھیں اور تم نے INDICATOR لیفٹ کا دیا تھا۔

ب: نہیں رائٹ کا دیا تھا۔

م: مجھے خوب یاد ہے کہ لیفٹ کا دیا تھا۔

ب: رائٹ کا دیا تھا۔

م: لیفٹ کا دیا تھا۔

ب: رائٹ کا۔

م: لیفٹ کا۔

ب: تو پھر ضرور میں لیفٹ کو مڑ رہی ہوں گی۔

م: تم قطعی رائٹ کو مڑ رہی تھیں۔

ب: میں لیفٹ کو مڑ رہی تھی۔

م: تم رائٹ کو مڑ رہی تھیں۔

ب: لیفٹ کو۔

م: رائٹ کو۔

ب: جب میں لیفٹ کو مڑ رہی تھی اور میں نے رائٹ کا Indicator دیا تھا تو وہ اس لئے دیا تھا کہ........

م: ....غلط کہہ رہی ہو......تم رائٹ کو مڑ رہی تھیں اور تم نے لیفٹ کا Indicator دیا تھا۔

ب: وہ ایک ہی بات ہے۔

م: ایک ہی بات نہیں ہے۔ رائٹ کو Indicator دے کر لیفٹ کو مڑنا اور لیفٹ کو Indicator دے کر رائٹ کو مڑنا دو مختلف باتیں ہیں۔

ب: بالکل ایک ہی بات ہے۔

م: ان میں بنیادی فرق ہے۔

ب: اصولی لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

م: مگر واقعی لحاظ سے بنیادی فرق ہے۔

ب: آخر تم اصول کی بات کیوں نہیں کر سکتے۔

م: ہم ایک مخصوص واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں۔

ب: جب آدمی کے Fundamentals ہی Clear نہ ہوں تو وہ کسی واقعے کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتا۔

م: میں واقعہ کا تجزیہ نہیں۔ اظہار واقعہ کر رہا ہوں۔

ب: اظہارِ واقعہ، تجزیے کے بغیر ممکن ہی نہیں یہ Depth Psychology کا بنیادی اصول ہے۔

م: Depth Psychology کی بات بالکل نہیں ہو رہی ہے۔

ب: پھر کاہے کی ہو رہی ہے؟

م: Phenomenology کی بات کر رہے ہو۔

ب: Phenomenology کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ کسی واقعے کو من وعن بیان کر دیں۔

م: Phenomenology کا وہ مطلب بھی نہیں جو تم سمجھتی ہو۔

ب: میں نے ابھی بتایا ہی نہیں کہ میں کیا سمجھتی ہوں۔

م: جو بھی تم سمجھتی ہو غلط ہی سمجھتی ہو۔

ب: تم اس قدر Confused ہو کہ تمہیں فلسفے اور منطق وغیرہ میں Debate کرنا ہی نہیں چاہئے تم صرف اخبار پڑھو۔

م: عورتیں خود ہمیشہ Muddle Headed ہوئی ہیں CLEAR Thinking کرنا اُن کے بس کا روگ ہے ہی نہیں۔

ب: تم کس قدر فیوڈل ہو۔ ہمیشہ عورتوں اور مردوں میں تفریق کرتے ہو۔ جب کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آئی کیو میں جنسی لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔

م: کب ثابت ہو چکی ہے؟ کس نے ثابت کی ہے؟

ب: امریکہ اور برطانیہ کی تمام ——— Experimental سائیکولوجی کی کتابیں اس موضوع سے بھری پڑی ہیں۔ تم کبھی پڑھو تو پتا چلے۔

م: امریکہ اور برطانیہ کی تمام Experimental کتابوں میں سوائے نقطوں اور گرافوں کے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ انسان کا کوئی وجود نہیں ان میں۔

ب: انسان کا وجود تمہارے ننھے منے ذہن میں سما ہی نہیں سکتا——— لہٰذا اس کی بات نہ

کرو۔

م: تم مشرق کے فلسفے سے قطعی ناواقف ہو۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں ان کی بات پر کبھی کان نہ دھرو۔

ب: تم پھر اپنی فیوڈل ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہو۔

ب: ابھی کل تو تم کہہ رہی تھیں کہ میں سیوڈو موڈرن Pscudo Modern ہوں۔

ب: کب کہا تھا میں نے؟ یہ بہتان ہے۔

م: تم ہر بات کہہ کر بھول جاتی ہو۔ اپنے حافظے کا علاج کراؤ۔

ب: جس کا پالا تم سے پڑے اس کے لئے ہر بات بھول جانا ہی بہتر ہے۔ میں کبھی اپنے حافظے کا علاج نہیں کراؤں گی۔

م: تم اپنی کند ذہنی کو PERPETUATE کرنا چاہتی ہو...... مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے حافظے کا علاج نہیں کراؤ گی۔

ب: تمہیں میرے دل کی کوئی بات معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ میری بڑی COMPLEX شخصیت ہے۔

اور تم سادگی ذہن کے مرض میں مبتلا ہو۔

م: مجھے معلوم ہے۔ تمہاری ہر بات معلوم ہے۔

ب: بتاؤ کیا معلوم ہے؟

م: یہی کہ تم اپنے حافظے کا علاج نہیں کراؤ گی۔

ب: تو میں ضرور کراؤ گی۔

م: ہاں ضرور کراؤ —— تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ کل تم مجھے سیوڈو موڈرن کہہ رہی تھیں اور آج فیوڈل کہہ رہی ہو۔ تم خود اپنے آپ کو Contradict کرتی ہو۔

ب: تمہاری جہالت پر مجھے رونا آتا ہے۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ سیوڈو موڈرانزم اور فیوڈلزم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

م: جیسا مجھ میں اور تم میں ۔ جبکہ ہماری راہیں جدا جدا ہیں ۔

ب: اچھا بتاؤ میں نے تمہیں کس بات پر سیوڈو موڈرن کہا تھا ؟ جو کہ تم یقیناً ہو۔

م: جب میں متیس Matesse کی نمائش دیکھ کر آیا تھا ——— اور میں نے متیس کے آرٹ کا وان گاگ کے آرٹ سے موازنہ کیا تھا اور کہا تھا............

ب: تم نے موازنہ قطعی نہیں کیا تھا محض تبصرہ کیا تھا.........اور کہا تھا..........

م: میں نے بھرپور تبصرہ بعد میں کیا تھا۔ پہلے میں نے موازنہ.........

ب: وہ بھرپور تبصرہ ہرگز نہیں تھا ۔ نہایت بھرپور تبصرے کی ایک حقیری کوشش ناکام تھی ۔ تم نے کہا تھا..........

م: تم تبصرہ اور موازنے کا فرق بھی نہیں سمجھ سکتیں ۔

ب: یہ فرق پہلے میں نے تمہیں بتایا تھا.......جب تم اپنے حقیر سے تبصرے کو بھرپور موازنہ کہہ رہے تھے ۔

م: بھرپور کا لفظ میں نے موازنے کے ساتھ نہیں تبصرہ کے ساتھ استعمال کیا تھا.......تم زبان کا قتل کرتی ہو ۔

ب: تم خیالات کا خون کرتے ہو ۔

م: خیالات کا خون تم کرتی ہو، یا میں کرتا ہوں.........؟

ب: تم۔

م: تم! پہلے میں نے ان آرٹ کی بنیادی علامتوں کا موازنہ کیا تھا.........اور تم اسے تبصرہ کہتی ہو ـــ یہ خیالات کا خون نہیں تو اور...........

ب: آرٹ اور ادب کے سلسلے میں، میں تمہیں بالکل مرفوع القلم سمجھتی ہوں ۔

م: تمہارے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے ۔

ب: بہت فرق پڑتا ہے ۔

م: کیا فرق پڑتا ہے ۔

ب: یہی کہ تم اتنی دیر سے گھگھیا رہے ہو کہ میں تمہارے مجہول تبصرے اور موازنے کا فرق

سمجھوں۔ جب کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں خوب جانتی ہوں، کہ تم میں Artistic Sensibilities کا بالکل فقدان ہے۔

م: اگر فقدان ہے، تو پھر میں تھیٹر اور آرٹ Exhibitions اور مشاعروں میں کیوں جاتا ہوں...... اور پھر ان پر اتنا بھرپور تبصرہ..........

ب: تم محض یک گونہ بےخودی کی خاطر جاتے ہو..........

م: اور تم کس لئے جاتی ہو؟

ب: آرٹ اور ادب میری گھٹی میں پڑا ہے۔ میں آسودگی دل ونظر کی خاطر جاتی ہوں۔

م: بالکل غلط.......... تم اس لئے جاتی ہو کہ آرٹسٹ اور شاعر اور ادیب اور پروڈیوسرز Producers تمہاری ساڑی اور صورت کی تعریف کریں......اور تم اسے فلرٹیشن سمجھ سمجھ کر خوش ہوتی رہو۔

ب: میں سمجھ سمجھ کر خوش نہیں ہوتی، وہ درحقیقت مجھ سے فلرٹ کرتے ہیں۔

م: بالکل فلرٹ نہیں کرتے.......صرف یک گونہ بےخودی کی خاطر کہتے ہیں۔

ب: وہ سو فیصدی فلرٹ کرتے ہیں.....مگر تم دیکھنا نہیں چاہتے۔

م: کیوں دیکھنا نہیں چاہتا؟

ب: اس لئے کہ تم جلتے ہو۔

م: جب تم میری ذہانت سے نہیں جلتیں تو میں تمہاری صورت سے کیوں جلوں؟

ب: میں تمہاری ذہانت سے کیوں جلوں جب کہ ذہانت مجھ اور تم میں قطبین کا فاصلہ ہے۔

م: اور میں تمہاری صورت سے کیوں جلوں جب کہ تمہارے بڑے عامیانہ سے فیچرز ہیں۔

ب: اور شادی سے پہلے، جب تم اپنا سستا رومانس چلا رہے تھے، تو تم نے کیوں کہا تھا کہ میں دنیا کی سب سے حسین عورت ہوں۔

م: اور شادی سے پہلے، جب تم مجھ پر ڈورے ڈال رہی تھیں تو تم نے کیوں کہا تھا کہ میری ذہانت پر تمہیں فخر ہے۔

ب: وہ میں نے تمہاری Vanity کو Satisfy کرنے کے لئے کہا تھا۔ میں اتنی

حساس ہوں کہ میں نے پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا کہ تم نہایت Vain آدمی ہو۔

م: اور میں اتنا سمجھدار ہوں کہ میں نے دوسرے ہی دن دیکھ لیا تھا کہ تم بہت عام سی عورت ہو۔ جب میں تمہاری کسی قدر ترچھی اور درمیانی سائز کی آنکھوں کو چشم آہو کہوں گا تو تم سیدھی تیر کی طرح میری آغوش میں آ گرو گی۔

ب: میری آنکھیں قطعی ترچھی نہیں ہیں۔ میں کاجل اسطرح لگاتی ہوں کہ ترچھی لگیں۔

م: یعنی تمہیں اپنی آنکھوں کو مزید خوبصورت بنانے میں لطف آتا ہے۔

ب: تم بالکل آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکے ہو آج کل ترچھی آنکھوں کا فیشن ہے۔

م: آنکھوں کا فیشن؟ چہ معنی دارد.........؟ آنکھ اور ناک کا بھی فیشن ہوتا ہے؟

ب: بالکل ہوتا ہے......اور بالوں کے رنگ اور آنکھوں کی پتلیوں کے رنگ اور ماتھے کی بندی کے رنگ کا بھی ہوتا ہے۔

م: غضب خدا کا!

ب: اوران سب رنگوں میں میچنگ کی جاتی ہے......اور کبھی کبھی Contrast بھی

م: اے خدائے پاک و برتر کہاں ہے تو؟

ب: اور Contrast اس لئے کیا جاتا ہے کہ اگر ساڑی کے بارڈر کے رنگ اور ساڑی کی بوڈی کے رنگ میں Contrast ہو تو ماتھے کی بندی کا رنگ بارڈر رنگ سے اور آنکھوں اور بالوں کا رنگ باڈی کے رنگ سے میچ کر سکے۔

م: یہ سب کیا بکواس کر رہی ہو تم؟

ب: یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ساڑی کا رنگ بندی کے رنگ سے اور بارڈر کا رنگ آنکھوں اور بالوں کے رنگ سے میچ کیا جائے It Depends

م: یہ لفظوں کی جمنا سٹک بند کرو۔ میرا سر چکرا رہا ہے......اور ہاں What depends on what.

ب: ہر چیز ہر چیز پر Depend کر سکتی ہے۔

م: مگر کیا چیز کس چیز پر کرتی ہے؟

ب: یہ ذوقِ سلیم کی باتیں ہیں۔ اس لئے کوئی فارمولا نہیں بنایا جا سکتا۔

م: بس نہیں بنایا جا سکتا؟

ب: بس نہیں بتایا جا سکتا۔ کیونکہ Taste میں Individual Diference کا سوال بہت اہم ہے۔

م: اور یہ سب فیشن کون سیٹ کرتا ہے؟

ب: ماڈل گرلز ——— اور ایکٹریس.........

م: آخر تم کوئی اورجنل بات کیوں نہیں کر سکتیں ——— ہمیشہ نقالی۔

ب: کیونکہ Originality کی ابتدا نقل سے ہوتی ہے۔ اور آج کل دنیا بہت سمٹ چکی ہے۔ پیرس اور لندن اور نیویارک اور دہلی اور ٹوکیو اور ہانگ کانگ اور کراچی سب جگہ کم وبیش ایک طرح کے فیشن چلتے ہیں۔ بیک وقت۔

م: ایک طرح کے فیشن؟؟ بیک وقت؟؟

ب: یعنی کہ بنیادی رجحان ایک ہوتا ہے ۔ فرق صرف تفصیلات میں ہوتا ہے۔

م: مگر کیوں ——— یہ کیا حماقت ہے؟

ب: International Unity یعنی بین الاقوامی اتحاد.........

(خاموشی)

م: (ہار مان کر اخبار اٹھا لیتا ہے)

ب: (بور ہو کر کتاب اٹھا لیتی ہے)

م: (مختصر وقفہ)

ب: (اخبار پر نظریں جمائے ہوئے) میرا سر چکرا رہا ہے——ایک پیالی چائے یا کوفی کچھ بنا دو۔

ب: (کتاب پر نظریں جمائے ہوئے) تم خود کیوں نہیں بنا لیتے!

م: (اخبار پر نظریں جمائے ہوئے) میں بہت تھکا ہوا ہوں۔

(کتاب پر نظریں جمائے ہوئے) میں بھی بہت تھکی ہوئی ہوں۔

م: (اخبار پھینک کر) کل کوفی میں نے بنائی تھی — آج تم بناؤ۔

ب: (کتاب بند کر کے) پرسوں میں نے بنائی تھی۔

م: اور اس سے پہلے میں نے بنائی تھی۔

ب: اور اس سے پہلے، متواتر دو دن تک میں نے بنائی تھی۔

م: دو دن تک متواتر تم نے اس لئے بنائی تھی کہ دوسرے دن تم قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔

ب: میں تمہارے قریب ہرگز نہیں بیٹھی تھی۔

م: میرے قریب نہیں — کچن کے قریب اس لئے تمہیں وہاں تک جانے میں محنت کم کرنی پڑی تھی۔

ب: آج تم قریب بیٹھے ہو، اس لئے آج تم بناؤ۔

م: کچن سے ہم دونوں کا فاصلہ بالکل برابر ہے — چاہو تو ناپ سکتی ہو۔

ب: اچھا تو ناپو........

م: تم نے پہلے کہا ہے۔

ب: تم نے پہلے کہا ہے، اس لئے تم ناپو۔

م: اچھا میں ہی ناپ لیتا ہوں۔لیکن کل تم ناپوگی۔

ب: اگر تم چائے بناؤ گی تو میں ناپوں گی۔اور اگر میں چائے بناؤں گی تو تم ناپوگے۔

م: یہ چار سو بیسی ہے — چائے وہ بنائے گا جس کا فاصلہ کم ہوگا اور کل فاصلہ وہ ناپے گا جو آج نہیں ناپے گا۔

ب: یہ سراسر ناانصافی ہے۔عورت کے حقوق پر جابرانہ حملہ ہے۔

م: میں فاصلہ صرف اس شرط پر ناپ سکتا ہوں کہ کل تم ناپوگی — بولو — تمہیں یہ شرط منظور ہے — ؟ اگر ہے تو میں ناپے دیتا ہوں — نہیں ہے تو ہرگز نہیں ناپوں گا۔

ب: تم مجھے خواہ مخواہ بور کر رہے ہو۔

م: آج کل مردوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے شدید جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے

ب: اچھا منظور ہے تمہاری احمقانہ شرط۔جس کی بنیاد صرف تمہارا احساس کمتری ہے۔

م: (اٹھ کر میز کی دراز میں سے ٹیپ نکالتا ہے اور بہت بزنس لائک انداز میں فاصلہ ناپتا ہے —بیوی نظریں گاڑے دیکھ رہی ہے کہ کہیں بے ایمانی نہ کرے اپنی کرسی کا فاصلہ ناپنے کے بعد ٹیپ پر نشان لگالیتا ہے—پھر بیوی کی کرسی کا اور کچن کے دروازے کا فاصلہ ناپتا ہے۔نشان لگاتا ہے یہ دیکھو تمہارا فاصلہ ایک انچ کم ہے۔

ب: (غور سے دیکھ کر مطمئن ہونے کے بعد) اچھا ابھی بتاتی ہوں (نہیں اٹھتی)۔

م: (کرسی میں دھنس جاتا ہے)۔

ب: تم چائے پیوگے یا کوفی؟

م: تم کیا پیوگی؟

ب: میں چائے پیوں گی۔

م: تو میں کوفی پیوں گا۔

ب: آخر تم ہر بات میری ضد میں کیوں کرتے ہو؟ یہ محض ایک قسم کی انانیت ہے۔

م: پرسوں جب تم نے مجھ سے پوچھا اور پھر میں نے تم سے پوچھا—اور تم نے کہا کوفی اور میں نے کہا اچھا میں بھی کوفی—تو یاد ہے تم نے کیا کہا تھا؟

ب: کیا کہا تھا؟

م: کہ تمہاری اپنی کوئی رائے ہی نہیں ہے اور تم ہر بات میں میرے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہو۔

ب: بالکل ٹھیک کہا تھا۔کسی چیز میں تمہاری ذاتی کوئی رائے نہیں ہے۔

م: تو پھر انانیت والا الزام غلط ہے۔

ب: معلوم ہوتا ہے تم فرائڈ کے نام سے واقف نہیں ہو۔فرائڈین سائیکولوجی کا یہ موٹا سا اصول ہے کہ ایگو جتنی کمزور ہو اتنا ہی خود کو موٹا بنا کر ظاہر کرتی رہو۔

م: فرائڈین سائیکولوجی پڑھ پڑھ کر تم خود ذہنی مریض بن چکی ہو۔

ب: میں ذہنی مریض بن چکی ہوں یا میں ایک نیوروٹیک کو بھگتنے کا فن سیکھ چکی ہوں؟

م: میں نیوروٹیک بالکل نہیں ہوں۔

ب: تم پیدائشی نیوروٹیک ہو۔

م: مجھ میں نیوروسس کی کوئی علامت نہیں ہے—

ب: نیوروسس کی کوئی علامت یہ ہے کہ نیوروٹیک اپنی علامتوں سے بے خبر رہے اور ان کو قطعی نارمل سمجھے۔

م: بالکل غلط—نیوروسس کی سب سے بڑی علامت ہینڈ واشنگ مینیا (Hand Washing Mania) اور اندھیری جگہوں کا فوبیا......اور چوہوں کا ڈر، مردار جانوروں کا خوف اور پانی کا خوف اور شاپ لفٹنگ Shoplifting ہے۔

ب: یہ نیوروسس کی قسمیں ہیں علامتیں نہیں۔

م: علامتیں ہیں۔

ب: قسمیں ہیں۔

م: علامتیں ہیں۔

ب: قسمیں ہیں۔ اچھا انسائیکلو پیڈیا اٹھا کر لاؤ اور چیک کر لو۔

م: انسائیکلو پیڈیا تم اٹھا کر لاؤ۔ کیونکہ فاصلہ میں نے ناپا تھا۔

ب: انسائیکلو پیڈیا اور فاصلے کا کوئی تعلق نہیں۔

م: اگر تعلق نہیں تو پھر تم ہی اٹھا لاؤ۔

ب: (مصلحت کے انداز میں) آج تم اٹھا لاؤ، کل میں اٹھا لاؤں گی۔

م: نہیں آج تم اٹھا کر لاؤ......کل میں لاؤں گا......(کوئی نہیں اٹھتا)۔

ب: یہ عورتوں کا Exploitation ہے......کیونکہ تم لوگ ہمیں کمزور سمجھتے ہو۔

م: یہ تم لوگوں کا احساس کمتری ہے۔

ب: احساس کمتری والا خیال بھی تم نے مجھ سے چرایا ہے۔

م: تم لوگ Emancipate ہو ہی نہیں سکتیں۔

ب: تم لوگ ہمارے Emancipation سے حسد کرتے ہو۔

م: کیونکہ تم لوگ چاہتی ہو کہ Emancipate بھی ہو جاؤ اور عورت کے نخرے بھی برقرار رکھو—یہ بات ناقابل برداشت ہے۔

ب: کلاسیکی نخرے عورت کا پیدائشی حق ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے عورت سے نہیں چھین سکتی..........

م: دنیا کی کوئی طاقت عورت کو راہ راست پر نہیں لا سکتی۔

ب: راہِ راست کیا ہوتی ہے۔

م: سیدھا راستہ۔

ب: میں معنی نہیں پوچھ رہی۔

م: پھر کیا پوچھ رہی ہو؟

ب: میں مطلب پوچھ رہی ہوں، اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

م: معنی اور مطلب میں کیا فرق ہے؟

ب: پہلے تم بتاؤ، اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔

م: پہلے تم بتاؤ، معنی اور مطلب میں کیا فرق ہے؟

ب: نہیں بتاتی—

م: تو میں بھی نہیں بتاتا۔

(خاموشی— بیزاری— وہی اخبار اور کتاب کا عمل)

(وقفہ)

م: (یک لخت) تم ابھی تک کوفی بنانے نہیں گئیں— جب کہ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ آج......

ب: (چونک کر— خلوص سے) ارے میں تو بھول ہی گئی تھی۔ ابھی جاتی ہوں (کتاب رکھ دیتی ہے۔ اٹھ کر کچن کے دروازے کی طرف چلی جاتی ہے۔ دروازہ آدھا کھلا چھوڑ کر اندر چلی جاتی ہے)

(وقفہ)

م: (اخبار پڑھتا ہے— بے چینی سے پہلو بدلتا ہے— اخبار رکھ دیتا ہے— کچھ دیر بیٹھ کر گھٹنے ہلاتا ہے— پھر دیوار کی طرف گھورتا ہے— پھر اٹھ کر کچن کے دروازے

تک جانا شروع کرتا ہے، مگر آدھے راستے سے واپس آتا ہے، بیٹھتا ہے — پھر یہی عمل — پھر دبے قدموں دروازے تک جاتا ہے جھانکتا ہے — ایسے کہ خود اوٹ میں رہے آنکھ مچولی کے انداز میں دو تین بار جھانکتا ہے۔ پھر تھک کر کرسی پر آکر بیٹھ جاتا ہے — بے چینی سے کبھی کچن کے دروازے کو — کبھی اخبار کو — کبھی گھڑی کو دیکھتا ہے۔ بار بار یہی عمل)

(وقفہ)

(بیوی ایک ٹرے میں ایک پیالی چائے اور ایک کوفی لے کر داخل ہوتی ہے۔ میاں خوش ہو کر میز پر سے اخبار ہٹاتا ہے — اور جلدی سے ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی طرف اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتا ہے، اگلے چند منٹوں تک مکالمے کے دوران دونوں اپنی اپنی چائے کوفی پی رہے ہیں)۔

م: تم نے بہت دیر کر دی۔

ب: صرف دس منٹ میں واپس آئی ہوں۔

م: ساڑھے بارہ منٹ میں۔

ب: دس یا زیادہ سے زیادہ گیارہ منٹ میں۔

م: پورے ساڑھے بارہ منٹ میں۔

ب: تم بنیوں کی طرح ایک ایک منٹ حساب رکھتے ہو۔

م: Mathmatical Truths کی دنیا میں بہت زیادہ اہمیت ہے۔

ب: اور پھر بھی تم غلط حساب رکھتے ہو۔ ساڑھے گیارہ کو ساڑھے بارہ کہہ رہے ہو۔

م: تم ساڑھے بارہ کو ساڑے گیارہ کہہ رہی ہو۔

ب: اس ایک منٹ کا نہیں — اصولوں کا ہے۔

م: اور میں تو تم سے پچھلے دو گھنٹے سے کہہ رہی ہوں کہ ڈرائیونگ سکھا دو سیر بھی ہو جائیگی۔ وہ دو گھنٹے۔

م: سیر بھی ہو جائے گی؟؟ ڈرائیونگ اور سیر ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتی۔

ب: کیوں نہیں ہوسکتی۔

م: کیوں کہ جب تم نیلے اودے بادلوں کا نظارہ کرتی ہو ـــ اوراڑتی چڑیوں کے پر گنتی ہو اور درختوں کے رنگوں اور قسموں پر بےلاگ تبصرہ کرتی ہو تو تم ڈھیل نہیں پکڑ سکتیں۔

ب: تم میری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی اغوا کر لیتے ہو ـــ تمہارے ساتھ منظر سے لطف اندوز نہیں ہوسکتی۔

م: اور تم سے کسی کام کو سائنٹیفک طریقے سے کروانے کی کوشش فضول ہے

ب: شاعرانہ تخیل تمہیں چھو کر نہیں گزرا۔ کیونکہ تم نے غالب کو نہیں پڑھا ـــ اور علامہ اقبال کا نام تو شاید تمہاری کئی پشتوں میں کسی نے نہیں سنا............(شاعرانہ انداز میں)
قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں..............

م: (برجستہ چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں۔ مجھے اقبالؔ کا دوسرا مصرعہ تک یاد ہے میں تمہاری طرح جاہل نہیں ہوں)

ب: یہ مصرعہ تم نے مجھ سے ہی سن کر یاد کیا ہے۔

م: اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں دو تین شعر یاد ہیں جنھیں تم ہزاروں بار دہراتی رہتی ہو۔

ب: اس کا مطلب یہ ہوا، کہ جب تک تم کسی شعر کو ہزاروں بار نہ سن لو تمہیں یاد نہیں ہوسکتا۔

م: اور پرسوں وہ جگرؔ کا شعر کس نے پڑھ کر سنایا تھا۔ جو تمہیں معلوم بھی نہیں تھا

ب: کون سا شعر ـــ؟

م: وہی شعر جو میں نے سنایا تھا۔

ب: تم نے کون سا شعر سنایا تھا۔

م: وہی جو سنایا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں رہا۔

ب: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم نے سنایا ہی نہیں تھا۔

م: میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں نے سنایا تھا۔ تم تھوڑی دیر خاموش رہو۔ دماغ پر زور ڈالنے دو۔

ب: وہ اشعار انسان کے شاعرانہ تخیل کا جز نہیں بن سکتے جن کو یاد کرنے کے لئے دماغ پر

زور ڈالنا پڑے۔

م: چُپ رہو۔ مجھے زور ڈالنے دو۔

ب: اچھا ڈالو۔

(وقفہ)

ب: تم کندۂ ناتراش کے ساتھ ساتھ کاہل بھی ہو۔ تم نے ڈرائیونگ کی بات پھر گول کر دی۔

م: تم ڈرائیونگ نہیں سیکھ سکتیں۔

ب: کیوں نہیں سیکھ سکتی۔

م: پچھلے ہفتے ایکسڈنٹ ہوتے ہوتے بچا— میں ہیڈ بریک نہ لگاتا تو وہ بڑھیا مر گئی تھی۔

ب: تم نے ہینڈ بریک نہیں لگایا تھا میں نے خود اپنا بریک لگایا تھا۔

م: تم نے نہیں لگایا تھا میں نے لگایا تھا، تم اس وقت عالم خیال میں پہنچ چکی تھیں۔

ب: میں غروب آفتاب کا منظر دیکھنے میں محو تھی— عالم خیال میں نہیں تھی۔

م: جو شخص غروب آفتاب کا منظر دیکھنے میں محو ہو جائے وہ کبھی ڈرائیونگ نہیں سیکھ سکتا۔

ب: اور جو شخص غروب آفتاب کا منظر دیکھنے میں محو نہ ہو سکے وہ دنیا میں کبھی کچھ نہیں سیکھ سکتا۔

م: اور یوں بھی ڈرائیونگ سیکھنے کے سلسلے میں تم تقریباً Imbecile ہو۔

ب: اور سکھانے کے سلسلے میں تم تقریباً Idiot ہو۔

م: میں پچھلے پانچ سال سے تمہیں سکھا رہا ہوں اور آج تک تم نے.........

ب: قصور کس کا ہے؟

م: تمہارا—

ب: تمہارا— تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم— ماہرین تعلیم نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر بچہ امتحان میں فیل ہو جائے اور گالم گلوچ کرے تو قصور استادوں کا ہے۔ ان کی ترقی رک جانی چاہیے یا پھر انہیں Refresher Course لینے چاہئیں۔ اور یہ ایک طرح کی سزا ہے جو گرمیوں کی چھٹیوں کے لئے مخصوص طور پر ایجاد کی گئی ہے۔

م: ماہرین تعلیم کو گولی مار دینی چاہئے۔ انھوں نے بچوں کا دماغ خراب کر دیا ہے جب ہی

ملک میں اتنی بدنظمی ہے۔

ب: اور ماہرین نفسیات نے بھی یہی......

م: پھر تم نے ماہرین نفسیات کا نام لیا۔ یہ لوگ خالص فراڈ ہوتے ہیں۔

ب: ہم تم خیر غیر ترقی یافتہ ملک کے باشندے ہیں —— مگر امریکہ، برطانیہ اور یورپ —یعنی کہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں میں جہاں سائیکو تھیراپی PsychoTherapy کا رواج عام ہے۔ روس کے علاوہ ....کہ سوشلسٹ ریلزم اور تھیراپی میں جنم جنم کا بیر ہے۔ اگر بچے چوری کریں استادوں کا منہ چڑائیں یا کلاس میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے بوسے لیں — تو سزا ماؤں کو دی جاتی ہے۔

م: کیا مطلب؟ سزا ماؤں کو دی جاتی ہے —؟ یعنی ان کا کورٹ مارشل کیا جاتا ہے؟

ب: ہاں — تھیراپی ایک قسم کا کورٹ مارشل ہے — ماؤں کو کلنک کے ہیرے پھیرے لگانے پڑتے ہیں اور تھیراپیسٹ Therapist سے ہفتے اپوئمنٹ لینے پڑتے ہیں۔ اوران کے سامنے فدوی صورت بنا بنا کر آنا پڑتا ہے۔

م: (اس بار واقعی متاثر ہو کر).....اور پھر؟

ب: اور پھر تھراپسٹ گڑے مُردے اکھاڑتا ہے۔ اوران کے اترے پتر ے کھولتا ہے۔

م: (اسی انداز میں).......اور پھر؟

ب: (رعب سے) اور پھر ان کو دوسرے بڑے تھیراپیسٹ کو Refer کر دیتا ہے۔

م: (بہت ہی متاثر ہو کر) اور پھر؟

ب: اور پھر یہی سب سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا ہے.....اوراسی طرح چلتا رہتا ہے۔

م: کب تک چلتا رہتا ہے؟

ب: ساری عمر چل سکتا ہے۔ اگر مائیں فیملی پلاننگ کی قائل نہیں ہیں تو!

م: فیملی پلاننگ؟؟

ب: ہاں — کیونکہ جب وہ بچے نارمل ہو جاتے ہیں — تو اتنے میں دوسرے بچے جو بعد میں پیدا ہوئے تھے ابنارمل Abnormal ہو جاتے ہیں.......اور جب وہ ٹھیک ہو

جاتے ہیں، تو تیسرا گروپ جوان کے بعد پیدا ہوا تھا وہ Abnormal

م: خدا کے لئے بس کرو — مجھے ایسا لگتا ہے خود تمہارے دماغ کی چولیں ڈھیلی ہوگئی ہیں۔ اور تم دنیا کے سارے Abnormal بچوں کی ماں بن گئی ہو — اور مجھے تمہارا علاج کرانے کے لئے تمھیں لیکر امریکہ جانا پڑے گا۔

ب: تمھیں تمام عمر یہ توفیق نہیں ہو سکتی کہ تم مجھے امریکہ لے جاؤ — کیونکہ تم میں نہ کسی قسم کی Ambition ہے نہ جوش وولولہ ہے اور نہ ہی کوئی غیر معمولی صلاحیت ہے۔

م: اگر میں اتنا Mediocre ہوں تو پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی۔

ب: اس لئے کہ پاکستان بننے کے بعد لڑکیوں کے لئے شادی کا مارکیٹ مندا ہو چکا تھا۔ اور سب اچھے لڑکے پاکستان چلے گئے تھے اور صرف تم جیسے Mediocre رہ گئے تھے۔

م: تو تم کنواری کیوں نہیں رہیں، تم نے میری زندگی کو جہنم کیوں بنا دیا؟

ب: کیونکہ میں ایک Hard Boiled Realist ہوں ....اور شادی کے بغیر لڑکی کو کوئی آزادی نہیں مل سکتی۔

م: اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اپنی زندگی کی ابتدا ہی Compromise سے کی ہے۔

ب: شادی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے تمھارے خیال میں؟

م: تو پھر کیا ہوتی ہے؟

ب: زندگی کا Supension تعطل جمود............اور وہ بھی تم جیسوں کے ساتھ۔

م: اور تم جیسوں کے ساتھ کیا ہوتی ہے؟

ب: کیا ہوتی ہے؟

م: ....جہنم............گرداب — ذلت۔ تحقیر

ب: یہ ہماری تمھاری زندگی کا خلاصہ ہے۔

(وقفہ)

(......خاموشی)

(......بےلطفی)

(خالی پن......)

(......اکتاہٹ......)

م: چلو چل کر سو جائیں۔

ب: میں آج تمھارے ساتھ نہیں سو سکتی۔

م: تم روز یہی کہتی ہو۔

ب: کیونکہ مجھے روز ہی ایسا محسوس ہوتا ہے۔

م: آخر کیوں؟

ب: تمھارے جسم سے پسینے کی بدبو آتی ہے۔

م: پسینے کی بدبو تمھارے جسم سے آتی ہے۔

ب: میرے جسم سے بالکل نہیں آتی۔

م: آتی ہے، میں روز سونگھتا ہوں۔

ب: وہ تمھاری ہی بو ہوتی ہے۔

م: تمھاری بو اور میری بو میں فرق ہے اور میں اس فرق کو اچھی طرح محسوس کر سکتا ہوں۔

ب: بو سونگھنے کے فن میں تمھیں مہارت ہے۔

م: کیونکہ میں پانچ سال سے صرف یہی بو سونگھ رہا ہوں۔

ب: میں نے کہا نا میرے جسم سے بدبو نہیں آتی — تمہارے جسم سے آتی ہے۔

م: آتی ہے — تمھارے جسم سے بھی آتی ہے۔

ب: اچھا تو میں دو بدبوؤں کی کاک ٹیل برداشت نہیں کر سکتی۔

م: تو تم نہا کیوں نہیں لیتیں؟

ب: تم خود بھی تو نہا سکتے ہو — تم کیوں نہیں نہا لیتے؟

م: جب تم نہیں نہا سکتیں، تو میں بھی نہیں نہا سکتا۔

ب: میں اس لئے نہیں نہاتی کیونکہ تم نہیں نہاتے۔

م: اور میں اس لئے نہیں نہاتا تا کہ تم نہیں نہاتیں۔

ب: نہانے کے لئے اگلا ہفتہ بھی آئے گا۔

م: تو اب چل کر سو رہو۔

ب: چلو۔

(دونوں اٹھ کر صوفہ بیڈ کے سامنے والے پردے کو کھینچنے لگتے ہیں)

(پردہ)

جو چپ رہے گی زبان خنجر

• ابراہیم یوسف

کردار

عظمت خالہ

عالیہ

خدیجہ بیگم

مسلم

سلمیٰ

انسپکٹر

بوڑھا

کرمانی

پہلا سین

منظر: **مسلم کا ڈرائنگ روم** جس میں سامنے نظر آنے والی دیوار سے ذرا آگے ایک آفس ٹیبل رکھی ہے جس پر کچھ کتابیں سلیقہ سے رکھی ہیں اس کی بائیں جانب ایک چھوٹی میز پر ٹیلی فون رکھا ہے اسی کے پاس ایک دروازہ ہے جو کمرے سے باہر جانے کے کام آتا ہے۔ میز کے پاس دیوار کی طرف ایک کرسی ہے اور کرسی کے پیچھے ایک کھڑکی ہے۔ کھڑکی اور کرسی کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ آدمی بخوبی چل پھر سکتا ہے۔ دائیں طرف والی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو ایک دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ دروازوں اور کھڑکی پر دبیز خوبصورت پردے پڑے ہیں۔ بائیں طرف کی دیوار سے ملا ہوا قیمتی صوفہ سیٹ ہے جس کے سامنے ایک میز رکھی ہے جس پر کچھ رسایل، ایش ٹرے، سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس پڑی ہوئی ہے۔

دن کے قریب دس بجے ہیں۔ عالیہ صوفے پر خاموش بیٹھی ہے۔ اس کے پاس صوفے پر دو چار گولے پڑے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تھک کر ابھی کام بند کیا ہے اس کے چہرے سے تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں بھی ہے۔ عظمت خالہ ایک کپڑے سے میز صاف کر رہی ہیں۔ میز صاف کر کے عالیہ کے پاس آتی ہیں جو صوفے کے پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھی ہے۔ عظمت

خالہ چند سیکنڈ خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر آہستہ سے۔

عظمت خالہ: بہو بیگم۔ (عالیہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر عظمت خالہ کو دیکھتی ہے عظمت خالہ مسکرا کر) کیا یہ سوئٹر آنے والی سردیوں کے لئے بن رہی ہو (عالیہ خاموش رہتی ہے۔

عظمت خالہ سنجیدہ ہوکر) آخر بات کیا ہے، بہو بیگم اپنا غم مجھ سے بھی تو کہو۔

عالیہ : (کچھ دیر خاموش رہ کر کھڑے ہوتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھرکر) سب ٹھیک ہے

عظمت خالہ (طنزیہ) مجھے کیا غم ہوگا۔

(عالیہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہے۔ عظمت خالہ نگاہوں سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے۔)

عظمت خالہ: میں کچھ دن سے دیکھ رہی ہوں کہ تم گم سم سی ہو۔ (عالیہ مڑ کر عظمت خالہ کو دیکھتی ہے۔ چہرہ پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے مگر خاموش رہتی ہے عظمت خالہ اس کے قریب جاتے ہوئے) کیا میاں نے کوئی ایسی ویسی بات کہی؟

عالیہ : (پھیکی مسکراہٹ سے) نہیں عظمت خالہ، ایسی کوئی بات نہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھرکر) بہت سے لوگ اپنی ہی قسمت کو رونے کے لئے پیدا ہوتے ہیں (پھر صوفے کے پاس آتی ہے، اون کے گولے ٹوکری میں رکھ کر اسے اٹھا کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) جب وہ آئیں تو کہہ دینا پولیس انسپکٹر آیا تھا آپ اسے تھانے فون کرلیں۔ میں ذرا بازار جا رہی ہوں۔

عظمت خالہ: (سوچتے ہوئے) مگر بہو بیگم وہ یہ سب باتیں کیوں پوچھ رہا تھا؟

عالیہ : (دروازے کے پاس پہنچ کر بے پروائی سے) ہوگی کوئی بات، شارق صاحب ایسے کوئی بھلے تو ہیں نہیں، کی ہوگی کوئی ایسی ویسی حرکت۔

(عالیہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ عظمت خالہ کسی گہری سوچ میں پڑ جاتی ہیں اور خاموش رہتی ہیں کہ کچھ دیر بعد دوسرے کمرے سے خدیجہ بیگم کی آواز)

خدیجہ بیگم : عالیہ بیٹی۔ عالیہ بیٹی! (عظمت خالہ مڑ کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہیں کہ خدیجہ بیگم کمرے میں آکر) عالیہ کہاں ہے؟ (کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے) گیا

وہ صورت حرام۔

عظمت خالہ: کون صورت حرام؟

خدیجہ بیگم : وہی پولیس والا۔

عظمت خالہ: دلہن بیگم وہ تو دو گھنٹے ہوئے تمہارے سامنے ہی چلا گیا تھا مگر تمہیں وہ ابھی تک یہیں نظر آ رہا ہے۔

خدیجہ بیگم : سچ مانو عظمت خالہ، ان پولیس والوں کی صورت دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اترنے لگتا ہے۔(آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں) مرنے کے بعد امجد کی لاش کی تکا بوٹی کرادی تھی ان صورت حراموں نے (آنسو پونچھ کر) اب یہ پھٹے میں پیرا الجھانے کیوں آ گیا؟

عظمت خالہ: میں کیا جانو دلہن بیگم! ہوگا کوئی چکر۔ مسلم میاں کو آ جانے دو شاید انہیں کچھ پتہ ہو۔

خدیجہ بیگم : چکر کیا ہوگا (صوفے پر بیٹھ کر) بیٹھے بٹھائے لوگوں کو پریشان کرنا۔ یہ پولیس والے......

عظمت خالہ: (بات کاٹ کر) مجھے تو جان پڑتا ہے شارق میاں پھر اور کوئی چال چلنے والے ہیں۔

خدیجہ بیگم : شارق میاں اب اور کیا چاہتے ہیں۔ مجھے گھر سے بے گھر کر دیا۔ جائیداد ہڑپ کر لی۔ ارے وہ یہ پولیس والے ایک خدائی خوار ہوتے ہیں۔ بھلا تم ہی ایمان کی کہو کہ انہیں ان سب باتوں سے کیا واسطہ کہ میں ان کے پاس کیوں نہیں رہتی۔ میں نے عالیہ کا نکاح کیوں کرایا۔ شارق میاں گزارے کے لئے مجھے کچھ دیتے ہیں یا نہیں انھوں نے تمہارا روپیہ واپس کیا یا نہیں۔(عظمت خالہ خاموش رہتی ہیں) میرا بس چلے تو ان کو سولی چڑھادوں۔

عظمت خالہ: اچھا دلہن بیگم ابھی تو تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ خدا جانے کیا بات ہے۔

خدیجہ بیگم : اے بی بی تم ایسی بگڑتی کیوں ہو تمہیں بُری لگتی ہوں تو چلی جاتی ہوں۔ عالیہ کو میرے پاس بھیج دو۔

عظمت خالہ: اب ان سے کیا کام نکل آیا۔ انہیں اپنے ہی غموں سے فرصت نہیں اس پر تم۔

خدیجہ بیگم :(بات کاٹ کر) اسے کون سے غم ہیں۔ اللہ رکھے محبت کرنے والا شوہر ملا ہے۔

عظمت خالہ: اولاد نہ ہونے کا غم کیا ہوتا ہے؟

خدیجہ بیگم : خدا نے چاہا تو وہ بھی ہو جائے گی۔ تم تو چاہتی ہو ڈیڑھ سال ہی میں لین لگ جائے۔ اولاد کے معاملے میں ہتھیلی پر سرسوں جماتے کسی کو دیکھا ہے؟

عظمت خالہ خاموش رہتی ہیں۔ خدیجہ بیگم کچھ دیر کھڑی رہتی ہیں پھر جس دروازے سے آئی تھیں اسی سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عظمت خالہ ان کے پیچھے پیچھے جا کر دروازے کا پردہ برابر کرتی ہیں کہ دوسرے دروازے سے مسلم کمرے میں آتا ہے۔ عظمت خالہ مڑ کر مسلم کو دیکھتی ہیں۔ عظمت خالہ کے چہرے پر ابھی تک پریشانی اور الجھن کے آثار ہیں مسلم انہیں غور سے دیکھ کر)

مسلم :کیا بات ہے عظمت خالہ؟

عظمت خالہ: (مسلم کے قریب آتے ہوئے) آپ کے جانے کے بعد ایک پولیس والا آیا تھا۔

مسلم :پولیس والا! کیوں؟

عظمت خالہ: پتہ نہیں۔ مجھ سے اور دلہن بیگم سے ادھر ادھر کے سوالات کرتا رہا (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے تو شارق میاں کی پھر کوئی شرارت معلوم ہوتی ہے۔

مسلم :شارق میاں کی۔ (نفرت اور طنز سے) وہ اب اور کیا چاہتے ہیں؟

عظمت خالہ: پتہ نہیں۔ وہ انہی کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔

مسلم :(بے پروائی سے) چھوڑیئے ہوگا کوئی چکر (صوفے پر بیٹھ کر) شارق صاحب کوئی بھلے آدمی تو ہیں نہیں کہ ان کی فکر کی جائے۔

عظمت خالہ: (اسی طرح تشویش آمیز لہجے میں) وہ کہہ گیا ہے کہ آپ اسے تھانے فون کر لیں وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

مسلم :کرلوں گا آپ فکر نہ کیجئے۔ عالیہ کہاں ہے؟

عظمت خالہ: بازار گئی ہیں کچھ سامان خریدنا تھا۔

مسلم :اچھا تو پھر آپ ہی ایک پیالی کافی پلوا دیجئے۔

(عظمت خالہ آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ مسلم سگریٹ جلا کر اس کا کش لیتا ہے اور سامنے رکھی ہوئی میز پر سے ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرتا ہے۔ پھر اسے رکھ کر ٹیلی فون کے پاس جاتا ہے اور اس کا رسیور اٹھاتا ہے مگر پھر کچھ سوچ کر رکھ دیتا ہے کہ عالیہ کمرے میں آتی ہے اور دروازے کی طرف دیکھ کر)

عالیہ : ارے بھئی سلمیٰ کہاں رہ گئیں۔ آؤ نا۔ (سلمیٰ کمرے میں آتی ہے مسلم اور سلمیٰ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں عالیہ اس پر دھیان نہ دے کر) یہ میری عزیز سہیلی سلمیٰ ہیں۔ ڈاکٹر سلمیٰ (خفیف سا مسکرا کر مسلم کی طرف اشارہ کر کے) پروفیسر مسلم۔ میرے۔

سلمیٰ : (مسکرا کر لقمہ دیتے ہوئے) عزیز شوہر۔

مسلم : (صوفے کی طرف اشارہ کر کے) تشریف لائیے۔

عالیہ : کالج میں میری کلاس فیلو تھیں۔ (صوفے کی طرف اشارہ کر کے) ارے بھئی بیٹھو نا، تکلف کی ضرورت نہیں۔ (مسلم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے) کالج کے بعد جو غوطہ لگایا تو ڈاکٹر بن کر ایک جنرل اسٹور سے برآمد ہوئیں۔ ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔

مسلم : (سلمیٰ کی طرف دیکھ کر) بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔

سلمیٰ : (ہنس کر) مگر ذرا دیر میں ہوئی۔

مسلم : سوچ رہا تھا کہ تمام معلومات حاصل ہو جائیں تو اپنی خوشی کا اظہار کروں (عالیہ دونوں کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ مسلم عالیہ کی طرف دیکھ کر) یہ سینئر کیمبرج تک میرے ساتھ بھی پڑھ چکی ہیں۔

عالیہ : اچھا! گویا پرانی جان پہچان ہے۔

مسلم : (ہنستے ہوئے) جانے کس مسخرے نے انہیں ڈاکٹر بنا دیا ایک نمبر بودم تھیں۔

سلمیٰ : دنیا میں مسخروں کی کیا کمی اور کچھ نہیں سوجھتا تو لوگوں کو پروفیسر ہی بنا دیتے ہیں، (سب قہقہہ مار کر ہنستے ہیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے مسلم رسیور اٹھا کر۔)

مسلم : ہلو۔ جی ہاں میں مسلم بول رہا ہوں۔ جی ہاں ضرور تشریف لائیے۔ جی ہاں ابھی تو گھر

پڑ ہی ہوں۔ (ریسور رکھ دیتا ہے۔ عالیہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی ہے مسلم اسے نظر انداز کر کے سلمیٰ سے) یہ ہوٹل میں قیام کرنے کی کیا تک ہے؟

سلمیٰ : میں تو ویسے ہی چھٹیاں گزارنے چلی آئی تھی۔ (مسکراتے ہوئے) مجھے کیا پتہ تھا کہ دو یاجوج یہاں موجود ہیں۔

مسلم :(مسلم مسکراتا ہے اور عالیہ کی طرف دیکھ کر) ان کا سامان ہوٹل سے یہیں منگوالو۔

سلمیٰ :بلاوجہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ تم لوگوں کو زحمت ہوگی۔

عالیہ :(ہنس کر) بے مروتوں کے لئے زحمت بھی برداشت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اچھا آؤ پہلے تمہاری ملاقات امی سے کرا دیں پھر سامان ہوٹل سے اٹھا لائیں گے۔

(عظمت خالہ کافی لئے ہوئے کمرے میں آتی ہیں۔)

مسلم :ارے بھئی کافی پیتی جاؤ۔

عالیہ :اب ہم اپنے کمرے ہی میں پی لیں گے۔ عظمت کافی میرے کمرے میں دے جانا۔ امی کہاں ہیں؟

عظمت خالہ: اپنے کمرے میں ہیں۔ آپ کو پوچھ بھی رہی تھیں۔

عالیہ : اچھا تو پھر کافی انہیں کے کمرے میں لے آؤ (سلمیٰ کی طرف دیکھ کر) بھئی ہوشیار رہنا۔ امی کو ہپی قسم کی عورتیں پسند نہیں۔

سلمیٰ : میں تمہیں ہپی قسم کی عورت لگتی ہوں۔ (ہنس کر) اپنی امی سے کہہ دینا میں گانجے اور چرس سے بھی شوق کرتی ہوں۔

(دونوں قہقہہ مار کر ہنستی ہیں۔ عالیہ سنجیدہ ہو کر)

عالیہ :ان کے سامنے یہ ظاہر نہ کرنا کہ تم ڈاکٹر ہو۔ (سلمیٰ سوالیہ نظروں سے عالیہ کو دیکھتی ہے) یہ بات میں تمہیں پھر بتاؤں گی۔

(دونوں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عظمت خالہ کافی میز پر رکھتی ہیں اور میز پر بکھرے ہوئے رسائل اور اخبار برابر کرنے لگتی ہیں۔ مسلم کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور اس سے ٹیک لگا کر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس کا منہ کمرے کی طرف ہوتا ہے وہ

عظمت خالہ کی طرف دیکھ کر۔)

مسلم :عظمت خالہ، ایک پیالی کافی دینا۔(عظمت خالہ کافی دیتی ہیں۔ مسلم ایک گھونٹ لے کر) شارق صاحب نے کچھ گڑ بڑ ضرور کی ہے۔ ابھی پولیس انسپکٹر نے مجھے بھی فون کیا تھا۔

عظمت خالہ: ہماری بلا سے، جب ہمیں ان سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھنا تو جو جی چاہے کرتے پھریں ہماری جوتی سے۔

مسلم :(سوچتے ہوئے) وہ تو ٹھیک ہے عظمت خالہ۔ مگر لوگوں کی نظریں ہم پر پڑیں گیں اور پھر پولیس والے۔ انہیں تو بھلے لوگوں کی پگڑیاں اچھالنے میں مزا آتا ہے۔(کال بیل کی آواز) ذرا دیکھئے تو اگر پولس انسپکٹر ہو تو اسے یہیں لے آیئے۔

عظمت خالہ :(بے حد بیزاری سے) خدا سمجھے اسے۔ گھر گھیر لیا ہے۔ چڑیل کی اولاد۔ (عظمت خالہ بے حد بیزاری سے کمرے باہر چلی جاتی ہیں۔ مسلم وہیں کھڑے کھڑے کافی ختم کرتا ہے اور پیالی میز پر رکھتا ہے کہ انسپکٹر کمرے میں آتا ہے مسلم اسے دیکھ کر صوفے کی طرف اشارہ کر کے۔)

مسلم :تشریف لایئے (انسپکٹر صوفے کی طرف بڑھتا ہے مگر بیٹھتا نہیں ہے۔ مسلم کچھ دیر خاموش رہ کر) فرمایئے کیسے تکلیف فرمائی۔

انسپکٹر :(چند سیکنڈ رک کر) میں آپ کو کوئی اچھی خبر سنانے نہیں آیا ہوں۔

مسلم :ظاہر ہے (پھر کھڑکی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے) سنایئے۔

انسپکٹر :آپ مسٹر شارق کو تو جانتے ہوں گے۔

مسلم :جی ہاں، خوب اچھی طرح۔

انسپکٹر :(مسلم کے پاس آتے ہوئے) ان کا مرڈر ہو گیا ہے۔

مسلم (ایک دم چونک کر) جی۔ مرڈر ہو گیا۔ کب۔ کس نے کیا۔

انسپکٹر :پرسوں رات کو۔ (غور سے مسلم کا چہرہ دیکھتے ہوئے) شاید اسی دن آپ کی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔

مسلم :شاید نہیں۔ یقینی ہوئی تھی۔ میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا تھا۔

انسپکٹر :کس وقت؟

مسلم :یہی کوئی تین اور چار کے درمیان۔

انسپکٹر :(آفس ٹیبل کے پاس جا کر) کوئی اہم ضروری کام تھا؟

مسلم :ایسا کوئی اہم ضروری کام بھی نہیں تھا۔(انسپکٹر میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ مسلم طنزیہ) شاید کسی جیب میں سرخ وارنٹ ہے۔

انسپکٹر :اوہ! آئی ایم ساری۔ مجھے کتابوں سے دل چسپی ہے۔(نظریں اٹھا کر مسلم کو دیکھتے ہوئے) آپ نے بتلایا نہیں کس سلسلے میں مسٹر شارق سے ملنے گئے تھے؟

مسلم :ان کے پاس کچھ تصویریں تھیں مجھے ان میں سے اس کی ضرورت تھی۔

انسپکٹر :کوئی اہم تصویر تھی؟

مسلم :جی نہیں۔ میری وائف کے پہلے شوہر کی تصویریں تھیں۔

انسپکٹر :وہ تصویریں آپ کی وائف نے کیوں......

مسلم :(بات کاٹ کر) اسے ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کی ساس کو تھی۔ وہ میرے ہی ساتھ رہتی ہیں۔

انسپکٹر :میں وہ تصویر دیکھ سکتا ہوں۔

مسلم :کیوں نہیں۔(دوسرے کمرے کے دروازے کے پاس جا کر) عالیہ۔(بلند آواز سے) عالیہ (کچھ دیر بعد عالیہ کمرے میں آتی ہے۔ مسلم اسے دیکھ کر) ذرا تصویر تو لاؤ۔

عالیہ :(پہلے تو پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھتی ہے پھر مسلم سے) کون سی تصویر۔

مسلم :جو میں مسٹر شارق سے لایا تھا۔

عالیہ :وہ تو امی کے پاس ہے۔

مسلم :تھوڑی دیر کے لئے ان سے مانگ لاؤ۔

(عالیہ پھر مشکوک نظروں سے انسپکٹر کو دیکھتی ہے اور کمرے سے چلی جاتی ہے۔ انسپکٹر کچھ دیر خاموش رہ کر۔)

انسپکٹر :آپ نے وہاں کس ہوٹل میں قیام کیا تھا؟

مسلم : قطب تارے میں۔(کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔پھر سگریٹ جلا کر سوچتے ہوئے) لیکن انسپکٹر یہ مرڈر ہوا کیسے۔

انسپکٹر : (مسکرا کر) ہم لوگ سوالات ہی کرتے ہیں بالعموم جواب نہیں دیتے۔

مسلم : اوہ۔(طنزیہ مسکرا کر) معاف کیجئے گا مجھے پولیس والوں کی اس عالی ظرفی کا علم نہیں تھا(جھنجھلاہٹ میں دروازے کے پاس جا کر بلند آواز سے۔)

(کچھ دیر بعد عالیہ کمرے میں آ کر)

عالیہ : امی تصویر نہیں دے رہی ہیں۔

مسلم : خیر میں لاتا ہوں۔تم ڈاکٹر سلمٰی کے ساتھ جا کر ہوٹل سے ان کا سامان لے آؤ۔

انسپکٹر : پروفیسر، مجھے مسز مسلم سے چند سوالات

مسلم : (بات کاٹ کر تلخ لہجے میں) کر لیجئے گا وہ بھاگی نہیں جا رہی ہیں(عالیہ کی طرف دیکھ کر)تم جاؤ۔

(عالیہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔اس کے پیچھے پیچھے مسلم بھی کمرے سے جاتا ہے۔ انسپکٹر کمرے میں تنہا رہ جاتا ہے۔سگریٹ جلا کر دو چار کش لیتا ہے کہ مسلم تصویر ہاتھ میں لئے داخل ہوتا ہے اور خاموشی سے تصویر انسپکٹر کی طرف بڑھا دیتا ہے۔انسپکٹر تصویر مسلم سے لے کر اسے غور سے دیکھتا ہے۔)

انسپکٹر : شادی کے موقع کی تصویر ہے۔(مسلم خاموش رہتا ہے۔انسپکٹر تصویر کی طرف اشارہ کر کے)ان صاحب کا مسٹر شارق سے کیا رشتہ تھا؟

مسلم : چچازاد بھائی(کچھ دیر خاموش رہ کر)میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کا مقصد کیا ہے۔

انسپکٹر : (مسکرا کر) ہر ذمہ دار شہری کا فرض ہے پروفیسر کہ وہ پولیس کی مدد کرے۔(سگریٹ کا کش لے کر) یہ تصویر انھوں نے بلا حیل وحجت آپ کو دے دی تھی؟

مسلم : جی ہاں، یونہی سمجھ لیجئے(کچھ دیر بعد) مجھے ایک اہم کانفرنس میں جانا ہے۔

انسپکٹر : آئی ایم ساری پروفیسر میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔یہ تصویر فی الحال مجھے اپنے پاس رکھنے کی اجازت دیں گے۔

مسلم :ضرورر کھئے (آفس ٹیبل کے پاس جاتا ہےاور سادہ کاغذ انسپکٹر کی طرف بڑھا کر) رسید لکھ دیجئے (انسپکٹر رسید لکھ کر دیتا ہے۔) تھینک یو۔

انسپکٹر : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) مجھے امید ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو آپ کچھ وقت ضرور عنایت کریں گے (مسلم خاموش رہتا ہے۔ انسپکٹر دروازے کے پاس پہنچ کر رکتا ہے اور مڑ کر مسلم کو دیکھ کر) آپ کی ملازمہ کے لڑکے یہاں اس سے ملنے آتے رہتے ہوں گے؟

مسلم :جی ہاں اکثر آتے رہتے ہیں۔

انسپکٹر :ابھی دو چار دن میں تو نہیں آئے؟

مسلم :میری موجودگی میں تو نہیں آئے۔

(انسپکٹر کچھ دیر سوچتا ہے اور پھر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ مسلم کچھ دیر غور وفکر کے انداز میں کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے پھر دروازے کے پاس جا کر۔)

مسلم :عظمت خالہ۔عظمت خالہ۔(عالیہ کمرے میں آتی ہے مسلم عالیہ کو دیکھ کر) عظمت خالہ کہاں ہیں؟ تم ہوٹل نہیں گئیں۔

عالیہ :عظمت خالہ باورچی خانہ میں ہیں، سلمیٰ خود ہوٹل چلی گئی۔ (کچھ دیر بعد خاموش رہ کر) اب یہ انسپکٹر کیا پوچھ رہا تھا؟

مسلم :(سوچتے ہوئے) عالیہ! شارق صاحب کا مرڈر ہو گیا ہے۔

عالیہ :مرڈر ہو گیا ہے۔کیا کہہ رہے ہیں آپ۔

مسلم :ہاں عالیہ۔انسپکٹر یہی خبر سنانے آیا تھا۔

عالیہ :کب ہوا۔کس نے کیا۔ہم سے تو اس نے یہ بات نہیں کہی تھی۔

مسلم :پرسوں۔جس دن میں ان سے ملا تھا۔

عالیہ :پولیس کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ اسی دن ان سے ملے تھے۔

مسلم :شارق صاحب کے نوکر نے کہا ہوگا۔(سوچتے ہوئے) تصویر کے سلسلے میں میری ان کی سخت کلامی بھی ہو گئی تھی۔

عالیہ : لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پولیس ہمارے گھر کے چکر لگانے لگے۔
مسلم : پولیس ہر شخص کو مشکوک سمجھتی ہے۔
عالیہ : (سوچتے ہوئے) آپ اعلیٰ افسروں سے مل کر۔
مسلم : (لقمہ دے کر) اپنی پوزیشن صاف کروں۔ (طنزیہ مسکرا کر) اس سے تو پوزیشن اور مشکوک ہو جائے گی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) بعض وقت کی ہمدردی بھی عذاب بن جاتی ہے۔

(عالیہ معنی خیز نظروں سے مسلم کو دیکھتی ہے پھر کچھ دیر خاموش رہ کر)

عالیہ : وہ تو کچھ لوگ ہی بُری قسمت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ (مسلم سوالیہ نظروں سے عالیہ کو دیکھتا ہے) جیسے میں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) شاید زندگی میں سکون میرے لئے ہے ہی نہیں۔
مسلم : یہ قدرت کا زبردست انتقام ہے کہ انسان دوڑ کر خود مصیبتوں کے پاس پہنچ جائے (عالیہ خاموش رہتی ہے۔ مسلم سوچتا ہوا دروازے کے پاس جاتا ہے۔) یہ خبر ابھی امی کو نہ سنانا۔ (عالیہ اب بھی خاموش رہتی ہے۔) امی اپنے کمرے ہی میں ہوں گی؟

(عالیہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ مسلم کمرے سے چلا جاتا ہے۔ عالیہ پہلے تو کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے کہ اسی وقت ڈاکٹر سلمیٰ کمرے میں آکر۔)

سلمیٰ : لیجئے میم صاحب میں اپنا سامان لے آئی۔ (عالیہ کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتی ہے سلمیٰ غور سے عالیہ کا چہرہ دیکھ کر) کیا بات ہے کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔

(عالیہ کچھ اس انداز سے کھڑی ہوئی ہے جیسے اس کے بدن میں جان نہ ہو۔ سلمیٰ کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے۔)

عالیہ : شارق صاحب کا مرڈر ہو گیا ہے۔
سلمیٰ : کون شارق صاحب۔ وہی تو نہیں جنھوں نے تمہاری امی کی جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے۔ (عالیہ اثبات میں سر ہلاتی ہے) تو ہو جانے دو۔

عالیہ : مگر اسی دن مسلم ان سے ملے تھے۔

سلمیٰ : (ہنس کر) وہ مسلم کو پکڑ کر تو نہیں لے گیا۔

عالیہ : نہیں، پکڑ کر تو نہیں لے گیا۔ مگر میں مسلم کو جانتی ہوں۔ وہ اسے اپنی توہین سمجھیں گے کہ پولیس ان کے گھر کے چکر لگا رہی ہے۔ (کچھ دیر رک کر سوچتے ہوئے) ہماری گھریلو زندگی میں بڑا طوفان آ رہا ہے۔ کوئی بڑا طوفان۔

سلمیٰ : کوئی طوفان ووفان نہیں آ رہا ہے۔ ایسے سینکڑوں طوفان آتے اور گزر جاتے ہیں پرواہ کون کرتا ہے ان کی اور مسلم تو سمجھدار اور پڑھے لکھے ہیں۔

عالیہ : پڑھا لکھا ہی بزعم خود بہت خوددار ہوتا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) سلمیٰ اب میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ معمولی ہواؤں سے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ کوئی طوفان نہ بن جائیں۔

سلمیٰ : (ہنس کر) معلوم ہوتا ہے کہ تم کچھ فلسفی زیادہ ہو گئی ہو اور عورت کم رہ گئی ہو (عالیہ کا ہاتھ پکڑ کر) چلو مسلم سے اس سلسلے میں گفتگو کریں۔

......پردہ......

دوسرا سین

منظر : **وہی کمرہ، آٹھ دن بعد**

مسلم کمرے میں ٹہل رہا ہے اس کے چہرے پر غصہ اور جھنجھلاہٹ ہے۔ عالیہ ایک صوفے پر بیٹھی خلا میں گھور رہی ہے۔ مسلم کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے پھر عالیہ کے پاس رک کر۔

مسلم : عالیہ! میری بدنامی میں کوئی کسر باقی رہ گئی تھی جو تم نے نوکری کے لئے درخواست دے دی۔

عالیہ : بدنامی۔ (کھڑی ہو جاتی ہے آفس ٹیبل کے پاس جا کر بے مقصد ایک کتاب اٹھا لیتی ہے پھر مسلم کی طرف دیکھ کر) آج ہزاروں عورتیں نوکریاں کر رہی ہیں۔ اس سے کس کی بدنامی ہوتی ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بُرا تو نہیں ہے۔

مسلم : ابھی تک تو لوگ شارق صاحب کے مرڈر کے متعلق ہی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں، اب آپ کی نوکری کو مسئلہ بنا لیں گے۔ (چند سکنڈ رک کر) آخر آپ کو نوکری کا مشورہ کس نے دیا ہے۔

عالیہ : مشورہ کون دے گا۔ میں ہی کئی دن سے سوچ رہی تھی (کتاب میز پر رکھتی ہے کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر آگے بڑھتے ہوئے) یہ ہمارا نجی معاملہ ہے دوسروں کو اسے

مسلہ بنانے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

مسلم :بعض لوگوں کی ہابی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے نجی معاملات میں دل چسپی لیتے ہیں اور پھر اس کو مسلہ بنا لیتے ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کچھ لوگوں کو تو میرا شادی کرنا ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

عالیہ :اگر کسی کی پیدائش ہی کو لوگ مضحکہ خیز کہنے لگیں تو اس میں پیدا ہونے والے کا کیا قصور؟ ہم نے کوئی انوکھی شادی تو نہیں کی ہے۔

مسلم :لیکن میں نے چالیس سال کی عمر میں شادی کی ہے، لوگوں کے لئے......

عالیہ :(بات کاٹ کر) لوگ تو ساٹھ سال کی عمر میں شادی کر لیتے ہیں۔

مسلم :اور لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنتے ہیں۔ (فیصلہ کن لہجے میں) عالیہ تم نوکری ووکری نہیں کروگی۔

عالیہ :کیوں نہیں کروں گی۔ آپ تو بلاوجہ......

مسلم :(تند لہجے میں بات کاٹ کر) عالیہ۔

(عالیہ خاموش ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر وہیں کھڑی رہتی ہے۔ پھر کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھنے لگتی ہے۔ مسلم غصہ اور جھنجھلاہٹ میں کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے کہ سلمیٰ کمرے میں آ کر)

سلمیٰ :بھئی کمال ہے۔ ابھی تک تم لوگوں کے یہاں صبح نہیں ہوئی۔ (عالیہ مڑ کر سلمیٰ کو دیکھتی ہے۔ مسلم خاموش رہتا ہے۔ سلمیٰ ان دونوں کی خاموشی پر دھیان نہ دے کر) آج اتوار ہے اور ہم نے آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ خدا کی قسم تم لوگ میری چھٹیوں کا ستیاناس کئے دے رہے ہو۔

مسلم :(سوچتے ہوئے) لیکن جانا کہاں ہے؟

سلمیٰ :جہنم میں، اچھا اب جلدی تیار ہو لو۔

مسلم :بھئی مجھے آج......

سلمیٰ :(بات کاٹ کر) کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔ (عالیہ کی طرف دیکھ کر) جاؤ بھئی جلدی

تیار ہو کر آ جاؤ۔

عالیہ : کیا سچ مچ چلنا ہی ہے؟

سلمٰی : نہیں ابھی تو ریہرسل کرنا ہے آؤٹنگ کے لئے تو پھر کبھی چلیں گے۔ (عالیہ کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف ڈھکیلتے ہوئے) جایئے، جلدی کیجئے۔ (عالیہ آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ سلمٰی مسلم کی طرف دیکھ کر) آخر تم لوگ اس قدر ڈسٹرب کیوں ہو؟ مرڈر تم نے کیا ہے؟ ایک فضول غم میں گھلتے رہنا کون سی عقلمندی ہے؟

مسلم : خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) میں سوچتا ہوں کہ شاید شادی کر کے میں نے غلطی کی ہے۔

سلمٰی : (حیرت سے) شادی کر کے غلطی! کیوں؟

مسلم : (سوچتا ہوا آفس ٹیبل کے پاس جاتا ہے اس پر سے گھڑی اٹھا کر کلائی پر باندھتے ہوئے) کچھ حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے ہیں (سلمٰی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ مسلم کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے عالیہ میں اس خلوص اور خود سپردگی کی کمی کا احساس ہوتا ہے جو ایک بیوی میں ہونا چاہیے۔

سلمٰی : یہ تو میں کہہ سکتی ہوں کہ اسے تم سے محبت ہے۔ کیا خود سپردگی سے تمہارا مطلب جنسی خلوص کی کمی ہے؟ (مسلم اس طرح خاموش رہتا ہے جیسے وہ سلمٰی سے متفق ہو۔ سلمٰی اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر) کیوں؟ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟

مسلم : اس کا زیادہ وقت امی کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا ہے۔ (سوچتے ہوئے) شاید وہ ابھی اپنے پہلے شوہر کو بھی نہیں بھولی ہے۔

سلمٰی : (سنجیدگی سے مسکرا کر) تم سمجھتے ہو کہ اس میں وہی والہانہ انداز ہونا چاہئے جو ایک کنواری لڑکی میں ہوتا ہے (مسلم خاموش رہتا ہے۔ سلمٰی اس کے پاس جا کر) اپنا تجزیہ خود کرو کہیں تم تو نہیں سوچتے کہ تم نے ایک بیوہ سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔ اس سے تمہارے جنسی خلوص میں تو کمی نہیں ہوئی ہے۔

مسلم : سلمٰی۔ میں نے......

سلمٰی : (بات کاٹ کر) تمہارے یہ کہنے سے کہ تم اسے کسی سائیکوانالسٹ کو دکھانا چاہتے ہو۔اس پر کوئی اچھا اثر نہ چھوڑا ہوگا۔ کتابی علم اور عملی دنیا میں بہت فرق ہوتا ہے مسلم۔

مسلم :بات دراصل یہ ہے کہ......

سلمٰی :(بات کاٹ کر) بات وات کچھ نہیں ہے تمہاری ایسی ہی باتوں سے وہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگی ہے اور نوکری کی فکر میں ہے (طنزیہ ہنس کر) کیا چھٹی اسی لئے لی ہے کہ ایسی باتیں سوچتے رہو؟

مسلم :نہیں سلمٰی۔وہ تو شارق صاحب کے بکھیڑے نے مجھے ڈسٹرب کر رکھا ہے (صوفے کی طرف جاتے ہوئے) اپنے کلیگز کی آنکھوں سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہی ہوں۔میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سلمٰی :اور کب تک ان کا مقابلہ کرنے سے کتراتے رہوگے؟ بزدلی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

مسلم :(کچھ سوچنے لگتا ہے پھر آہستہ سے) ہاں سلمٰی میں بزدل ہی ہوں۔(کچھ دیر خاموش رہ کر) امی کو بڑے حوصلے سے اپنے ساتھ لایا تھا اب سوچتا ہوں کہ وہ میرے لئے مسئلہ ہیں۔

سلمٰی :کون امی! عالیہ کی ساس؟ اگر یہی بات ہے تو انہیں چلتا کرو بس جھگڑا ختم ہوا۔

(صوفے پر بیٹھ کر سامنے دیوار کو تاکنے لگتا ہے۔پھر کھڑے ہو کر ٹھنڈی سانس بھر کر)

مسلم :اور انہیں کے ساتھ عالیہ بھی چلتی بنے گی وہ اس کی زندگی کا اب حصہ بن گئی ہیں۔ جسے وہ الگ نہیں کر سکتی۔

سلمٰی :(سوچتے ہوئے) جب سے تم نے نکاح کیا ہے وہ تمہارے ساتھ ہیں؟

مسلم :نہیں ایک سال کے قریب وہ شارق صاحب کے ساتھ رہیں مگر چونکہ انہیں عالیہ سے غیر معمولی محبت ہے۔

سلمٰی :اور اسی لئے تم انہیں اپنے ساتھ لے آئے۔

مسلم :(سوچتے ہوئے) مسٹر شارق ایک نمبر کے پیسہ پرست انسان تھے۔انھوں نے عظمت خالہ کا کچھ روپیہ ہڑپ کر لیا تھا جس سے امی کی دماغی حالت خراب ہوگئی تھی اور انہیں

ساتھ لانا پڑا۔

سلمیٰ :لیکن ان کی ذمہ داری تم پر تو نہیں؟ تم......

مسلم :(بات کاٹ کر) شاید یہی کچھ عالیہ بھی سوچتی ہے کہ کہیں کسی دن بڑی بی میرے اور اس کے درمیان دیوار نہ بن جائیں۔ شاید اسی لئے وہ نوکری کی تلاش میں ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اور سچ تو یہ ہے سلمیٰ وہ ہمدردی کی مستحق ہیں۔ ایک ہاری ہوئی زندگی کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہیں۔

سلمیٰ :تو پھر اس خول سے باہر نکلو۔ جس میں تم نے خود کو قید کر رکھا ہے (مسلم سوالیہ نظروں سے سلمیٰ کو دیکھتا ہے۔) انسان بہت سے مصنوعی لبادے اوڑھ لیتا ہے۔ (عظمت خالہ کمرے میں آتی ہے۔) یہ لبادے اس کی شخصیت کو گھن لگا دیتے ہیں۔

(مسلم خالہ عظمت کی طرف دیکھتا ہے)

عظمت خالہ: وہ پولیس والا پھر آیا اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

مسلم :لاحول ولا قوۃ (بیزاری کے انداز میں) اسے یہیں بھیج دو اور چائے دے جاؤ۔

(عظمت خالہ کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ سلمیٰ صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔ مسلم سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور اس میں سے باہر دیکھتا، پھر مڑ کر کھڑکی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور سگریٹ جلاتا ہے کہ انسپکٹر کمرے میں آتا ہے اور مسلم دیکھ کر۔)

انسپکٹر :گڈ مارننگ پروفیسر (مسکرا کر) میں آپ کو پھر بے وقت تکلیف دے رہا ہوں۔

مسلم :گڈ مارننگ (طنزیہ مسکرا کر) آپ کی ذمہ داریاں ہی ایسی ہیں جس میں دوسروں کے وقت کی اہمیت نہیں (انسپکٹر سلمیٰ کی طرف دیکھتا ہے) یہ ڈاکٹر سلمیٰ ہیں (انسپکٹر مسکرا کر ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا ہے سلمیٰ صرف گردن ہلا کر جواب دیتی ہے اور میز پر سے ایک رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتی ہے۔ مسلم کچھ دیر خاموش رہ کر انسپکٹر سے) فرمایئے اب کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

انسپکٹر :معاملہ قتل کا ہے پروفیسر! ہمارا فرض ہے کہ ہم اچھی طرح چھان بین کر لیں۔

مسلم :اس میں کیا شک ہے۔ فرمایئے۔

انسپکٹر : جو تصویر مسٹر شارق نے آپ کو دی تھی کیا اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی تصویر نہیں تھی۔

مسلم : ہوگی کیوں نہیں، ضرور ہوگی۔

انسپکٹر : کیا آپ نے صرف ایک تصویر مانگی اور انھوں نے یہ تصویر دی

انسپکٹر : اور جب انھوں نے یہ تصویر دی تو آپ مشتعل ہو گئے؟

مسلم : میں مشتعل کیوں ہونے لگا؟

انسپکٹر : اس تصویر کو دیکھ کر کر آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہوگی؟

مسلم : میں نے یہ تصویر پہلی بار تو نہیں دیکھی تھی اور مجھے اس کا بھی علم تھا کہ عالیہ بیوہ ہے۔ پھر مشتعل ہونے کا کیا سوال۔

انسپکٹر : (مسلم کے پاس آتے ہوئے) مگر شارق کے نوکر کا بیان ہے کہ آپ کی مسٹر شارق کی سخت کلامی بھی ہوئی تھی۔

مسلم : ضرور ہوئی تھی۔ (انسپکٹر سوالیہ نظروں سے مسلم کو دیکھتا ہے۔) ان کا رویہ اور گفتگو توہین آمیز تھی (غصہ سے) کوئی خوددار آدمی اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

انسپکٹر : (سوچتے ہوئے) آپ نے مسٹر شارق سے روپیوں کا مطالبہ بھی کیا تھا؟

مسلم : کیسے روپیوں کا۔

انسپکٹر : وہی آپ کی ملازمہ کے جو مسٹر شارق نے رکھ لئے تھے۔

مسلم : جی نہیں، میرا ان روپیوں سے کیا واسطہ تھا۔

انسپکٹر : مگر خدیجہ بیگم کا بیان ہے کہ دوسرے دن وہ روپے آپ نے ان کو دیئے تھے؟

مسلم : وہ روپے میں نے اپنے پاس سے دیئے تھے۔ (انسپکٹر سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔) صرف انہیں اس نفسیاتی کیفیت سے نجات دلانے کے لئے جس میں وہ مبتلا ہو چکی تھیں اور ان پر جذباتی دورے پڑنے لگے تھے۔ کیا عظمت خالہ نے آپ کو نہیں بتلایا کہ وہ روپیہ انھوں نے مجھے لوٹا دیئے تھے۔

(عظمت خالہ چائے لئے ہوئے آتی ہیں اور چائے سلمٰی کے سامنے میز پر رکھ دیتی ہیں اور جانے کے لئے مڑتی ہیں کہ انسپکٹر انہیں جاتا ہوا دیکھ کر۔)

انسپکٹر : آپ کے لڑکے آپ سے ملنے کب آئے تھے۔

عظمت خالہ: بڑا تو ابھی چار دن ہوئے جب ہی تھا مگر چھوٹا کئی دن سے نہیں آیا۔

انسپکٹر : کیوں نہیں آیا؟

عظمت خالہ: اس کی نوکری ایسی ہے ٹرک پر نوکر ہے اس کے ساتھ چلا جاتا ہے تو کئی کئی دنوں میں آتا ہے۔

انسپکٹر : کیا اس کو معلوم تھا کہ شارق صاحب نے آپ کا روپیہ ہضم کرلیا ہے؟

عظمت خالہ: معلوم کیوں نہ ہوگا وہ خود ان روپیوں کی فکر میں رہتا تھا۔

انسپکٹر : جب اسے پتہ چلا ہوگا کہ وہ روپیہ شارق صاحب نے ہضم کرلیا تو اسے غصہ تو بہت آیا ہوگا؟

عظمت خالہ: بس تلملا کر رہ گیا۔

انسپکٹر : (مسلم کی طرف دیکھ کر) مسٹر شارق کی الماری سے روپیہ بھی چوری گیا ہے۔

مسلم : جی۔

انسپکٹر : جی ہاں۔ (چند سکنڈ رک کر) کیا میں مسز مسلم سے مل سکتا ہوں؟

مسلم : کیوں نہیں، ضرور ملئے، عظمت خلا، عالیہ کو یہاں بھیج دو۔

(عظمت خالہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ سلمٰی، مسلم اور انسپکٹر کو چائے دیتی ہے۔ کچھ دیر بعد عالیہ کمرے میں آتی ہے اس کے چہرے سے بیزاری ظاہر ہو رہی ہے۔ انسپکٹر اسے دیکھ کر۔)

انسپکٹر : گڈ مارننگ، آیئے۔ تشریف رکھئے۔ (عالیہ خاموش رہتی ہے۔ انسپکٹر چند سکنڈ خاموش رہ کر) آپ کے سسر عاصم مرحوم نے اپنی جائیداد آپ کے نام لکھ دی تھی۔ (عالیہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔) کیوں اس کے وارث تو مسٹر شارق تھے؟

عالیہ : ابا حضور شارق سے ناراض تھے۔

انسپکٹر : کیوں ناراض تھے؟

عالیہ : یہ مجھے نہیں معلوم وہ ان کا گھر میں آنا جانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

انسپکٹر :اس جائیداد کے سلسلے میں آپ کی اور مسٹر شارق کی مقدمے بازی بھی ہوئی تھی۔

عالیہ :مسٹر شارق نے مجھ پر مقدمہ قایم کر دیا تھا۔

انسپکٹر :اور آپ وہ مقدمہ ہار گئی تھیں؟

عالیہ :جب ہم نے پیروی ہی نہیں کی تو ہار جیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انسپکٹر :آپ نے پیروی کیوں نہیں کی تھی؟

عالیہ :(مسلم کی طرف اشارہ کر کے) یہ اس جائیداد کو حاصل کرنے کے خلاف تھے۔

انسپکٹر :مسٹر شارق آپ کی ساس کو گزارے کے لئے یہ رقم تو دیتے ہوں گے؟

عالیہ :جی نہیں۔

انسپکٹر :کبھی آپ نے ان سے مطالبہ بھی کیا؟

مسلم :جی نہیں، ہمیں ان کے روپے کی ضرورت نہیں تھی۔

انسپکٹر :(مسلم سے) معاف کیجئے گا میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔(پیالی میز پر رکھ کر دروازے کی طرف جاتا ہے پھر ایک دم مڑ کر۔) پروفیسر ایک بات اور (مسلم سوالیہ نظروں سے انسپکٹر کو دیکھتا ہے۔) آپ مسٹر شارق سے تین اور چار کے درمیان ان کے گھر پر ان سے ملے تھے۔لیکن اس کے بعد آپ قطب تارے نہیں گئے۔رات آپ نے کہیں اور گذاری۔

مسلم :جی ہاں۔

انسپکٹر :کہاں؟

سلمیٰ :(مسلم کے بولنے سے پہلے) وہ میرے ساتھ دلبر نگر گئے تھے اور رات وہیں گذاری تھی۔

انسپکٹر :دلبر نگر!

سلمیٰ :جی ہاں۔میری پوسٹنگ آج کل وہیں ہے۔

انسپکٹر :اچھا (شرارت آمیز انداز میں سلمیٰ کے چہرے پر نظریں گاڑ کر) کیوں؟

سلمیٰ :(غصہ سے) اپنی بدتمیز نگاہوں کو لگام دیجئے مسٹر انسپکٹر! دو دوستوں کے ملنے پر پابندی

نہیں ہے۔

انسپکٹر: آپ نے غلط سمجھا۔ میرا مطلب۔

سلمٰی: (بات کاٹ کر) آپ کا مطلب کچھ بھی ہو مگر ایک ذمہ دار آفیسر کو بدتمیز نہیں ہونا چاہئے۔ (انسپکٹر کوئی جواب نہیں دیتا اور خاموشی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سلمٰی ان دونوں کی طرف دیکھ کر۔) تم لوگ اس انسپکٹر کو دیکھ کر اس قدر نروس کیوں ہو جاتے ہو وہ ایک معمولی پولیس انسپکٹر ہی تو ہے عدالت کا جج تو نہیں کہ تمہیں پھانسی پر چڑھا دے گا۔

مسلم: سلمٰی تم نے غلط بیانی کیوں کی۔ یہ لوگ ایک نمبر کے......

سلمٰی: (بات کاٹ کر) ایک نمبر کے کچھ بھی ہوتے ہوں گے۔ مگر تم اس وہم میں مبتلا ہو کہ اس کی داستانیں بنیں گی، کہانیاں بنیں گی تمہاری بدنامی ہوگی۔ تم دنیا کو صورت دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ بس اور کچھ نہیں۔ (مسلم کی طرف دیکھ کر) اچھا اب جایئے اور تیار ہو کر آ جایئے۔

مسلم: نہیں سلمٰی، مجھے معاف کر دو میں کہیں نہ جا سکوں گا۔

(تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ سلمٰی کچھ دیر خاموش رہ کر)

سلمٰی: سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ اس معمولی واقعہ کو اس قدر اہمیت کیوں دے رہے ہو۔ (مسکرا کر) دیکھا نہیں میں نے دو سیکنڈ میں کیسا چلتا کیا۔ (عالیہ خاموش رہتی ہے۔ سلمٰی کچھ دیر بعد) عالیہ! جب سے میں آئی ہوں محسوس کر رہی ہوں کہ تم کچھ بجھی بجھی سی ہو۔ کالج میں تو تم ایسی نہیں تھیں۔ بات کیا ہے؟

عالیہ: (پھیکی مسکراہٹ سے) بات کیا ہوگی کچھ بھی نہیں۔ تمہارا وہم ہے۔

سلمٰی: عالیہ! تمہیں زیادہ سمجھدار ہونا چاہیے۔ مسلم جیسے لوگ جن کا علم صرف کتابوں تک محدود ہوتا ہے عملی زندگی کے حقائق کو سمجھ نہیں پاتے (کچھ دیر خاموش رہ کر) تم نے کسی لیڈی ڈاکٹر کو کنسلٹ کیا؟ (عالیہ اثبات میں سر ہلاتی ہے) پھر؟

عالیہ: اس نے کہا ایسی کوئی بات نہیں، میں صحتمند ہوں بچہ پیدا کر سکتی ہوں۔

سلمٰی : اور تم مسلم کی احمقانہ باتوں پر دھیان دے کر پریشان ہوتی ہو۔ سچ مچ کبھی کبھی بچہ خدا ہی کی دین بن جاتا ہے۔

عالیہ : (طنزیہ) مگر فلسفے اور منطق نے خدا کو بھی تو گھپلے میں ڈال دیا ہے۔

سلمٰی : (ہنس کر) اور ایک دن یہ گھپلا ختم ہو جاتا ہے۔ بہر حال سارا پروگرام ستیاناس کر دیا۔ اب تم بھی کہیں کیا جاؤ گی۔ لاؤ میں شاپنگ ہی کر آؤں۔

(سلمٰی کچھ دیر رکتی ہے اور پھر مسکراتی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ عالیہ کچھ دیر گم سم کھڑی رہتی ہے۔ مڑتی ہے کہ اس کی نظر چائے کے برتنوں پر پڑتی ہے۔ پیالیاں وغیرہ ٹرے میں رکھتی ہے انہیں اٹھاتی ہے پھر کچھ سوچ کر وہیں رکھ دیتی ہے۔ دروازے کے پاس جا کر۔)

عالیہ : عظمت خالہ۔ عظمت خالہ۔

(واپس آ کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور فکر مندانہ انداز میں دروازے کو تاکنے لگتی ہے کہ عظمت خالہ کمرے میں آ کر۔)

عظمت خالہ: آپ نے آواز دی تھی بہو بیگم۔

(ہاں۔ (چائے کے برتنوں کی طرف کر کے) یہ لے جاؤ۔

عظمت خالہ: (عالیہ کا چہرہ غور سے دیکھ کر) اب یہ موا پولیس والا کیا کہہ رہا تھا؟

عالیہ : کہے گا کیا وہی پرانا رونا رو رہا تھا۔ (سوچتے ہوئے کھڑے ہو کر) عظمت خالہ، شارق صاحب کے یہاں چوری بھی ہوئی ہے۔ (عظمت خالہ خاموش رہتی ہیں۔) آنے پر انھوں نے تمہیں دو ہزار روپئے بھی دیئے تھے؟

عظمت خالہ: (ہنس کر) کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ روپئے مسلم میاں نے چرائے ہوں گے۔ شارق میاں کا وہ ہمزاد کم بخت رشیدا کیا کم ہے موقع غنیمت جان کر اسی نے ہاتھ صاف کر دیا ہوگا۔

عالیہ : (سوچتے ہوئے) مگر اسی رات وہ ہوٹل میں بھی نہیں رہے۔

عظمت خالہ: کون؟ مسلم میاں؟ (عالیہ اثبات میں سر ہلاتی ہے) نہیں رہے ہوں گے کوئی دوست مل گیا ہوگا اس کے گھر چلے گئے ہوں گے۔

عالیہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں ڈاکٹر سلمٰی بھی ان کی دوست ہیں وہ رات انھوں نے دلبر نگر میں انہیں کے ساتھ گزاری تھی۔

عظمت خالہ : ڈاکٹرنی کے ساتھ!

عالیہ : ہاں۔ یہ بات خود سلمٰی نے انسپکٹر سے کہی تھی (کھڑکی کی طرف جاتی ہے پھر مڑ کر عظمت خالہ کو جو گہری سوچ میں ہیں۔) شاید سلمٰی انہی کی دعوت پر یہاں آئی ہے

عظمت خالہ : مگر وہ تو اتفاق سے آپ کو راستے میں مل گئی تھیں۔

عالیہ : (ٹھنڈی ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں اگر مجھے نہ ملتی تو انہیں اتفاقیہ مل جاتی۔ (شکست خوردہ لہجے میں) کیا میری زندگی میں قدم قدم پر ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہیں۔ آخر ان ٹھوکروں کا انجام کیا ہوگا؟

عظمت خالہ: (سوچتے ہوئے) مگر مسلم میاں ایسے ہیں تو نہیں۔

عالیہ : پرانی دوستیاں اکثر بڑی عمر میں رنگ لاتی ہیں عظمت خالہ۔ (سوچتے ہوئے) اب تو مجھے ہر حالت میں نوکری کرنا ہی ہوگی۔

عظمت خالہ: اتنی جلدی کچھ نہ سوچو بہو بیگم۔ اتنی جلدی کچھ نہ سوچو۔

عالیہ : مگر عظمت خالہ (خلاء میں گھورتے ہوئے) میری خوشی کا سورج بادلوں کی اوٹ میں ہی کیوں مسکراتا ہے۔ کیا میری تدبیروں کو میری تقدیر ہمیشہ مات دیتی رہے گی۔

(عالیہ رونے لگتی ہے۔ عظمت خالہ مادرانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے۔ عظمت خالہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر۔)

عظمت خالہ: بیٹی اپنے آپ کو سنبھالو۔ زندگی کا سفر بہت لمبا ہوتا ہے۔ اس کے فیصلے یوں سرسری طور پر نہیں کئے جاتے۔

(عالیہ برابر ہچکیوں سے روتی رہتی ہے۔)

......**پردہ**......

تیسرا سین

منظر :وہی کمرہ...... **پندرہ دن بعد**

(مسلم جھنجھلاہٹ کے انداز میں کمرے میں ٹہل رہا ہے۔اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈسٹرب ہے۔عالیہ کھڑکی کے پاس کھڑی باہر دیکھ رہی ہے اس کی پیٹھ کمرے کی طرف ہے۔کچھ دیر کمرے میں خاموش رہتی ہے۔مسلم عالیہ کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے پھر آہستہ سے۔)

مسلم : عالیہ!(عالیہ تھکے تھکے انداز سے مڑ کر مسلم کو دیکھتی ہے۔دونوں اس طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں جیسے خود کو مجرم سمجھ رہے ہوں۔کچھ دیر دونوں خاموش رہتے ہیں پھر مسلم آہستہ سے) عالیہ! خدارا مجھے یوں ذلیل نہ کرو کہ میں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔

عالیہ :اس میں ذلیل ہونے کی کون سی بات ہے میں نوکری کر رہی ہوں کوئی جرم تو نہیں۔

مسلم :اور ایک معمولی مسٹریس کی۔عالیہ میں پہلے ہی بہت ذلیل ہو چکا ہوں۔

عالیہ :(آہستہ آہستہ صوفے کی طرف جاتے ہوئے) آپ کی ساری مصیبتیں واقعی میرے وجہ سے پیدا ہوئی ہیں، مجھے اس سے انکار نہیں۔(صوفے کے پاس پہنچ کر مڑتی ہے اور مسلم کو دیکھ کر) امی میری کمزوری ہیں۔میں ان سے جدا نہیں ہو سکتی۔اس کے لئے

اسکول مسٹریس تو کیا معمولی مزدورنی بننا پڑے تو بن جاؤں گی۔

مسلم :(عالیہ کے قریب جاتے ہوئے) تمہاری طرح امی میری بھی کمزوری ہیں۔ اب میں خود ان سے الگ نہیں رہ سکتا۔ (عالیہ خاموش رہتی ہے۔ مسلم کچھ دیر خاموش رہ کر) عالیہ! بعض وقت کسی کا کوئی غیر ذمہ دارانہ بیان، کسی کے غیر محتاط الفاظ دوسروں کی زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔ (عالیہ اب بھی خاموش رہتی ہے) بخدا میں نے کوئی رات ڈاکٹر سلمٰی کے گھر نہیں گزاری سلمٰی نے محض انسپکٹر کو ٹالنے کو ایسا کہہ دیا تھا۔

عالیہ :اگر آپ نے گزاری بھی تو میں نے شکایت تو نہیں کی۔

مسلم :رات میں نے پروفیسر کرمانی کے یہاں گزاری تھی۔ تمہیں اس کا ثبوت شاید آج ہی مل جائے۔

عالیہ :(چڑ چڑے انداز میں) میں آپ سے ثبوت طلب نہیں کر رہی ہوں۔ (دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے۔ طنزیہ لہجے میں) ڈاکٹر سلمٰی محض اتفاقیہ چھٹیاں گزارنے یہاں چلی آئی تھی۔

مسلم :(کسی قدر سخت لہجے میں) عالیہ! (عالیہ رک جاتی ہے اور مڑ کر مسلم کو دیکھتی ہے) تم سمجھتی ہو کہ میں اسے مدعو کر کے آیا تھا (عالیہ خاموش رہتی ہے مسلم کچھ دیر خاموش رہ کر) عالیہ! بعض اوقات اتفاقات، حادثات اور غلط فہمیاں زندگی کا المیہ بن جاتی ہیں۔ اچھا ہے کہ کل آنے والی شرمندگی کو ہم آج ہی محسوس کر لیں۔

عالیہ :(طنزیہ) ایک منطق کا پروفیسر۔

مسلم :(غصہ سے بات کاٹ کر) عالیہ! میں لفظ پروفیسر کے اس طرح استعمال کئے جانے کو اپنے لئے گالی سمجھتا ہوں۔ (عالیہ کے چہرے پر کچھ شرمندگی اور کچھ گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوتے ہیں مسلم چند سیکنڈ رکتا ہے پھر تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) کچھ بھی ہو تم یہ نوکری جوائن نہیں کرو گی۔

(جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے عالیہ شکست خوردہ سی کمرے میں کھڑی رہ جاتی ہے۔ کچھ دیر اس طرح بے حس و حرکت کھڑی رہتی

ہے جیسے اس کے بدن میں جان نہ ہو کہ عظمت خالہ کمرے میں آ کر۔)

عظمت خالہ: بہو بیگم! (عالیہ اس طرح ایک دم چونک پڑتی ہے جیسے وہ کسی ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوئی ہو پھٹی پھٹی آنکھوں سے عظمت خالہ کو دیکھنے لگتی ہے۔ پہلے تو عظمت خالہ خاموشی سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگاتی ہیں پھر آہستہ سے) کیا بات ہے بہو بیگم۔ عالیہ خاموش رہتی ہے۔ مسلم میاں بہت غصہ میں تھے۔

عالیہ: (ایک دم پاگلوں کے انداز میں چیخ کر) ہوں گے۔ رہنے دو۔ میں نوکری کروں گی، کرونگی اور ضرور کرونگی (اس قدر تیزی سے صوفے کی طرف جاتے ہوئے جیسے اس کے جسم میں برقی قوت پیدا ہوگئی ہو) آخر سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں نادان بچی ہوں۔

عظمت خالہ: (سہمے ہوئے لہجے میں) مگر بہو بیگم۔

عالیہ: (بات کاٹ کر اپنی ہی رو میں) کیا میں اتنا نہیں جانتی کہ کوئی عورت ہرگز یہ الزام اپنے سر نہیں لے سکتی کہ کسی غیر مرد نے رات اس کے ساتھ گزاری تھی۔

(صوفے پر اس طرح گر جاتی ہے جیسے تھک گئی ہو۔ عظمت خالہ چند سیکنڈ کھڑی رہتی ہیں پھر کونے میں رکھے ہوئے اسٹول کے پاس جا کر صراحی سے گلاس میں پانی لیتی ہے اور عالیہ کے پاس آ کر۔)

عظمت خالہ: لو ایک دو گھونٹ پانی پی لو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لو پی لو۔

(جبراً گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیتی ہے۔ عالیہ مجبوراً گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر ایک دو گھونٹ پیتی ہے اور گلاس سامنے میز پر رکھ کر کھوئے کھوئے انداز میں سامنے دیوار کو تکنے لگتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر)

عالیہ: عظمت خالہ! پالا پڑتا ہے تو درخت جھلس جاتے ہیں، تیز ہوائیں چلتی ہیں تو بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں عظیم الشان عمارتیں کھنڈر بن جاتی ہیں، برق گرتی ہے تو ہر چیز خاک ہو جاتی ہے مگر میرا دل جانے کس مٹی کا بنا ہے کہ دھڑکنا بند نہیں کرتا۔

عظمت خالہ: (اس طرح مسکرا کر جیسے بات کو مذاق میں ڈالنا چاہتی ہوں۔) بہو بیگم میں نے تو مولوی اسماعیل کی تین کتابیں پڑھی ہیں ان باتوں کو کیا سمجھوں۔

عالیہ : ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا ہے عظمت خالہ اگر زیادہ پڑھ لیتیں تو موت اور زندگی کے درمیان صلیب پر لٹکی رہتیں۔

عظمت خالہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) بہو بیگم ابھی کچھ دن خاموش رہو شارق میاں کے بکھیڑے کی وجہ سے مسلم میاں کا جی قابو میں نہیں ہے۔ ان کے دل کو قابو میں ہو جانے دو پھر نوکری بھی کر لینا۔

عالیہ : (کچھ دیر عظمت خالہ کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہتی ہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) آخر کو تم نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔

عظمت خالہ: نہیں بہو بیگم نہیں۔ مسلم میاں نے مجھ سے قسمیں کھا کر کہا ہے کہ ڈاکٹرنی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

عالیہ : جب دھوپ نظر آ رہی ہو تو کیسے یقین کر لوں کہ سورج نہیں نکلا ہے ان کا خیال ہے کہ میں ان سے محبت نہیں کرتی، امجد کے خیالوں میں ڈوبی رہتی ہوں، میں بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ کیا یوں زندگی بسر ہو جائے گی۔

عظمت خالہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) بہو بیگم تم ایسا کرو (چند سیکنڈ رکتی ہیں پھر) کچھ دن کے لئے میرے یہاں مہمان بن کر رہو۔

عالیہ : (حیرت سے) آپ کا گھر؟

عظمت خالہ: ہاں۔ چھوٹے کا تو کہہ نہیں سکتی مگر بڑا غریب ضرور ہے مگر دل چھوٹا نہیں اس کی بھی عزت ہو جائے گی اور تمہارا ماحول بھی تبدیل ہو جائے گا۔

عالیہ : شکریہ عظمت خالہ (ٹھنڈی سانس بھر کر) کھڑکیوں کا رخ بدل دینے سے طوفان نہیں رک جاتے۔

عظمت خالہ: تو پھر میں کچھ دن کے لئے دلہن بیگم کو لئے جاتی ہوں۔ پھر تم۔

عالیہ : (بات کاٹ کر) عظمت خالہ۔ امی میری زندگی ہیں۔ وہ میرے ساتھ ہی رہیں گی۔

عظمت خالہ: ضرور تمہارے ساتھ رہیں گی چند دن میں کہاں کا فرق پڑ جاتا ہے؟

عالیہ : (پرعزم لہجے میں) یہ میری ہار ہوگی عظمت خالہ۔ میں ایک منٹ کے لیے انہیں جدا

نہیں کر سکتی چاہے مجھے یہ گھر ہی۔

عظمت خالہ : (ایک دم بات کاٹ کر) بس بہو بیگم اس سے آگے ایک لفظ نہ کہنا۔ (چہرے پر غصہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔) میں نے بھی اسی گھر کا نمک کھایا ہے اور مجھے بھی غصہ آسکتا ہے ابھی تم نے عظمت کا غصہ نہیں دیکھا۔

عالیہ : (کسی قدر سہمے ہوئے لہجے میں) مگر عظمت خالہ؟

عظمت خالہ: (پھر بات کاٹ کر) بہو بیگم میں پاگل اور دیوانی نہیں ہوں۔ تم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کچھ دن بالکل اکیلے رہو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں کچھ دن کے لئے دلہن بیگم کو ضرور لے کر جاؤں گی۔

عالیہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں عظمت خالہ۔ جب میرے خون کے قطروں کی لوٹ مچی ہو تو تم کیوں پیچھے رہو۔ تم بھی لوٹو۔

عظمت خالہ: زندگی میں کچھ سوچنا سمجھنا بھی چاہیے بہو بیگم! صرف۔ (کال بیل کی آواز۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے۔) جانے اب کون آن مرا۔ (عظمت خالہ کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ عالیہ صوفے پر اس طرح بیٹھ جاتی ہے جیسے اس کی زندگی میں کچھ باقی نہ رہا ہو۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا شخص عظمت خالہ کے ساتھ کمرے میں آتا ہے۔ بوڑھے کے سر کے بال برل کی طرح سفید اور الجھے ہوئے ہیں۔ لباس کی طرف سے اس قدر لاپروائی برتی ہے کہ اچھا خاصا سرکس کا مسخرہ نظر آ رہا ہے۔ کمرے میں آتے ہی گرجدار آواز میں)

بوڑھا : کہاں ہے وہ مسخرا؟ (عالیہ ایک دم گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور حیرت زدہ سی بوڑھے کو دیکھنے لگتی ہے۔) کتاب لکھی ہے کہ جھک مارا ہے۔ (عظمت خالہ کی طرف دیکھ کر) اے بڑھیا بلا کر لا اس نامعقول ابن آدم کو۔

عظمت خالہ: جی آپ؟

بوڑھا : کہنا۔ پروفیسر کرمانی آیا ہے۔

عالیہ : (گھبرا کر) آپ پروفیسر کرمانی!

کرمانی : کیا میں تمہیں گھوڑا نظر آرہا ہوں۔ (عظمت خالہ کی طرف دیکھ کر) اے بڑھیا بلا اس نامعقول ابن آدم کو۔

کرمانی : (عظمت خالہ کی طرف دیکھ کر) تو ابھی تک گئی نہیں بوڑھیا۔ (عظمت خالہ گھبرا کر تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہیں۔ کرمانی اپنا چشمہ جو ناک پر ذرا نیچے کھسک آیا ہے انگلی سے اوپر کھسکاتے ہوئے عالیہ سے) اور میڈم آپ کون سی مخلوق ہیں جو گلہری کی طرح ٹھوٹھنی آگے بڑھا بڑھا کر باتیں کر رہی ہیں۔

عالیہ : جی۔ میں۔ میں،

کرمانی : لاحول ولا قوۃ۔ ایک جملہ پورا نہیں ہوا اور دو مرتبہ۔ میں۔ میں۔ ہو گیا۔ میں کے علاوہ بھی اس دنیا میں بہت کچھ ہے۔

عالیہ : (سہمے ہوئے لہجے میں) مجھے عالیہ کہتے ہیں۔

کرمانی : (بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کرتے ہوئے) گڈ۔ گڈ۔ بہت اچھا نام ہے۔ (مسلم تیزی سے کمرے میں آتے ہوئے)

مسلم : آپ کا تار کل ملا تھا۔ آپ نے۔

کرمانی : (مڑ کر مسلم کو دیکھ کر) بخدا تم نے اپنی کتاب میں پروفیسر کرمانی کی ناک کاٹ لی ہے اور چاہتے ہو کہ میں اس کی تعریف کروں۔

مسلم : لیکن اس دن تو آپ نے۔

کرمانی : (بات کاٹ کر عالیہ کی طرف اشارہ کر کے) یہ عورت تمہاری کون ہے؟

مسلم : میری شریک حیات عالیہ ہے۔

کرمانی : لاحول ولا قوۃ۔ (ہنستا ہے) شریک حیات۔ سیدھے سادے طریقے سے بیوی نہیں کہہ سکتے۔ (عالیہ کی طرف دیکھ کر) ادھر آؤ میں تمہاری پیشانی چوموں گا۔ (عالیہ گھبرا جاتی ہے۔ کرمانی مسلم کی طرف دیکھ کر) اور اس روز مجھے بلا اطلاع دیئے کیسے

چلے آئے تھے؟

مسلم : رات تین بجے تک آپ نے میری کتاب پر تبادلۂ خیال کیا تھا۔ پھر میں نے آپ کے آرام میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔

کرمانی : خیر خیر کوئی بات نہیں۔ مگر کرمانی اسے سعادت مندی نہیں سمجھتا کہ تم اس کے آرام کی خاطر اس سے ملاقات نہ کرو۔ (ایک دم دروازے کی طرف دیکھ کر) میرا بیگ کہاں ہے؟ وہ بڑھیا۔

مسلم : میں منگواتا ہوں۔ (دروازے کے پاس جاکر) عظمت خالہ۔ (عظمت خالہ دوسرے دروازے سے کمرے میں آتی ہیں ان کے ہاتھ میں بیگ ہے مسلم ان کے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر) یہ رہا آپ کا بیگ۔ (عظمت خالہ کے پاس جاکر بیگ لیتا ہے۔)

عظمت خالہ: (آہستہ سے) مسلم میاں! وہ پولیس والا پھر آیا ہے۔

مسلم : پولیس والا۔ کہہ دو مجھے اس وقت فرصت نہیں ہے۔

عظمت خالہ: میں نے کہا تھا ابھی ابھی مہمان آئے ہیں اور آپ مصروف ہیں مگر وہ ابھی ملنا چاہتا ہے۔

مسلم : آپ نے کہہ دیا ہوتا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ (عظمت خالہ چپ رہتی ہیں۔ مسلم چند سیکنڈ بعد) اچھا اسے یہیں بھیج دو۔ (عظمت خالہ باہر چلی جاتی ہیں۔ مسلم پروفیسر کرمانی سے) آپ تھک گئے ہوں گے دوسرے کمرے میں چل کر آرام فرمالیجئے۔

کرمانی : کیا میں پیدل چل کر آیا ہوں جو تھک گیا ہوں۔ (بیگ کی طرف اشارہ کر کے) اس میں تمہاری کتاب کا مسودہ رکھا ہے اور ازراہ حماقت میں نے اس پر مقدمہ بھی لکھ دیا ہے۔

مسلم : شکریہ (مسلم کے چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں کہ انسپکٹر کمرے میں آتا ہے۔ مسلم روکھے لہجے میں۔) فرمائیے۔

انسپکٹر : (مسکرا کر) مسٹر پروفیسر! قاتل گرفتار ہو گیا ہے۔

مسلم : گرفتار ہو گیا ہے۔ کون ہے وہ۔

انسپکٹر :شاید اس کا نام سن کر آپ کو تکلیف ہوگی۔ وہ آپ کی ملازمہ کا چھوٹا لڑکا ہے۔

عالیہ :(حیرت سے) عظمت خالہ کا لڑکا؟

انسپکٹر :جی ہاں۔

عالیہ :مگر اس نے قتل

کرمانی :کرنے دو قتل، کرنے دو، بہت سے قاتل چھوٹ جاتے ہیں۔

انسپکٹر :(کرمانی کی بات پر دھیان نہ دے کر) مسٹر پروفیسر! مجھے امید ہے کہ آپ بڑی بی کو اس وقت تک شہر سے باہر نہ جانے دیں گے جب تک پولیس تحقیقات مکمل نہ کر لے۔

......پردہ......

دوسرا کنارا

• غلام جیلانی

کردار

ارون	: چوبیس پچیس برس کا خوبرو نوجوان
آشا	: خوبصورت اور معصوم خدوخال کی لڑکی
پجاری	: ادھیڑ عمر، لمبا قد، مضبوط اور گٹھا ہوا جسم، سر پر لمبی لمبی جٹائیں
رگھو	: گٹھا ہوا بدن، چہرے اور آنکھوں سے روشنی نمایاں، لمبی لمبی نوکدار مونچھیں، عمر کوئی پینتیس برس
ملاح	: ادھیڑ عمر کا دیہاتی۔ کانوں میں بالیاں پہنے رہتا ہے
پاگل	: کمزور جسم اور معصوم چہرے والا نوجوان۔ آنکھوں سے وحشت برستی ہے۔ سر کے بال لمبے اور بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے
مراری	: درمیانی عمر اور کمزور جسم والا ایک بیوپاری چہرہ سے ہوشیاری جھلکتی ہے۔
بوڑھا	: گاؤں کا ایک کمزور بوڑھا
زمانہ	: یہی آج کل

پہلا سین

پردہ بہت آہستہ آہستہ اٹھتا ہے،اس دوران میں پس منظر سے بادوباراں کے کسی بھیانک طوفان کے صوتی اثرات سنائی دیتے ہیں،وقفہ وقفہ سے بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سنائی دیتی رہتی ہے۔ پردہ اٹھنے پر اسٹیج بہت مدھم روشنی میں لپٹا نظر آتا ہے،سامنے دور تک گھنے درخت اور چٹانیں پھیلی ہوئی ہیں، جن کے آگے اسٹیج پر دو ایک بڑے بڑے پتھر،جھاڑیاں اور ایک درخت کا تنا نظر آتا ہے۔زمین پر درخت سے ٹوٹی ہوئی شاخیں اور پتے بکھرے پڑے ہیں۔

اسٹیج کے وسط میں آشا زمین پر بے حس وحرکت پڑی ہے۔ برابر ہی ارون بیٹھا ہے اور رومال سے آشا کی ایک ہتھیلی گرمارہا ہے۔چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ہیں،آشا کے جسم پر معمولی قسم کی ساڑی اور چادر ہے اور ارون پتلون قمیص اور کوٹ پہنے ہوئے ہے۔دونوں کے کپڑے بارش اور کیچڑ میں بھرے ہوئے ہیں۔ہاتھوں اور چہروں پر بھی کیچڑ کے دھبے نظر آرہے ہیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر سے بجلی کوندتی ہے تو اسٹیج سیٹنگ لمحہ بھر کے لیے واضح طور پر نظر آجاتی ہے لیکن پھر مدھم اجالے میں ڈوب جاتی ہے)

ارون : آشا کو جھنجھوڑتے ہوئے) آشا.....آشا.....دیکھو،آنکھیں کھولو،

آشا : (سہمی ہوئی آواز میں): ہوں.....کون؟ (آہستہ سے) ارون (چیخ کر) ارون!
(اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ خوف سے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے)

ارون :ہاں.....ہاں.....ڈرومت—— میں ہوں.....گھبراؤ نہیں۔

آشا :تم.....تمہیں کچھ ہوا تو نہیں؟.....ارون تم——؟

ارون :(آشا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) مجھے کچھ نہیں ہوا.....نہ تمہیں کچھ ہوا ہے.....بس ڈر گئی ہو تم.....دیکھو تو.....یہ میں رہا۔ اور یہ تم.....دیکھو تو!

آشا :(چہرہ اٹھا کر ارون کو دیکھتی ہے) تو وہ گاڑی جو.....

ارون :الٹ گئی تھی۔ مگر بھگوان کا شکر ہے ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ ہم کیچڑ میں گر پڑے تھے.....مگر وہ بیل نہ بچ سکا

آشا : میں ڈر گئی ہوں ارون .....اف! کس قدر خوفناک .....کتنا ڈراونا۔ (ارون کے کاندھے پر سر رکھ دیتی ہے)

ارون :(آشا کو دلاسہ دیتے ہوئے) کچھ بھی تو نہیں۔ بارش اور اندھیرے میں گاڑی اس کھائی میں اتر گئی تھی .....مگر ہمیں چوٹ نہیں آئی۔ تم ڈر کے بے ہوش ہو گئی تھیں.....پھر میں تمہیں یہاں اس درخت کے نیچے لے آیا.....بارش سے بچنے کے لیے.....

آشا :(کاندھے سے سر اٹھا کر) مجھے بہت سردی لگ رہی ہے.....اس اندھیرے میں تو کچھ نظر بھی نہیں آ رہا ہے.....اف! کس زور کا طوفان ہے!.....(پس منظر میں زور کی کڑک اور گرج سنائی دیتی ہے ساتھ ہی بجلی کے کوندنے پر اسٹیج ایک لمحہ کے لیے روشن ہو کر رہ جاتا ہے)

ارون :اب ہم گھاٹ کے قریب ہی ہیں.....ہمت سے کام لو
(دونوں اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں)

آشا :مگر وہاں کشتی مل جائے گی؟

ارون :مل تو جائے گی.....پر ندی چڑھاؤ پر ہو گی.....اس اندھیری رات——!

آشا :نہیں، نہیں ارون، ہمیں اس پار تو پہنچنا ہی ہے.....چاہے کچھ ہو.....کسی حالت

میں......اوہ بھگوان!

ارون : (قریب آکر) گھبرانے سے کام نہ چلے گا۔آؤ...... میرے اور پاس آجاؤ(آشا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے)......تم کس قدر کانپ رہی ہو...... ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے ہیں...... ایسے کام نہیں چلے گا آشا!

آشا : سچ مچ میں بہت گھبرا گئی ہوں۔جس وقت سب گھبرا جاتے ہیں مجھے ذرا بھی ڈر نہیں لگا تھا......مگر اب......اوہ یہ رات اتنی اندھیری کیوں ہے؟

ارون : آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں——طوفان آیا ہوا ہے۔

آشا : اب کیا بجا ہوگا؟

ارون : ٹھہرو دیکھتا ہوں......(جیب سے دیا سلائی نکال کر سلگاتا ہے اور ہاتھ پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتا ہے)نو بج چکے ہیں۔

آشا : سات بجے ہم گھر سے نکلے تھے!......ہمیں اب تک تو وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا!......ندی پار کر لینی چاہیے تھی......کہیں وہ لوگ......وہ لوگ یہاں نہ پہنچ جائیں......(سہم کر)ارون......بھگوان(رونے لگتی ہے)

ارون : دیکھو آشا۔اس طرح تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا...... اب اتنی دور نکل آنے کے بعد ڈرنا کیسا!...... وہ لوگ یہاں نہ آسکیں گے......اس وقت،اس طوفانی رات میں......اب وہ ہم تک کبھی نہ پہنچ سکیں گے......!

آشا : اس طوفان کو بھی آج ہی آنا تھا!

ارون : جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا......ہم ابھی کچھ دیر ندی پار کر لیں گے(اسٹیج پر اجالا کچھ زیادہ ہو جاتا ہے)

آشا : ندی میں باڑھ ہو تو......؟

ارون : کوئی بات نہیں،یہاں کا ملاح بہت ہوشیار اور تجربہ کار ہے۔

آشا : اس نے انکار کر دیا تو——؟

ارون : میرے پاس ایک بھرا ہوا پستول موجود ہے......

آشا : نہیں... نہیں ارون یہ سب نہیں... (سسکیاں لینے لگتی ہیں)

ارون : آشا!——

آشا : (رک کر) تو پھر جلدی کرو نا... کہیں وہ لوگ... ان کے پاس بندوقیں ہیں——!

ارون : دیکھو مجھے اس جگہ کا کچھ کچھ پتہ ہے... آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے البتہ گھاٹ کے پاس ہی ایک پرانا مندر ہے... مندر کبھی تھا۔ اب تو کھنڈر رہ گیا ہے۔ وہاں کوئی بڈھا پجاری بھی رہتا ہے اور شام کے وقت ملاح ندی کے اس طرف وہیں آجاتا ہے... ہم بھی وہیں چلیں گے۔

آشا : مگر مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔

ارون : تم میرا کوٹ پہن لو (کوٹ اتار کر آشا کو دینا چاہتا ہے۔ آشا انکار کرتی ہے) نہیں، نہیں... یہ نہیں ہوگا... یہ تمہیں پہننا ہی پڑے گا۔

آشا : اور تم... ؟

ارون : مجھے چھوڑ دو... تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے... چلو اب جلدی پہن لو...... (آشا کوٹ پہننے لگتی ہے) دیکھو، تم ابھی کانپ رہی ہو...... ہاں اب ٹھیک ہے...... یوں تو سارا کوٹ بھی بھیگا ہوا اور کیچڑ میں بھرا ہوا ہے.......... مگر پھر بھی ٹھیک ہی ہے... چلو اب میرا ہاتھ پکڑ لو...... میرے پیچھے چلی آؤ۔

آشا : (اسی جگہ ٹھہری رہتی ہے) مگر اس اندھیرے میں وہاں کا پتہ کیسے چلے گا؟

ارون : وہاں ایک پرانا پیپل کا درخت ہے۔ بہت بڑا... تم چلی آؤ...... مجھے سمت کا اندازہ ہے۔

آشا : (ایک قدم بڑھا کر پھر رک جاتی ہے) ارون! جانے کیوں میرا دل اس قدر بیٹھا جارہا ہے...... ڈر لگ رہا ہے! کہیں بھگوان کو ہم پر غصہ تو نہیں آگیا——؟

ارون : آشا!—— کیا اپنی محبت پر بھروسہ نہیں؟—— پگلی کہیں کی!

آشا : شائد ہم سے کوئی گناہ ہوگیا ہے۔

ارون : گناہ!—— سنو آشا! ہماری محبت پر تو بھگوان کو بھی ناز ہوگا۔ وہ جانتا ہے ہم نے آج

تک کیسی پاک اور سچی محبت کی ہے!......اسی کے آگے اس دن ہم نے سوگند کھائی تھی ......اور اب اسی کو پورا کرنے جا رہے ہیں...... بتاؤ آشا کیا وہ ہماری مدد نہیں کرے گا؟

آشا :مگر اس طرح میرا تمہارے ساتھ چلے آنا، کہیں پاپ تو نہیں؟

ارون :بے وقوف نہ بنو آشا کیا وہ ساری باتیں پھر شروع سے سمجھانی پڑیں گی؟

آشا :(بھرائی ہوئی آواز میں) پھر......آج کی رات یہ بادل، یہ بارش، اتنا بڑا طوفان کیوں——؟

ارون :یہ سب ہمارے سوچنے کی باتیں نہیں......سنو۔ ہم زندہ رہیں گے تو ساتھ......مریں گے بھی تو ساتھ!......اگر آج کی رات ہمیں مرنا ہی ہے تو......تو کوئی بات نہیں۔ ہیر رانجھا اور سوہنی مہیوال کے ساتھ ہمارا قصہ بھی مشہور ہو جائے گا (پھیکی ہنسی ہنستا ہے) چلو اپنا دل مضبوط رکھو..........سب کچھ تو ہو چکا، اب ڈر کس چیز کا!......میرے پاس آؤ......اور پاس (آشا قریب آجاتی ہے) ہاں اب دیکھو......میری آنکھوں میں......

[ارون دھیرے سے آشا کا چہرہ اوپر اٹھاتا ہے......دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں ....ساتھ ہی باہر بجلی کوندتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے سارا اسٹیج روشنی میں جگمگا اٹھتا ہے......بادلوں کی گرج دیر تک سنائی دیتی رہتی ہے۔ آشا کا ہاتھ تھامے ارون آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگتا ہے..........

[پردہ گرجاتا ہے]

دوسرا منظر

ایک پرانے کھنڈر نما مندر کا بیرونی دالان دائیں بائیں بوسیدہ سے ستون، فرش پر جگہ جگہ پتھر اکھڑ چکے ہیں اور ان کے ٹوٹے ٹکڑے، ریت اور کیچڑ میں بھرے ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ عقبی حصے میں تین چار ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں نظر آتی ہیں۔ جن کے اوپر ڈوری سے ایک گھنٹہ آویزاں ہے جو ہوا کے تیز جھونکوں سے تھوڑی دیر میں بج اٹھتا ہے۔ ایک طرف ستون کے پاس دو تین جلتی ہوئی لالٹین اور لاٹھیاں رکھی ہیں۔ دالان کے بیچ میں آگے کی طرف لوہے کی ایک پرانی انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے ہیں جس کے پاس پجاری اور ملاح بیٹھے ہاتھ سینک رہے ہیں۔ ان سے کچھ دور ہٹ کر عقبی سیڑھیوں کے پاس چار آدمی اور بیٹھے نظر آتے ہیں۔ یہ رگھو، مراری، پاگل اور بوڑھا ہیں، پجاری نے جسم پر ایک سفید چادر لپیٹ رکھی ہے اور ملاح کے جسم پر صرف ایک دھوتی اور واسکٹ ہے۔ سر کے بال الجھے ہوئے ہیں۔

(پردہ اٹھنے پر بادوباراں کے وہی پچھلے صوتی اثرات پس منظر سے پھر ابھرتے ہیں، بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج بھی سنائی دیتی رہتی ہے باہر زور کی بارش ہو رہی ہے)

پجاری : (گرجدار آواز میں) معلوم ہوتا ہے آج کی رات طوفان آ کر پھر کبھی نہ آئے گا!

ملاح : کیسی خوفناک رات ہے— ایشور تو اپنی کرپا کر (بادل کی گرج زور سے سنائی دیتی ہے)

پجاری : باہر پیپل پر روحیں چیخ رہی ہیں، رو رہی ہیں..... سنو، ان کی آوازیں کیسی دردناک ہیں!

ملاح : رہنے دو پجاری، ان کا نام نہ لو..... یہ بھیانک کھنڈر ہی کیا کم ہیں!..... یہاں تو الو اور چمگادڑیں بھی نہیں رہتیں!..........اور تم نے اس کا نام مندر رکھ چھوڑا ہے —— دیوی کا مندر!

پجاری : (غضبناک لہجہ میں) چپ رہو!..... بے وقوف ملاح، اس وقت بھی دیوی سے نہیں ڈرتے؟

ملاح : بس یہ آخری رات ہے۔ آج کے بعد پھر کبھی ادھر نہ آؤں گا..... کہیں اور جگہ دیکھ لوں گا گھاٹ پر۔ مجھے تو اس کھنڈر کے خیال ہی سے ہول آتا ہے!.....
ندی چڑھاؤ پر نہ ہوتی تو ابھی چلا جاتا..... مگر آج تو..... اف! کیا بلا کا اندھیرا ہے!..... یہ آگ کیوں بجھی جا رہی ہے؟..... اتنے کوئلے تو ڈال رکھے ہیں! (انگھیٹی ہلا کر کوئلے کو درست کرتا ہے)

پجاری : عقب میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر، زور سے) تم لوگ بھی یہیں آگ کے پاس کیوں نہیں آ جاتے؟ وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟

بوڑھا : (وہیں سے جواب دیتا ہے)۔ کرتے کیا، قسمت کو رو رہے ہیں.....

(بوڑھا، رگھو اور مراری اٹھ کر انگھیٹی کے اطراف بیٹھ جاتے ہیں۔ بوڑھا دھوتی اور کھدر کا کرتا پہنے ہوئے ہے، رگھو کے جسم پر سفید دھوتی، قمیص اور کالا کوٹ ہے اور مراری کے سر پر مارواڑی وضع کی پگڑی بندھی ہے.....)

پجاری : (ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے طنز سے) قسمت کو رو رہے ہیں!..... (رک کر) اور وہ کون رہ گیا ہے؟ —— وہ کیوں نہیں آتا.....

بوڑھا : وہ پاگل ہے، عجیب بے تکی باتیں کر رہا ہے!

پجاری : کیا بکتا ہے؟

بوڑھا : کہتا ہے، کئی دن سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں.....

پجاری : خواب!(گرجدار ہنسی ہنستا ہے) ......پاگل کا خواب!......(باہر سے بادل گرجتے ہیں)

بوڑھا : وہ کیا دیکھتا ہے جیسے ایک بہت بڑا طوفان آیا ہوا ہے، بہت ہولناک! ہر طرف پانی ہی پانی، اندھیرا اور کیچڑ ....اور درختوں اور پرندوں کی لاشیں......اوہ! بالکل ایسا ہی ......ایسا ہی......

ملاح : (درمیان میں) جیسا آج رات آیا ہوا ہے؟

بوڑھا : ہاں جیسا آج رات آیا ہوا ہے......اور پھر اسی طوفان میں وہ اسے پکڑ کر لے جاتی ہے ......

پجاری : کون پکڑ کر لے جاتی ہے؟

بوڑھا : ــــــ اس کی منگیتر! پچھلی مرتبہ جب ندی میں باڑھ آئی تھی تو وہ اس میں بہہ گئی تھی ...... جب سے وہ پاگل ــــــ وہ اس سے پیار کرتا تھا......کہتا ہے اس کا خواب سچا ہے، آج وہ اپنی منگیتر کے پاس چلا جائے گا۔

(سب لوگ چپ چاپ، ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں چند سیکنڈ یہ بھاری خاموشی رہتی ہے)

رگھو : (بھاری آواز میں) میں کہتا ہوں ملاح مان جا۔ میں تمہیں پچاس روپے دوں گا۔ مجھے کسی طرح اس پار لے چلو۔

ملاح : اس وقت کوئی ندی کے پاس بھی نہیں جا سکتا......بابو جی۔

رگھو : مگر میرا پار جانا بہت ضروری ہے......(اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے)......بہت ضروری ہے! نہیں تو......اوہ!......آج کی رات مجھے......

پجاری : تم کون ہو؟

رگھو : میں ــــــ (رک کر) میرا نام رگھو ہے!

ملاح اور پجاری: (چونک کر) رگھو!......رگھو ڈاکو......

رگھو : ہاں، میں ہی رگھو ڈاکو ہوں اور یہ دیکھو میرے پاس سو روپے کے نوٹ بھی ہیں......تم

مجھے ندی کے اس طرف چھوڑ دو تو یہ ابھی تمہارے ہو سکتے ہیں......ملاح، میں تمہیں سو روپے دے رہاں ہوں!......اور نہیں تو، ادھر دیکھو، میرے پاس اتنا لمبا چاقو بھی ہے—— سمجھے؟ (کوٹ کی جیب سے چاقو نکال کر دکھاتا ہے)

ملاح : (سہم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ رگھو کے پاس جا کر) مگر......مگر بھیا اس وقت کون مرنے کو وہاں جائے گا!......ندی کی آواز نہیں سنتے؟......اور پھر یہ اندھیرا، بارش۔

رگھو : یہ سب میں نہیں جانتا، تم ملاح ہو۔ کسی طرح چلو، مجھے آج رات کسی حالت اس پار جانا ہے...ابھی اس وقت۔

مراری : (تیزی سے اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے) ٹھہرو بھیا جی، میں بھی چلوں گا۔......دوپہر سے کشتی کے انتظار میں یہاں بیٹھا رہا۔ جب شام کو کشتی آئی تو یہ ملاح کہنے لگا، ابھی اور مسافر آ جائیں، تب چلوں گا......اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ طوفان آ گیا جی!—— مجھے بھی بہت ضروری کام ہے جی......میں تباہ ہو جاؤں گا......لٹ جاؤں گا......مجھے لے چلو جی......

پجاری : تم نے دیر سے شور مچا رکھا ہے، جانا ہے......جانا ہے! یہاں سب ہی اس پار جانے کو آتے ہیں۔ گھاٹ کے اس طرف کوئی نہیں رکتا!—— پر تمہاری طرح شور کوئی نہیں مچاتا......آخر تم ہو کون؟

مراری : میرا نام مراری لال گردھاری لال ہے جی......بانس پور میں کپڑے اور اناج کی دکانیں ہیں جی۔

پجاری : (تیکھی ہنسی کے ساتھ) ٹھیک ہے بڑے آدمی ہو۔ تبھی وقت ہے اتنا قیمتی ہے!

مراری : ہاں جی......پر میں تو دوپہر سے......

رگھو : (بات کاٹ کر، ملاح سے) بتاؤ ملاح......تم مانو گے یا نہیں!

ملاح : (ایک قدم پیچھے ہٹ کر) رگھو بھیا......کیسی باتیں کر رہے ہو!......اپنی جان پیاری نہیں تمہیں؟......ایسا طوفان تو آج تک دھرتی پر نہ آیا ہوگا!......(باہر زور سے بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سنائی دیتی ہے)

مراری : (طوفان سے گھبرا کر)......اوہ پرمیشور......(انگیٹھی کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے)

پجاری : جیسے ساری دھرتی آج پانی میں ڈوب کر رہ جائے گی۔ جو کچھ بچے گا اسے یہ بجلیاں گر کر جلا دیں گی......کتنا بھیانک ہے!........اور یہ پیپل کی روحیں!......ان کی چیخیں نہیں سنتے؟

رگھو : میں ان سے نہیں ڈرتا!

پجاری : دیوی سے بھی نہیں ڈرتے؟—— آج ندی کی دیوی سخت غصے میں ہے۔اس کا ایسا غصہ پہلے کبھی نہیں دیکھا میں نے!......دیوی، ہم پر دیا کرو۔

(رگھو اور ملاح بھی آکر انگیٹھی کے گرد اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں، پس منظر میں بارش اور ہواؤں کی آوازیں ابھر جاتی ہیں ساتھ ہی اسٹیج کے باہر بائیں جانب کسی کے قریب آتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں......سب لوگ پلٹ کر اس طرف دیکھنے لگتے ہیں، پجاری جسم پر چادر لپیٹے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

پجاری : (بائیں طرف دیکھتے ہوئے) یہ کون آرہا ہے؟......اس وقت اس طوفان میں......؟

بوڑھا : شائد......پیپل کی روحیں......

پجاری : (غصے سے) خاموش رہو——!

(آوازیں بہت قریب آجاتی ہیں۔ بائیں طرف سے ارون اور آشا داخل ہوتے ہیں ،آشا کے کاندھوں پر ارون کا کوٹ ہے، دونوں کے کپڑے بارش میں بھیگے ہوئے ہیں۔اندر آکر ارون اور آشا کپڑے جھاڑتے ہوئے دور ہی کھڑے رہتے ہیں۔)

ارون : شکر ہے......ہم یہاں تک تو پہنچ گئے!

پجاری : دیوی کا شکر ادا کرو......اس مندر کی دیوی کا!

ارون : تم......تم یہاں کے پجاری ہو؟

پجاری : ہاں، مگر تم کون ہو؟——اس وقت......اس اندھیرے اور......!

ارون : (بات کاٹ کر) ہمیں ندی کے پار جانا ہے۔ راستے میں ہماری گاڑی الٹ گئی تھی...... بارش اور اندھیرے کی وجہ سے۔مگر ہمیں کوئی چوٹ نہیں آئی......میرا نام

اروِن ہے..... یہ آشا ہیں۔

رگھو : یہاں آگ کے پاس آجاؤ۔

آشا : (ہولے سے) یہ نہیں اروِن یہیں رہو۔ ان لوگوں سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کیسی خوفناک شکلیں ہیں! جیسے شمشان میں چتا کے گرد بھوت بیٹھے ہیں!

پجاری : (ایک گرجدار قہقہہ لگاتا ہوا آگے بڑھتا ہے) تم بہت تیز معلوم ہوتی ہو لڑکی..... مگر اس اندھیرے میں کہاں جا سکو گی!—— رات یہیں کاٹنی پڑے گی..... قسمت والی ہو جہاں تک پہنچ بھی گئیں!

آشا : نہیں، نہیں..... ہمیں اس وقت جانا ہے۔

اروِن : (آگے بڑھ کر) تم میں ملاح کون ہے؟

ملاح : کیوں کیا ہے؟—— کیا تم بھی اس طوفان میں پار جانے کے لئے بے چین ہو؟..... کیا آج سارے مسافر ایسے ہی آئیں گے؟..... کسی کو اپنی جان پیاری نہیں؟—نہ ہو۔ مجھے تو..... میں بتائے دیتا ہوں، اس طوفان میں اپنی کشتی ہرگز دریا میں نہیں ڈالوں گا..... چاہو مجھے مار ڈالو..... میری جان لے لو۔

رگھو : (چیخ کر) میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا..... (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

مراری : (گھبرا کر) ہیں، ہیں..... کیا کرتے ہو جی رگھو جی مہاراج! اسی کو مار ڈالا تو پار کیسے پہنچو گے؟

پجاری : (قریب آ کر) خبردار، یہ دیوی کا استھان ہے!..... یہاں ایسی باتیں نہیں ہوں گی۔

رگھو : (ہنستا ہے) دیوی کا استھان!..... اور تم اس کے رکھوالے ہو..... (ہنس کر ٹہلنے لگتا ہے)..... میں جانتا ہوں..... میں سب کچھ جانتا ہوں پجاری مہاراج!..... میں رگھو ڈاکو ہوں!

مراری : (آشا سے) تم آگ کے پاس آجاؤ..... وہاں سردی میں کانپ رہی ہو..... اور تم بھی آجاؤ نا؟ کیا نام ہے جی تمہارا؟ اروِن (ہنستا ہے)..... بڑا پیارا نام ہے جی..... جوڑی بھی بہت پیاری ہے۔ (پھر ہنستا ہے)

اروں :(ملاح کے پاس آ کر) تو تم نہیں چلو گے ملاح؟

ملاح :(سر ہلا کر): نہیں۔

اروں :میں گھاٹ پر سے تمہاری کشتی کھول کر لے جاؤں گا۔

رگھو :(ٹہلتے ٹہلتے رک جاتا ہے) کون کھول لے جائے گا کشتی؟ — مجھے نہیں جانتے؟ میرا نام رگھو ہے...... رگھو ڈاکو!

آشا :(سہم کر اروں کے پاس آجاتی ہے) اروں یہاں سے چلو...... کہیں بھی...... کہیں اور چل کر بیٹھیں گے۔

پجاری :تم اس وقت کہاں جاسکوگی؟ — اس طرف اندر میرا بستر پڑا ہے...... جاؤ آرام سے سو رہو۔ صبح چلی جانا۔ تمہارا پتی ہمارے ساتھ رہے گا...... ڈرو مت...... ہم سب مسافر ہیں...... سب ہی کو پار جانا ہے۔ یہاں کچھ نہ ہوگا!...... یہ دیوی کا استھان ہے...... (ہنسنے لگتا ہے)

(پجاری اور رگھو پھر انگھیٹھی کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ رگھو جیب سے سگریٹ نکال کر انگھیٹی کے انگاروں سے سلگاتا ہے)

آشا :اروں...... چلو اروں میں پاگل ہو جاؤں گی...... کیسا خوفناک کھنڈر ہے...... ہر طرف لاشیں ہی لاشیں کھڑی نظر آتی ہیں...... اور ادھر...... ادھر درختوں پر ان کی روحیں لڑ رہی ہیں...... (باہر زور سے بجلی کڑکتی ہے)...... میں مر جاؤں گی اروں...... پاگل ہو جاؤں گی......

اروں :(آشا کا ہاتھ تھام کر) آشا! ہمت سے کام لو، میں تمہارے ساتھ ہوں،...... (عقب سے پاگل اٹھ کر آتا ہے۔ جو اب تک سیڑھیوں کے پاس خاموش بیٹھا تھا)

پاگل :(نیم برہنہ حالت میں، قریب آتے ہوئے) کون مر جائے گا؟...... کون پاگل ہو جائے گا؟...... کوئی نہیں مر سکتا...... میں، صرف میں اس کے پاس جاؤں گا...... سب مجھے پاگل کہتے ہیں (قہقہہ)...... میں پاگل سہی۔ مگر وہ مجھے لینے آئی ہے...... آج میں اس کے پاس پہنچ جاؤں گا...... دیکھو...... وہ دیکھو مجھے بلا رہی ہے!

آشا : (چیخ پڑتی ہے) ارون ــــ!

پاگل : یہ کون پہنچا؟ ــــ نہیں یہ اس کی چیخ نہیں، وہ ایسے نہیں چیختی ...... وہ تو ندی پر کھڑی مجھے بلا رہی ہے! ...... میں نے کہا تھا نا، میرا خواب سچا ہے! ...... میں نے جھوٹ کبھی نہیں کہا ...... کبھی نہیں۔ آج کا طوفان کبھی ختم نہ ہوگا ...... کبھی نہیں! (بادل کی گرج سنائی دیتی ہے)

پجاری : آج ندی کی دیوی بہت غصے میں ہے۔ اس کا غصہ خطرناک ہوتا جا رہا ہے ......

پاگل : (وحشت ناک قہقہہ) خطرناک! ...... اس دن بھی خطرناک ہو گیا تھا جب ...... جب (لہجہ بدل کر) وہ اسے بہا لے گئی تھی! ...... وہ خون کی پیاسی ہے ...... اسے خون چاہیے ...... انسان کا خون! (قہقہہ)

پجاری : یہ ٹھیک کہتا ہے۔ دیوی کا غصہ انسانی خون سے ہی ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے ورنہ سب کو تباہ کر دے گی ...... سب مٹ جائیں گے ...... سب مر جائیں گے ...... سب! (بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج زور سے سنائی دیتی ہے)

ملاح : ندی کی آواز بڑھتی جا رہی ہے۔

پجاری : ہم میں سے ضرور کسی نے دیوی کو ناراض کیا ہے! ...... آج کے مسافروں میں سے کوئی نہ کوئی اس طوفان کا سبب ہے! ...... یہ طوفان کبھی نہ تھمے گا ......!

رگھو : تم کیا کہنا چاہتے ہو پجاری؟

پجاری : رگھو، تم ڈاکو ہو۔ تم مرنے سے نہیں ڈرو گے! ...... مگر دوسرے ڈر جائیں گے ...... موت سے سب ہی ڈرتے ہیں ...... پر آج ہم میں سے کسی کو مرنا پڑے گا! (پھر ہنستا ہے)

مراری : (سہم کر) نہیں، نہیں ...... میں مرنا نہیں چاہتا

رگھو : مگر کسی ایک کو کیوں مرنا پڑیگا؟

بوڑھا : ــــ دیوی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے۔

پجاری : ہاں، دیوی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ...... جس نے اسے ناراض کیا ہے ۔ دیویا سی کا بلیدان مانگتی ہے ...... اس کے مندر میں کھڑے ہو کر ایسی باتیں نہیں

کرتے......اس سے ڈرنا چاہیے......ہم سب پاپی ہیں......سب پاپی ہیں

ارون : (بے چین ہوکر) سنو ملاح، تم اب بھی نہیں آؤ گے تو میں تمہاری کشتی کھول لے جاتا ہوں......

آشا : چلو ارون...... یہاں سے چلیں......

مراری اور بوڑھا: (ایک ساتھ گھبر کر) نہیں، نہیں......

رگھو : یہاں سے کوئی نہ ہلے گا۔

پجاری : (کھڑا ہو جاتا ہے) بتاؤ...... تمہاری شادی کو کتنے دن ہوئے؟

ارون : ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔

پجاری : (چونک کر) کیا کہا؟—— تمہارا بیاہ نہیں ہوا؟

رگھو : (کھڑا ہو کر) ہونہہ...... تو پھر...... تو پھر......!

پاگل : (درمیان میں چیخ اٹھتا ہے) بھاگ جاؤ۔ اس ندی سے دور بھاگ جاؤ...... ورنہ تمہارا بیاہ نہ ہو سکے گا...... بیاہ! (ہنسنے لگتا ہے)

پجاری : (ٹہلتے ہوئے) تو تم لوگ گھر سے بھاگ آئے ہو...... تم اسے بھگا کر لیے جا رہے ہو!

ارون : تمہیں ہم سے مطلب——؟

رگھو : (آگے بڑھ کر، ہنستے ہوئے) کام تو بہادری کا کیا ہے۔ مگر...... اب کیوں کیا؟

آشا : وہ لوگ مجھے بیچ ڈالنا چاہتے تھے...... روپے کے لالچ میں

ارون : آشا کا بیاہ مجھ سے نہیں کرنا چاہتے تھے۔

پجاری : (ارون کے سامنے آ کر رک جاتا ہے) تم نے پاپ کیا ہے۔

ارون : ہرگز نہیں۔

پجاری : اس کا فیصلہ دیوی کرے گی۔ کون پاپی ہے، دیوی جانتی ہے...... یہاں کئی مسافر ہیں۔ سب ندی پار جانے کے لیے بے چین ہیں!...... کون کیوں جانا چاہتا ہے دیوی ہی جانتی ہے...... کسی کے دل میں کیا ہے، اور کون کیا کر کے آ رہا ہے...... پر دیوی کی شانتی کسی نے چھین لی ہے۔ اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا ضروری ہے...... جو پاپی

ہے، دیوی اسی کا بلیدان لے گی...... تبھی یہ طوفان تھمے گا اور...... اور کشتی پار ہو سکے گی ...... ورنہ یہ خوفناک رات کبھی ختم نہ ہوگی!...... باہر پیپل پر مردوں کی روحیں بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں...... وہ ناچ رہی ہیں، بلا رہی ہیں...... ایک نئے ساتھی کو، ایک نئی روح کو...... بتاؤ تمہیں میری تجویز منظور ہے۔

رگھو : کوئی انکار کر نہیں کر سکتا۔ بتاؤ کون...... کون کرتا ہے انکار؟ (سب کی طرف باری باری سے دیکھتا ہے)...... طوفان کو کسی نہ کسی طرح رکنا ہے...... مجھے اس پار جانا ہے...... آج کی رات گزرنے سے پہلے......!

پجاری : تو سنو۔ سامنے مندر کے کھنڈروں کے سرے پر جو پیپل کا پرانا پیڑ ہے، ہم میں سے ہر ایک کو باری باری وہاں جا کر آنا پڑے گا —— دیوی جس کا بلیدان لینا چاہتی ہے، اس کو بلا لے گی۔ اور پھر...... یہ طوفان تھم جائے گا!...... سب تیار ہیں؟

رگھو : تیار ہونا ہی پڑے گا (جیب سے چاقو نکال لیتا ہے)

پجاری : —— اچھا تو سب سے پہلے میں ہی جا کر آتا ہوں!...... ہم سب پاپی ہیں...... کوئی نہیں جانتا کس کا پاپ بڑا ہے!...... کون جانے آج کی رات کسے ختم ہونا ہے!...... اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو...... بھگوان معاف کر دے گا...... وہ معاف کر دے گا...... وہ معاف کر دے گا......

(جسم پر چادر اچھی طرح لپٹ کر پجاری آخری جملہ دہراتے ہوئے بائیں طرف سے باہر چلا جاتا ہے، باہر زور سے بادل گرج پڑتے ہیں —— اسٹیج پر سب لوگ ایک دوسرے کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں —— رگھو ہاتھ میں چاقو لیے ٹہلتا رہتا ہے۔ کوئی آدھے منٹ کے بعد پجاری واپس آتا ہے)

پجاری : (چادر سے بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے) میں نے کہا تھا نا، دیوی کو میرے شریر کی ضرورت نہیں۔ اب کوئی دوسرا جائے۔ کہو کون جائے گا؟...... تم، رگھو، تم جاؤ۔ تمہیں دیوی اور مجھ پر بھی وشواس نہیں!

رگھو : (چاقو بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) تم سمجھتے ہو میں ڈر گیا؟...... وشواس تو مجھے

اب بھی نہیں ..... پر میں ہی جاؤں گا ..... میں ہی جاتا ہوں !(بائیں طرف سے باہر چلا جاتا ہے)

آشا : ارون، یہ ہم کہاں آ گئے ! یہ کیسے لوگ ہیں ! ..... میری عقل بیکار ہو گئی ہے ارون ..... ارون (رونے لگتی)

ارون : رو نہیں آشا۔ دھیرج سے کام لو ..... میں تمہارے ساتھ ہوں، شائد بھگوان کی یہی مرضی ہو !

آشا : میں نے کہا تھا نا ..... ہم سے ضرور کوئی غلطی ہوگئی ہے۔

پاگل : (قہقہہ لگا کر) غلطی ! ..... تم دونوں پر بھی ہو ..... پر یہی ! مگر میں تو آج اس سے ملنے جا رہا ہوں ..... آج ہی ..... ابھی .....

(رگھو واپس آتا ہے۔ کوٹ پر بارش کے قطرے نظر آ رہے ہیں)

پجاری : دیوی کو رگھو کی بھی ضرورت نہیں ہے ! ..... اب کون جائے گا ؟ ..... تم، مراری لال اب تم جاؤ گے۔

مراری : (بیٹھا رہتا ہے) اجی پجاری مہاراج، ..... مجھ پر دَیا کیجئے ..... میری ضرورت بھلا دیوی کو کیا ہوگی !

رگھو : (آگے بڑھ کر) : مراری لال ! ..... دیر مت کرو۔ سمے بیتا جا رہا ہے .....

مراری : (ادھر ادھر دیکھ کر گھبراتے ہوئے اٹھتا ہے) ..... پرمیشور ..... میری رکھشا کرنا ..... (بائیں طرف سے جھجکتا ہوا باہر نکل جاتا ہے ..... بارش اور ہواؤں کی آوازیں برابر سنائی دیتی رہتی ہیں ..... مراری جلدی ہی واپس آ کر ہانپتا ہوا انگیٹھی کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

پجاری : (قہقہہ لگا کر) دیوی کو مجھ جیسے ڈرپوک آدمیوں کی ضرورت نہیں ! ..... (پلٹ کر بوڑھے کی طرف دیکھتا ہے) ..... تم ..... اب تم جاؤ گے۔

بوڑھا : (کھڑا ہو کر) ہاں اب میں ہی جاؤں گا ..... کون جانے دیوی کو میرے بوڑھے شریر کی ہی ضرورت ہو۔

(بوڑھا بھی اسی سمت سے باہر چلا جاتا ہے، ساتھ ہی پاگل، جواب تک دائیں طرف ستون سے لگا بیٹھا تھا، اٹھ کر قریب آجاتا ہے9

پاگل :......دیوی کو میری ضرورت ہے......

پجاری :نہیں، تم نہیں جاؤ گے، تم پاگل ہو......دیوی تمہارا بلیدان نہیں لے گی۔

پاگل :(زور سے ہنستا ہے) ہاں! میں پاگل ہوں...... میری ضرورت کسی کو نہیں !...... پر میری دیوی کو تو ہے۔

(جا کر پھر دائیں ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہے، ساتھ ہی بائیں طرف سے بوڑھا واپس آ کر چپ چاپ انگھیٹی کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔)

پجاری :ہم میں سے ہر ایک باری باری اس پیپل تک ہو آیا ہے، مگر دیوی نے کسی کا بلیدان قبول نہیں کیا......(بیچ میں پاگل زور سے زور سے ہنس پڑتا ہے) اب صرف یہ نوجوان اور لڑکی بچ گئے ہیں...... ملاح کو نہیں بھیجا جا سکتا...... اس کی ضرورت ہم سب کو ہے!......(دونوں کی طرف مڑ کر)......بتاؤ تم میں سے پہلے کون جائے گا؟

آشا :(ہٹ کے ساتھ) میں اور ارون ساتھ ہی جائینگے۔ ہم نے بھگوان کے سامنے سوگند کھائی تھی کہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے......ہم نے اپنے آپ کو پتی پتنی مان لیا ہے......ہم غیر نہیں ہیں!

پجاری :(ہنسکر) بھگوان کے سامنے......! لڑکی، یہ مت سمجھو کہ گھر سے بھاگ آئی ہو...... ابھی تم ندی کے اس پار ہی ہو۔ ابھی تم کہیں نہیں گئیں......(ہنستا ہے) کہیں نہیں...... جاؤ! تم اندر بستر پر آرام سے سو رہو......

ارون :(غصے سے) بکواس بند کرو، ہم جا رہے ہیں......ہم ساتھ ہی جائیں گے۔

پجاری :اچھی بات ہے۔

پاگل :ہم ساتھ ہی جائیں گے ـــــ(زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

(ارون اور آشا ساتھ ساتھ بائیں طرف باہر چلے جاتے ہیں اسٹیج پر سب لوگ چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں......یکا یک پس منظر میں بہت زور سے بجلی

کڑکتی ہے اور ساتھ ہی سارے اسٹیج پر مکمل تاریکی چھا جاتی ہے...... بادل کی گرج بہت دیر تک سنائی دیتی ہے۔ اسی گرج اور اندھیرے میں تیزی سے پردہ گرا کر پچھلا منظر چھپا دیا جائے۔

(پردہ بالکل سادہ ہو)

تیسرا منظر

(اسٹیج پر چھایا ہوا اندھیرا بہت آہستہ آہستہ کم ہونے لگتا ہے جس میں ارون اور آشا نظر آتے ہیں۔ آشا دونوں گھٹنوں میں سر چھپائے زمین پر بیٹھی ہے اور ارون اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے جھکا ہوا کھڑا ہے۔ ان کے علاوہ اسٹیج بالکل خالی ہے......ارون اور آشا پر پڑنے والی روشنی آہستہ بڑھتی جاتی ہے......)

ارون : (آہستہ سے) آشا......آشا......اٹھو......آشا! (زور سے) آشا!

آشا : (گردن اٹھا کر، سہمی ہوئی آواز میں) :——ارون! (چیخ کر ارون کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے)

ارون : اٹھو آشا......اٹھو، اب کچھ نہیں!......اب کچھ نہیں......ڈرو نہیں! (آشا کو سہارا دیکر کھڑا کرتا ہے)

آشا : یہ......یہ سب کیا ہوا ارون؟......یہ سب کیا تھا؟

ارون : پجاری سچ کہتا تھا......دیوی نے اپنا بلیدان لے لیا!

آشا : بلیدان؟——نہیں نہیں ارون......مگر......مگر ہم تو......؟

ارون : (ہاتھ سے دائیں طرف بتاتے ہوئے) ادھر دیکھو۔ کھنڈر پر بجلی گری ہے۔

آشا : مندر پر؟......نہیں نہیں ارون......!

ارون :ہاں آشا.................میں نے خود دیکھا ہے۔

(ارون اور آشا خاموش کھڑے دائیں طرف دیکھتے رہتے ہیں، پس منظر میں آہستہ آہستہ کوئی ساز سنائی دیتا ہے جو رفتہ رفتہ تیز اور بلند ہوتا جاتا ہے۔

(ساتھ ہی آہستہ آہستہ پردہ بھی گرادیا جائے——)

خالی خانے

• انل ٹھکر

کردار

اردلی

آدمی

مہندر

آواز

جگناتھ

عورت

سدھیر

روپا

پہلا منظر

:**پردہ اٹھتے ہی** ناظرین کے دائیں طرف اسٹیج کے آگے کے حصہ میں ایک کٹہرہ نظر آتا ہے۔اس کٹہرے کے سامنے اسٹیج کی بائیں طرف ایک ٹیبل رکھا ہوا ہے۔جس کی کرسی پر ایک آدمی ناظرین کی طرف چہرہ کئے بیٹھا ہے اسٹیج کے بیچ کے حصہ میں ایک بنچ رکھی ہوئی ہے۔جس کی بغل میں ایک الماری ہے۔کرسی پر بیٹھا آدمی، دائیں طرف ٹھہرے اردلی کی طرف دیکھتا ہے اردلی دائیں سے بائیں کنارے جاکر پکارتا ہے۔

اردلی :(تین بار) مہندر ناتھ حاضر ہو۔

دو سپاہیوں سے گھرا ہوا مہندر داخل ہوتا ہے۔ وہ کٹہرے میں آکر ٹھہرتا ہے۔ سپاہی ناظرین کی طرف سلام کرتے ہیں اور واپس لوٹ جاتے ہیں۔کرسی پر بیٹھا آدمی ایک موٹی سی کتاب لے کر مہندر کے قریب آتا ہے۔

آدمی :(مہندر سے) اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر کہو۔ میں بھگوان کو حاضر وناظر جان کر یہ قسم کھاتا ہوں کہ میں جو کچھ بھی کہوں گا، سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ بھی نہیں کہوں گا۔

مہندر :(کتاب کے بلیک پنے پلٹ کر) کیا ہے یہ؟

آدمی :گیتا۔

مہندر :گیتا!! کیوں؟

آدمی : آپ ہندو ہیں۔اس لئے۔۔۔۔

مہندر : آپ کو کس نے کہا کہ میں۔۔۔۔

آدمی : آپ کا نام۔۔۔

مہندر : کسی کے نام سے اس کا مذہب طے کیا جا سکتا ہے؟

آدمی : I am sorry آپ ہی بتائیے۔آپ کا کون سا مذہب ہے؟ میں اس کی مقدس کتاب۔۔۔۔

مہندر : گویا آپ ہر مذہب کو بغل میں لپیٹے پھرتے ہیں۔

آواز : (یہ آواز تھیٹر میں سے اسٹیج کی جانب آتی ہے) آرڈر،آرڈر۔اپنا مذہب بتاؤ۔

مہندر : میرا کوئی مذہب نہیں۔

آدمی : تو بھگوان کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاؤ۔

مہندر : میرا اس پر بھی اعتبار نہیں

آدمی : تو صرف قسم کھا کر کہو کہ تم جو کچھ کہو گے سچ کہو گے۔

مہندر : میرا ایسا کہہ دینے سے میری ہر بات کو سچ مانا جائیگا؟

آواز : یہ ضروری نہیں،سچ اور جھوٹ کی تحقیقات کی جائے گی۔

مہندر : تو پھر تحقیقات کو تحقیقات ہی رہنے دیجئے۔بیچ میں بھگوان،مذہب اور قسم کو کیوں لاتے ہیں؟

آواز : یہ قانونی کاروائی ہے،تم اگر اس میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرو گے تو تمہارے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی قسم کھاؤ۔

مہندر : قسم!!(نا میں سر ہلاتے ہوئے)۔یہ لفظ شریفوں کے لیے ہتھکڑی ہوتا ہے۔

آواز : آرڈر،آرڈر،قسم کھاؤ۔

مہندر : (نڈھال ہو کر) میں قسم کھاتا ہوں۔میں جو کچھ کہوں سچ کہوں گا۔

آدمی : نام؟

مہندر : مہندر ناتھ

آدمی : باپ کا نام؟

مہندر :جگناتھ۔

آدمی :عمر؟

مہندر :ستائیس سال

آدمی :تعلیم

مہندر :2nd M.B.B.S.

آدمی گیتا لے کر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھتا ہے۔

آواز :تعلیم مکمل نہیں کی؟

مہندر :نہیں۔

آواز :کیوں؟

مہندر :شروع شروع میں کرنا چاہی، بعد میں بھی کئی بار بری عادتوں کو جھٹک کر کھڑا ہونا چاہا۔ سنجیدگی سے دوسروں کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کی مگر۔ اور پھر تو قدموں میں قدم ملانے کی نہ طاقت رہی، نہ دل میں وہ ولولے، نہ آرزوئیں راستہ ہی بدل گیا۔ سوچ ہی بدل گئی۔ ذہن ونظر نفرت کی پرت در پرت۔۔

آواز :تمہیں جو کچھ کہنا ہے، اختصار سے کہو۔

مہندر :سچ کو اختصار کے دائرے میں کیسے جکڑا جا سکتا ہے۔

آواز :بحث مت کرو۔ جواب دو، تم پر روپا نام کی لڑکی کے قتل کا الزام ہے تم اس جرم کا اقبال کرتے ہو یا اس سے انکار کرتے ہو؟

مہندر :جواب دینے سے پہلے، میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔

آواز :اجازت ہے۔

مہندر :قتل کتنے نمونے کے ہوتے ہیں؟

آواز :اس سوال کا اس مقدمہ سے کیا واسطہ ہے؟

مہندر :ہے بالواسطہ ہے۔

آواز :قتل کئی نمونے کے ہو سکتے ہیں۔

مہندر :نہیں، قتل دو نمونے کے ہوتے ہیں، ایک جھٹکے کا۔ جس میں مرنے والا یکلخت جان دیدیتا ہے۔ دوسرا ذبح کا۔ جس میں مرنے والا تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے، مان لیجئے، آپ ایک مرغی کو ذبح کرتے ہیں۔۔۔۔

آواز :آرڈر، آرڈر۔

مہندر :I am Sorry میرا مطلب ہے، ایک شخص ایک مرغی کو ذبح کرتا ہے۔ وہ مرغی تڑپتی ہے۔ یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں۔ پر پھڑ پھڑاتے ٹپکتے خون کے ساتھ بوند بوند مرنے لگتی ہے۔ اس وقت اگر کوئی کیڑا، مکوڑا، اس کے پیروں کی رو میں آکر مارا جائے تو اس کیڑے کا قاتل کون؟ مرغی یا مرغی کو ذبح کرنے والا وہ شخص؟۔۔۔۔ مسٹر جج، میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کچھ لوگوں سے جرح کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

آواز :اجازت ہے۔

آدمی :(اٹھ کر) آپ کن سے سوال کرنا چاہتے ہیں؟

مہندر :پہلے اپنے والد سے

آدمی اردلی کو دیکھتا ہے۔ اردلی دروازے کے پاس جا کر پکارتا ہے۔

اردلی :(تین بار) جگناتھ حاضر ہو۔

مہندر :میں نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ کسی کو عزت دی ہے تو وہ میرے والدین ہیں۔ میری فرمانبرداری نے ہی آج مجھے یہ دن دکھایا ہے مجھے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے، انھیں اس کٹہرے میں بلانا پڑ رہا ہے۔ مجھے رنج ہے اس بات کا۔ رنج اس لئے ہے کہ عدالت کو ہم انصاف کا مندر کہتے ہیں۔ پھر بھی اس مندر میں بلایا گیا ہر شخص اپنے آپ کو بے عزت و بے آبرو محسوس کرتا ہے۔ آج ویسا ہی کچھ میرے والد بھی محسوس کریں گے مگر میرے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ میں مجبور ہوں۔۔۔۔ دیکھئے نا کبھی کبھی دوسروں کی حرکات کا ہماری زندگی میں کیسا دخل رہتا ہے۔ جگناتھ داخل ہوتا ہے۔ مہندر کٹہرے سے باہر آکر ٹھہرتا ہے۔ جگناتھ کٹہرے میں جا کر ناظرین کی طرف

ہاتھ جوڑتا ہے۔ آدمی اپنی جگہ سے گیتا لے کر کٹہرے کے قریب آتا ہے۔

آدمی : اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ۔ تم جو کچھ کہو گے، سچ کہو گے، سچ کے سوا کچھ نہیں کہو گے۔

جگناتھ : میں قسم کھاتا ہوں۔ میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

آدمی : نام؟

جگناتھ : جگناتھ۔

آدمی : باپ کا نام؟

جگناتھ : دینا ناتھ۔

آدمی : کام؟

جگناتھ : ریٹائرڈ گورنمنٹ سرونٹ۔

آدمی اپنی جگہ پر جا کر بیٹھتا ہے۔

مہندر : مسٹر جگناتھ، آپ نے کبھی۔۔۔۔

جگناتھ : نالائق، بے شرم، اپنے باپ کو نام سے مخاطب کرتا ہے!!

آواز : آرڈر، آرڈر۔ عدالت نے انھیں جرح کرنے کی اجازت دی ہے۔ جگناتھ مجبوراً خاموش ہو جاتا ہے۔

مہندر : ہاں تو مسٹر جگناتھ، آپ نے کبھی خواب دیکھے ہیں؟

جگناتھ : حرامزادے، تجھے لے کر میں نے کتنے خواب دیکھے تھے، مگر سب پر پانی پھیر دیا تو نے۔

آواز : آرڈر، آرڈر۔ تمیز سے جواب دو۔

مہندر : ہاں تو مسٹر جگناتھ، ابھی ابھی آپ نے بتایا کہ آپ نے مجھے لے کر کئی خواب دیکھے تھے۔

جگناتھ : ہاں، کیا کیا خواب نہیں دیکھے میں نے تمہارے لیے۔

مہندر : آپ نے میرے لیے خواب دیکھے ٹھیک ہے! مگر آپ نے میرے لئے میرے بدلے

کبھی میری بھوک کو محسوس کیا؟ میرے بدلے کبھی آپ بیمار پڑے؟ میرے بدلے کبھی آپ بیمار پڑے؟ میرے بدلے کبھی آپ نے میری درد بھری سانس کو جھیلا؟ یا یوں کہوں کہ میرے بدلے محض مجھے زندہ رکھنے کے لئے آپ مر سکتے ہیں؟ خاموشی۔

مہندر :جواب دیجئے ہاں یا نا؟

جگن ناتھ :نہیں۔

مہندر :تو پھر، میرے بدلے میرے خواب آپ نے کیوں دیکھے؟

جگن ناتھ :اولاد کی محبت۔

مہندر :اولاد کی محبت !!! اس محبت نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اولاد نے کیا خواب دیکھے ہیں، اور ان کی تعمیر میں وہ کیا کر سکتی ہے۔

جگن ناتھ :تمہارے خوابوں میں پختگی نہیں تھی۔

مہندر :میرے خوابوں میں پختگی نہیں تھی۔ آپ کے خواب پختہ تھے۔ دوسرے معنوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مجھ میں سوچ کا مادہ کم تھا، جب کہ آپ اس سے مالا مال تھے۔

جگن ناتھ :ہاں۔ تم میں وہ مادہ آج بھی نہیں ہے۔

مہندر :مسٹر جج، ایک عام آدمی جب زیادہ سوچنے سمجھنے لگتا ہے تو اس کی ذہنیت میں خودغرضی کے کانٹے پھوٹنے لگتے ہیں۔ جسے وہ محبت کے نام سے نوازتا ہے۔ خاص طور پر ایک باپ جب اپنی اولاد کو لے کر خواب دیکھنے لگتا ہے، تب تو اس کے پورے جسم پر وہ محبت کے کانٹے نکل آتے ہیں۔ جن سے وہ اپنی اولاد کو ذبح کرتا ہے۔ ذبح !۔۔۔ جانے یا انجانے، خودغرضی میں یا محبت کی آڑ، ذبح بہرحال ذبح ہے اور اس طرح رقص شروع ہوتا ہے۔ بے بسی سے بھرپور چھٹپٹاہٹ کا جس میں روح کی پھڑ پھڑاہٹ تال دیتی ہے، اور ابتدا ہوتی ہے۔ بوند بوند مرنے کی۔

پانی کی بوندیں ٹپکنے کی موسیقی کے ساتھ رفتہ رفتہ اندھیرا پھیلنے لگتا ہے۔ اندھیرا۔

موسیقی ختم ہوتے ہی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگتی ہے، تب نظر آتا ہے ایک درمیانی طبقے کے سرکاری ملازم کا گھر۔ کورٹ میں رکھا کٹہرا۔ اب اس گھر کی بالکنی ہے۔ کورٹ کے کارکن

کا ٹیبل اور الماری اس گھر کے لوازمات میں۔ دروازے پر گھنٹی بجتی ہے۔ عورت اندر سے آ کر دروازہ کھولنے جاتی ہے۔

عورت : (دروازہ کھول کر واپس داخل ہوتے ہوئے) کیوں آج آپ جلدی لوٹ آئے دفتر سے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

جگناتھ داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات ہیں۔

جگناتھ : سب ٹھیک ہے۔ میں نے آج دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔

عورت : کیوں؟

جگناتھ : میڈیکل کالج گیا تھا۔۔۔ ان سالوں نے کالج بھی اتنی دور بنوایا ہے۔ کہ آدھا دن تو وہاں آنے جانے میں نکل جاتا ہے۔

عورت : میڈیکل کالج!! کیوں؟

جگناتھ : فارم لانے۔

عورت : کیسا فارم؟

جگناتھ : داخلے کا۔

عورت : کس کے لیے؟

جگناتھ : (کاغذ ٹیبل پر پٹکتے ہوئے) کبھی تو عقل کی بات کیا کرو۔ میری عمر ہے، میڈکل کالج میں داخلے کا فارم بھرنے کی؟ (کوٹ اتارتے ہوئے) دوسرا گھر میں ہے کون؟ مہندر کے لئے گیا تھا۔

عورت : اسے ڈاکٹر بنانا ہے؟

جگناتھ : (کرسی کو کوٹ پہناتے ہوئے) تو کیا حجام بنانا ہے!! ارے کتنے بڑھیا مارکس لئے ہیں اس نے اس سال۔ وہ ایسے ہی کسی گھٹیا کورس کے لئے ضائع کر دوں گا؟

وہ کوٹ کی جیب سے قلم نکال کر ٹیبل پر رکھتا ہے اور پھر الماری کی طرف جاتا ہے۔

جگناتھ : ۔۔۔ اور پھر تم بھی تو آج کل سارا دن چل پاؤں کرتی پھرتی ہو۔ کبھی تیرے سر میں درد اٹھتا ہے۔ تو کبھی کمر پکڑ لیتی ہے۔ صبح کے وقت گھٹنوں میں درد کی شکایت تو رات

میں پیٹھ کی ہڈیاں چٹکنے کا شکوہ۔ گھر میں ڈاکٹر ہوگا تو یہ شکوے شکایتیں دور ہو جائیں گی
وہ الماری سے فائل نکال کر لوٹتا ہے۔

جگناتھ : میں بھی چار چھ سال میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔ کچھ نہ سہی تو بھی اس کے دواخانے کا حساب تو رکھ ہی سکتا ہوں۔ اس سے دو کام بن جائیں گے۔ (فائل ٹیبل پر رکھ کر، بیٹھتے ہوئے) ایک تو میں بیکار بیٹھنے سے بچ جاؤں گا۔ دوسرا، لونڈے کی آمدنی وخرچ پر نظر بنی رہے گی۔

فائل کھول کر فارم بھرنے لگتا ہے۔

عورت : اب آپ اس وقت یہ کیا لے کر بیٹھ گئے؟

جگناتھ : فارم کون بھرے گا، تیرا باپ؟ تو کیا سمجھتی ہے، تیرا پوت ایسے ہی ڈاکٹر بن جائیگا؟ ارے، یہ تو اسے ٹھوک پیٹھ کر ڈاکٹر بنانا ہوگا، ورنہ آج کل کے لونڈوں سے تو کچا پاپڑ بھی نہیں ٹوٹتا۔

عورت : ٹھیک ہے بنا لیجئے گا ڈاکٹر اسے، اب تو اٹھئے۔ پہلے تو دفتر نہیں جا رہے، کہا نہیں۔ میں نے تو، ڈبے والا آیا تو اس کے ساتھ کھانا بھجوا دیا، دفتر کو۔ خیر اب ہاتھ منہ دھو لیجئے، تب تک میں کھانا پروستی ہوں۔

جگناتھ : دھت تیرے کی۔ سالا ہندوستانی عورتوں کو سوائے کھلانے کے دوسرا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ شوہر نے دہلیز پر قدم رکھا نہیں کہ مینڈکوں کی طرح ٹرٹرانا شروع کر دیتی ہیں، کھانے کے لیے۔ ہوں۔۔۔۔ میرے دماغ میں پچیس باتیں گھوم رہی ہیں اور تمہیں کھلانے کی سوجھ رہی ہے۔ (فارم بھرنے لگتا ہے)۔۔۔ اتنا ہی ہے، تو ایک کپ چائے بنا دو۔ جاؤ، اب سر پر مت ٹھہرو۔

عورت جانے کو مڑتی ہے۔ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ عورت جاتے ہوئے رکتی ہے۔ ایک نظر شوہر کو دیکھ دروازہ کھولنے جاتی ہے۔

مہندر : (باہر سے، اونچی آواز میں) او ممی۔۔۔۔ My Mummy

عورت : (باہر سے) ارے ارے ارے۔۔۔ یہ کیا کر رہا ہے؟

مہندر :My dear mummy---

عورت : ارے چھوڑ بھی۔۔۔ گر پڑوں گی۔۔۔ کیا کر رہا ہے رے۔۔۔ مہندر اپنی ماں کو باہوں میں اٹھائے ،بوسے دیتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات ہیں۔ جگناتھ اپنا کام چھوڑ کر ان کی جانب دیکھنے لگتا ہے۔

مہندر : ارے گروگی کیسے۔ اب تو تجھے لے کر میں آسمان میں اڑوں گا۔ ایسے۔۔۔ زویں یں یں۔۔۔۔

مہندر اپنی ماں کو باہوں میں لئے لٹو کی طرح گھومتا ہے۔ عورت ڈرتے ہوئے چیخ پکار کرنے لگتی ہے۔

عورت : چھوڑ۔۔۔ چھوڑ دے۔۔۔ تیرے پتا جی۔۔۔

مہندر : پتا جی کو ماردو۔۔۔

گھومتے ہوئے مہندر کی نظریں جگناتھ پر پڑتی ہیں تو اس کی حرکات اور باتیں دونوں رک جاتی ہیں۔ وہ دھیرے سے اپنی ماں کو نیچے اتارتا ہے۔ عورت سر کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے اندر چلی جاتی ہے۔

جگناتھ : یہ کیا چھچھورا پن ہے۔ تمیز جیسی کوئی چیز ہے یا نہیں؟

مہندر : سوری سوری پتا جی۔

جگناتھ : سوری، ہونہہ یہ تیری ماں ہے ماں۔ کالج کی کوئی لونڈیا نہیں، جو باہوں میں اٹھائے ہوئے ناچ رہا تھا۔ (خاموشی)۔۔۔۔

یہاں آؤ مجھے تم سے کچھ ضروری کام ہے۔

مہندر : ڈیڈی، کام تو مجھے بھی ہے، آپ سے ایک۔

جگناتھ : کیا؟

مہندر جھجکتے ہوئے کاغذات سامنے کرتا ہے۔

جگناتھ : کیا ہے یہ؟

مہندر : آرڈر۔ دستخط چاہئیں آپ کے۔

جگناتھ :آرڈر!! کیسا آرڈر؟

جگناتھ ہاتھ بڑھا کر کاغذات لیتا ہے۔ جیسے جیسے وہ اسے پڑھتا ہے۔اس کے چہرے پر غصہ طاری ہونے لگتا ہے۔

جگناتھ : (غصہ سے) کیا ہے یہ سب؟ ۔۔۔۔میں پوچھتا ہوں ،کیا ہے یہ سب؟۔۔۔ (عورت یہ سن کر، پریشان حال اندر سے باہر آتی ہے)۔۔۔کس سے پوچھ کر یہ سب کیا ہے؟ میں ابھی زندہ ہوں، مرا نہیں۔۔۔بتا کس لیے کیا تو نے؟

مہندر :میرے مستقبل۔۔۔۔

جگناتھ :پہلے زمانہ حال کی فکر کرنا سیکھ۔ مستقبل کی فکر چھوڑ میرے لئے۔

عورت :کیا ہوا؟

مہندر :آنے والے کل کے لئے ، مجھے اس سے اچھا موقعہ پھر نہیں ملے گا۔

جگناتھ :پھر تیری تعلیم کون مکمل کرے گا، تیرا باپ؟

مہندر :یہ بھی تو ایک قسم کی تعلیم ہی ہے۔

جگناتھ :ہاں، تعلیم ہے، مرنے کی تعلیم ۔ بے موت مرنے کی تعلیم۔

عورت :کیا بات ہے؟ آخر یہ چاہتا کیا ہے؟

جگناتھ :اڑنا چاہتا ہے۔اڑنا۔آسمان میں۔

عورت :اڑنا چاہتا ہے!! آسمان میں!!!

جگناتھ :ہاں ٹھیک سے زمین پر دو قدم چلنے کا شعور تو آیا نہیں اور تمہارے پوت کو اڑنا ہے۔دو حرف پڑھنا کیا آ گیا ہے، حرام زادے کے پر نکل آئے ہیں۔

عورت :آخر بات کیا ہے؟

جگناتھ :بات ہے تیرا سر، ہونہہ بات کیا ہے۔ سالی ہم نے ساری زندگی یہ سوچ کر سرکاری دفتر کی ڈیوڑھی پر گذار دی کہ ایک نہ ایک دن ہمارا بیٹا بڑا ہو ڈاکٹر بنے گا۔اعلیٰ افسر بنے گا۔اعلیٰ افسر بنے گا۔ اچھا کمائے گا۔ ہمیں بھی اچھا کھلائیگا، مگر اب......اب لگتا ہے کہ ہمارے نصیب میں سکون بخش بڑھاپا نہیں لکھا۔ ہمارے بڑھاپے کو رینگتا ہوا

چھوڑ، یہ نالائق جوانی کے نشے میں اڑنا چاہتا ہے۔

عورت :تب سے یہ اڑنا اڑنا کیا لگا رکھا ہے؟ ٹھیک سے بات تو۔۔۔۔

جگناتھ :ارے برے کرموں والئے، تیرے بھاگ پھوٹے ہیں۔ تیرا لاڈلا ملٹری میں بھرتی ہو کر ہوائی جہاز اڑانا چاہتا ہے۔

عورت :ابھی تو اس کی مونچھ بھی نہیں نکلی۔ اسے کون ملٹری میں بھرتی کریگا!!

جگناتھ :عقل کی اندھی، بھرتی کرے گا کیا، کر لیا گیا ہے (کاغذات دکھاتے ہوئے) یہ دیکھ میری رضامندی کے دستخط لینے آیا ہے۔

عورت :کیا؟۔۔۔ نہیں، نہیں۔۔۔ دیکھو، میں کہے دیتی ہوں، میں نہیں بھیجنے کی اسے ملٹری ولٹری میں۔

جگناتھ :میں کہاں اسے بھیجنے بیٹھا ہوں، جو تو مجھ پر اکھڑ رہی ہے۔

عورت :بھگوان کا دیا ایک ہی تو بیٹا ہے، اسے بھی ملٹری میں بھیج دوں؟ نہیں ہوگا یہ مجھ سے۔

جگناتھ :تو یہاں میرے کون سے دو چار دھرے ہیں۔ تب سے مجھے ہی سینگ مارے جا رہی ہے، تو کہہ نا اپنے جنے سے۔

عورت :کیوں چپ کیوں کھڑا ہے؟ سن رہا ہے نا، میں تجھے ملٹری میں نہیں بھیجنے کی۔

مہندر :ممی مگر اس میں اتنا پریشان ہونے جیسا کچھ بھی نہیں ہے۔

عورت :نا کہا نا۔ اس پر بھی تو ضد کرے گا تو میں مٹی کا تیل ڈال کر جل مرونگی کہے دیتی ہوں

دروازہ پر گھنٹی بجتی ہے۔ عورت دروازہ کی طرف دیکھ کر کر اپنے شوہر کی جانب دیکھتی ہے۔

عورت :آپ اندر چلئے۔ ہاتھ منہ دھو لیجئے۔ باتیں بعد میں کر لینا۔

جگناتھ اندر جاتا ہے۔ عورت دروازہ کھولنے جاتی ہے۔

سدھیر :(باہر سے) نمستے ماتا جی۔

عورت :(باہر سے) جیتے رہو بیٹے۔

سدھیر :(داخل ہوتے ہوئے) مہندر ہے؟

عورت :(داخل ہوتے ہوئے) ہے نا۔

مہندر : ارے سدھیر آؤ آؤ (عورت اندر جاتی ہے) بیٹھو۔

سدھیر : (بیٹھتے ہوئے) کہو کیا حال ہے؟

مہندر : وہی رفتا بے ڈھنگی۔

سدھیر : اماں یار فتار تو تم خود بنا لیتے ہو۔

مہندر مسکراتا ہے۔ سدھیر جیب سے سگریٹ نکال کر ایک نظر اندر کی طرف دیکھتا ہے۔

مہندر : نہیں آئیں گے۔ (سدھیر سگریٹ جلاتا ہے)۔۔۔۔ تو پھر تمہیں الکٹرانک میں داخلہ مل گیا؟

سدھیر : داخلہ تو مل رہا ہے یار، مگر میں نے میڈیکل میں داخلے کا فارم بھر دیا ہے۔

مہندر : میڈیکل!! کیوں؟

سدھیر : گھر والوں کی خواہش ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں۔

مہندر : مگر تمہاری خواہش؟

سدھیر : میری خواہش۔۔۔ میں نے اس کی قربانی دیدی ہے۔

مہندر : ایسا کہہ کر شہیدوں میں نام لکھوانا چاہتے ہو؟

سدھیر : (اٹھتے ہوئے) نہیں۔

مہندر : تو پھر؟

سدھیر : سمجھوتہ کر رہا ہوں۔

مہندر : کس سے؟

سدھیر : لفظی طور پر کہوں تو وقت سے۔ حالات سے، ضرورتوں سے۔۔۔

مہندر : یوں کہو کہ حالات کے سامنے گھٹنے ٹیک رہے ہو۔

سدھیر : (بالکنی کے قریب آکر) تم جسے گھٹنے ٹیکنا کہتے ہو، میں اسے۔۔۔Adjustment of life کہتا ہوں۔

Just little flexibility is needed for this۔۔۔اور جس چیز میں flexibility نہیں، وہ مڑتی نہیں، اور جو چیز مڑتی نہیں وہ ٹوٹ جاتی ہے۔۔۔ خیر

جانے دو یار تم اپنی کہو؟ کیا ہوا، تمہارے ایرفورس کے انٹرویو کا؟

مہندر : انٹرویو میں کامیاب ہوا ہوں۔ آرڈر بھی ملا ہے۔ مگر بات۔۔۔۔

سدھیر : کیا بات ہے

مہندر : مجھے نہیں لگتا پتا جی کی رضامندی کے دستخط اتنی آسانی سے ملیں گے۔ جتنی آسانی سے آرڈر ملا ہے۔

سدھیر : یہ تو ابتدائے عشق ہے، روتے کیوں ہو بیٹے؟

مہندر : (بالکنی میں آکر) روتا نہیں۔ مجھے ڈر ہے میں تمہاری طرح سمجھوتہ نہیں کر سکوں گا۔

سدھیر : تو اس کی قیمت چکانے کے لئے تمہیں تیار رہنا ہوگا۔۔۔ اور یہ قیمت، روپے پیسوں میں یا سونے چاندی میں نہیں چکانی پڑتی، یہ چکانی پڑتی ہے۔ گھٹن نفرت اور کرب سے بوجھل سانسوں سے۔۔۔۔ ہاں، اس میں ایک بات ضرور ہے اگر تم اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گئے تو دنیا تمہیں اپنے شانوں پر اٹھائیگی اور اگر ناکام رہے تو ۔۔۔ خیر، دنیا اسے بھلا دے گی مگر وہ لوگ جنہیں تم اپنا کہتے ہو اپنا سمجھتے ہو وہی لوگ۔ ایک ایسی زہر بھری مسکراہٹ سے عمر بھر تمہیں دیکھیں گے جس سے تم ذرہ ذرہ بکھرتے چلے جاؤ گے اور ایسے بکھرو گے کہ پھر کبھی تمہاری کوئی شخصیت ابھرنے نہ پائے گی۔ رہ جائے گا تو صرف ''بکھراؤ ہی بکھراؤ۔

مہندر : ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں کبھی کبھی اور جب جب بھی سوچتا ہوں، تو ایک خوف طاری ہو جاتا ہے ذہن پر۔ سدھیر، میں دوسرے جنم پر یقین نہیں کرتا۔ شاید تم کرتے ہو گے تو سمجھو گے کہ اس جنم میں نہ سہی اگلے جنم میں تم یقیناً الکٹرانک انجینئر بنو گے۔ مگر میں ویسا نہیں سمجھتا۔ تم ہر سانس کے بعد سوچتے ہو گے کہ تم جی رہے ہو، اور میں ہر سانس کے بعد سوچتا ہوں کہ میں سانس در سانس مر رہا ہوں۔ میری ہر سانس کے بعد زندگی اور موت کے بیچ کا فاصلہ گھٹتا جا رہا ہے۔

سدھیر : اور اسی لیے تم کچھ کر گذرنے کی جلدی میں ہو؟

مہندر : ہاں۔

سدھیر : اور اس جلدی میں تم یہ بھول جاتے ہو کہ جنھوں نے تمہیں پیدا کیا ہے ان کی خوشی کی خاطر تمہیں کچھ کرنا چاہئے۔

مہندر : جنھوں نے مجھے پیدا کیا ہے، ویسا مت کہو، جن کی وجہ سے میں پیدا ہوا ہوں، ویسا کہو۔ پیدا کرنے والا تو وہ ہوتا ہے۔ جو اپنی تخلیق کو، جب چاہے جتنی بار چاہے پیدا کرلے اور وہ کام تو تمہارا بھگوان بھی نہیں کرسکتا۔

سدھیر : کچھ بھی کہہ لو، کیا فرق پڑتا ہے۔

مہندر : تمہارے لئے کچھ فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ تمہیں کچھ بننا ہے۔ پھر وہ کچھ، کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

سدھیر : اور تمہیں؟

مہندر : مجھے بھی کچھ بننا ہے۔ مگر میرا کچھ میری نظروں میں ہے۔

(اتنے میں مکان پر سے ہوائی جہاز گذرنے کی آواز آتی ہے)

مہندر : یہ آواز سنی تم نے؟

سدھیر : ہاں ہوائی جہاز گذر رہا ہے اوپر سے۔

مہندر : جیسے مسجد کے میناروں سے آتی اذان کی آواز نمازی کو عبادت کے لئے اپنی جانب کھینچتی ہے، ویسے ہی یہ آواز مجھے اپنے ارادوں کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتی ہے۔

سدھیر : میری نظروں میں دونوں راستے بڑے مشکل ہیں عبادت کا بھی اور ارادوں کا بھی۔ آسان راستہ ہے، دنیاداری کا جس میں کبھی بھی کہیں بھی اپنے آپ کو adjust کیا جاسکتا ہے۔ موڑا جاسکتا ہے۔ ڈھالا جاسکتا ہے ٹوٹنے بکھرنے کا کہیں ڈر نہیں۔

مہندر : اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی ایک راستہ تکلیف دہ ہے، اس لئے اسے ترک کردیا جائے۔ اور دوسرے پر محض اس لئے چل دینا چاہیے کہ وہ آرام دہ ہے۔ پھر وہ چاہے کہیں بھی کیوں نہ لے جاتا ہو؟ یہی ــــ

(عورت دو کپ چائے لے کر داخل ہوتی ہے)

عورت : چلو، چائے پی لو

(عورت دونوں کو چائے کے کپ دیتی ہے)

عورت : سدھیر، تم نے آگے کی پڑھائی کے لئے کیا سوچا ہے؟

سدھیر : میں نے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے لئے آج ہی فارم بھرا ہے، ماتا جی۔

عورت : تو ذرا، اپنے اس دوست کو بھی سمجھاؤ نا۔ اس کے سر پر تو ملٹری میں بھرتی ہونے کا بھوت سوار ہوا ہے۔

سدھیر : یہ تو اس کی پرانی خواہش ہے۔

عورت : یہ کیسی خواہش ہے!! جس میں جان کو خطرہ ہو۔

سدھیر : ویسے تو بمبئی میں آج کل خطرہ کس بات میں نہیں ہے؟ آدمی صبح کو گھر سے کام پر نکلا تو کوئی یقین نہیں کہ وہ شام کو حفاظت سے گھر لوٹے گا۔

عورت : اس کا مطلب یہ تھوڑے ہی ہے کہ جان بوجھ کر کنویں میں کودا جائے

سدھیر : ایسا تو نہیں۔۔۔۔

عورت : ۔۔۔۔اور پھر ماں باپ کے لئے بھی تو اس کا کوئی فرض بنتا ہے۔ اس کے پتا جی نے کتنی مصیبتیں اٹھا کر اسے پڑھایا ہے۔ یہ سب کیا یہ نہیں جانتا؟

سدھیر : وہ تو صحیح ہے، مگر۔۔۔

عورت : میں تو ایک ہی بات کہتی ہوں۔ دیکھو بیٹے، کچھ بھی بنو کچھ بھی نہیں بننا ہے، تو نہ سہی۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری ہی کر لو، مگر رہو ہماری نظروں کے سامنے (کھوئی سی)۔۔۔ بجھتی شام میں گھر میں ایک آدھ چراغ جلتا ہو تو کچھ سوجھتا ہے بیٹے ورنہ اندھیروں میں ہاتھ مارنے کی نوبت آجاتی ہے۔

مہندر : ممی، آپ لوگ بات کو صرف یک طرفہ ہی سوچ رہے ہیں، میں اگر ایئر فورس میں بھرتی ہو گیا تو چوبیسوں گھنٹے آسمان میں تھوڑے ہی اڑتا رہوں گا۔

عورت : چوبیسوں گھنٹے آسمان میں نہیں رہو گے مگر ہر وقت خطرہ کی تلوار تو تمہاری گردن پر تنی رہے گی۔ تلوار تمہاری گردن پر ہوگی اور جان ہماری نکلتی رہے گی۔ تمہیں سوچو بیٹے، تمہاری گردن پر لٹکتی تلوار کو ٹکٹکی باندھے ہم کیسے اور کب تک سانس لے سکتے ہیں؟

مہندر : مگر ممی، میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ۔۔۔۔

جگناتھ : (ہاتھ پونچھتے ہوئے، داخل ہوتا ہے) ارادہ تو ہم نے بھی کرلیا ہے۔

(عورت جلدی سے چائے کے خالی کپ لے کر اندر جاتی ہے)

سدھیر : نمستے انکل

جگناتھ : نمستے۔۔۔ سدھیر، اپنے دوست سے کہہ دو، کہ وہ اپنے ارادوں سے باز آئے۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ ہمارے خاندان کو لاوارث کرنے ملٹری میں بھرتی ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس سال کا گولڈ میڈلسٹ ہمارا بیٹا اپنے بڑھیا مارکس کو کسی بھی ایسے بیہودہ ارادوں کے پیچھے ضائع کر دے۔ جس سے کوئی مستقبل نہ بنتا ہو۔

مہندر : محض اس لئے کہ آپ نہیں چاہتے، میں اپنے منصوبے ترک کردوں؟

جگناتھ : ہاں، ہم تیرے ماں باپ ہیں۔ ہم نے تجھے پیدا کیا ہے۔ تیرا مستقبل بنانے کا فرض ہم پر عائد ہوتا ہے۔

مہندر : میں اسے قبول نہیں کرتا۔

جگناتھ : تو مجھے قبول کروانا پڑے گا۔

مہندر : مگر پتا جی۔۔۔

جگناتھ : مگر وگر کچھ نہیں۔ تو کیا سمجھتا ہے؟ تو مجھ سے جبراً اس کاغذ کے ٹکڑے پر دستخط کروالے گا؟ ہونہہ۔ بیٹے، فارم میں بھی لایا ہوں (فارم اٹھا کر) یہ لے۔ کر دستخط

مہندر : کیا ہے؟

جگناتھ : ہے۔ میڈیکل کالج کے داخلہ کا فارم

مہندر : میں ڈاکٹر بننا نہیں چاہتا۔

جگناتھ : میں چاہتا ہوں۔ میں۔

مہندر : پتا جی آپ۔۔۔۔۔

جگناتھ : میں زبان لڑانے کا عادی نہیں ہوں۔ دستخط کر۔

مہندر : نہیں۔

جگناتھ :(تھپڑرسید کرتے ہوئے) کیا کہا؟

عورت خوف زدہ ہوکر دوقدم آگے بڑھ کر رک جاتی ہے سدھیر پریشانی محسوس کرتا ہے۔مہندر اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر خلاء میں دیکھنے لگتا ہے۔رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں اور ویسے ہی آہستہ آہستہ روشنی کم ہوتے ہوئے اندھیرا چھاجاتا ہے۔

اندھیرا

کچھ پل بعد دھیرے دھیرے روشنی پھیلنے لگتی ہے۔جگناتھ کورٹ کے کٹہرے میں ٹھہرا ہوا ہے۔مہندر کٹہرے کے باہر ہے۔

مہندر :مسٹر جگناتھ، آپ نے اس طرح مجھ سے جبراً دستخط کروائے تھے؟

جگناتھ :میری جگہ پر اور کوئی باپ ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔

مہندر :میرا سوال صرف آپ سے ہے، آپ نے ویسا کیا تھا یا نہیں؟

جگناتھ :کیا تھا۔

مہندر :ٹھیک ہے۔مسٹر جج، میں ان سے اور کچھ پوچھنا نہیں چاہتا۔

جگناتھ ناظرین کی طرف ہاتھ جوڑ کر کٹہرے سے نکل کر باہر جاتا ہے۔مہندر کٹہرے میں آکر ٹھہرتا ہے۔

مہندر :اب میں، اپنی والدہ سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔

: (آدمی اردلی کی طرف دیکھتا ہے اردلی باہر جاتا ہے)

مہندر :مسٹر جج۔ایسے میری سوچ میرے ارادوں اور میری آرزوؤں کا جبراً مذہب بدلا گیا۔ انھوں نے میرے خوابوں کے پر کاٹ دیئے، تاکہ وہ پرواز نہ کرسکیں، اور اپنی تھکی ہاری آرزوؤں کی صلیب کو میرے خوابوں کے کاندھوں پر ڈال دیا۔مگر میں کبھی بھی ان کے خوابوں کے خدا کی عبادت نہ کرسکا اور نہ ہی اپنے خوابوں کو بھول سکا۔

(عورت سر کا پلو سنبھالتے ہوئے داخل ہوتی ہے۔مہندر کٹہرے سے باہر آکر عورت کا ہاتھ پکڑ کر اسے کٹہرے میں آنے میں مدد کرتا ہے)

آدمی :اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ تم جو کچھ بھی کہوگی سچ کہوگی۔سچ کے سوا کبھی

بھی نہیں کہوگی۔

عورت : میں قسم کھاتی ہوں، میں سچ کہوں گی۔

آدمی : نام؟

عورت : شکنتلا۔

آدمی : پتی کا نام؟

(عورت کچھ الجھن سی محسوس کرتی ہے)

عورت : ابھی ابھی، جو بیان دے کر گئے وہ میرے پتی ہیں۔

آدمی : ان کا نام بتاؤ؟

عورت : جی۔۔۔۔جی، ہمارے میں عورتیں پتی کا نام نہیں لیتیں۔

آواز : کورٹ نے تم سے تمہارے پتی کا نام پوچھا ہے، اس لئے تمہیں نام بتانا ہوگا۔

عورت : جی۔۔۔۔ان کا نام۔

(عورت کرب بھری آنکھوں سے مہندر کو دیکھتی ہے۔ مہندر کٹہرے پر رکھے اس کے ہاتھ کو ہلکے سے تھپتھپاتا ہے۔ عورت اپنا ہاتھ وہاں سے ہٹا لیتی ہے)

عورت : جی، ان کا نام۔۔۔۔پوجیہ جگناتھ جی ہے۔

(آدمی اپنی جگہ پر جا کر بیٹھتا ہے)

مہندر : ہاں تو، شریمتی شکنتلا دیوی، جس وقت مار پیٹ کر مجھ سے دستخط کروائے گئے۔ اس وقت آپ وہاں موجود تھیں؟

عورت : (سر ہلا کر) ہاں

مہندر : اور کون تھا؟

عورت : سدھیر

مہندر : سدھیر

مہندر : جب آپ کے پتی نے مجھے تھپڑ مارا تو آپ نے کیا محسوس کیا؟

عورت : مجھے دکھ ہوا۔

مہندر : کیوں؟

عورت :تم میرے بیٹے ہو، میری موجودگی میں انھوں نے تمہیں ماراس لیے مجھے دکھ ہوا۔

مہندر : آپ نے صرف دکھ محسوس کیا! اور کچھ نہیں؟

عورت :اور کیا محسوس ہو سکتا ہے، اس وقت؟

مہندر : آپ نے اس وقت یہ محسوس نہیں کیا کہ ایک انسان سے اس کے سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے کی آزادی چھینی جا رہی ہے؟

عورت :نہیں

مہندر : کیوں؟

عورت : ہم تمہارا برا تو نہیں چاہتے تھے؟

مہندر : آپ میری بھلائی چاہتے تھے؟

عورت :ہاں۔ اب بھی چاہتے ہیں۔ ہمیشہ چاہیں گے۔

مہندر : میں جب 1st M.B.B.S. میں بہت گھٹیا مارکس لے کر پاس ہوا تو آپ نے کیا محسوس کیا؟

عورت : بہت ہی دکھ ہوا۔ مجھے بھی اور انھیں بھی۔

مہندر :اور؟

عورت : اور میں نے محسوس کیا کہ تم بہت ہی غمگین اور تنہا رہنے لگے ہو۔

مہندر :مسٹر جگناتھ نے کیا سوچا؟

عورت :ان کی رائے تھی کہ تمہاری منگنی کسی ایسی لڑکی سے کر دی جائے، جو ڈاکٹری پڑھتی ہو۔

مہندر : کیوں؟

عورت : تا کہ اس کی صحبت میں تم پڑھائی کی طرف ٹھیک سے توجہ دینے لگو۔ مگر۔۔۔۔۔

مہندر :مگر ویسا نہ ہوا۔ ہے نا؟

عورت :(رونے لگتی ہے) ہاں۔

(مہندر دھیرے سے عورت کا ہاتھ تھپتھپاتا ہے۔ عورت اس کا ہاتھ پکڑ کر روتے

ہوئے، ہاتھ کو چوم کر گالوں سے لگاتی ہے۔ مہندر آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتا ہے۔)

مہندر : روئیے مت، ماضی پلٹ کر رونے والوں کے آنسو پونچھنے کبھی نہیں آتا۔ مسٹر جج میں ان سے اور کچھ پوچھنا نہیں چاہتا۔

(عورت آنسو پونچھتے ہوئے کٹہرے سے باہر جاتی ہے۔ مہندر کٹہرے میں آکر کچھ دیر خاموش ٹھہرتا ہے۔)

مہندر : ہاں تو، مسٹر جج، میں نے .1st M.B.B.S کے امتحان کو تو ہچکولے لیتے ہوئے، کسی طرح پار کر لیا۔ مگر آگے مسلسل دوبارہ ناکام رہا۔ میرے ساتھی مجھ سے آگے نکل گئے۔ ایک طرف ماں کا دکھ دوسری طرف باپ کی زہر اگلتی زبان، میں رفتہ رفتہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ صرف لوگ ہی نہیں، اطراف کا ماحول بھی مجھے حقارت کی نظروں سے گھور رہا ہے۔ میں نے اس، دم گھونٹنے والے ماحول میں چند چہروں کو اتنی تفصیل سے پڑھا کہ میرے جینے کی خواہش گوتم بدھ بنتی چلی گئیں۔ وہ جوش، وہ ولولے، جو خلاؤں میں غوطہ لگا کر ستاروں کی دھڑکنوں کی موسیقی کو اپنی پھڑکتی رگوں میں بھر لینا چاہتے تھے۔ وہ سب سرد پڑ گئے۔ زندگی کے چمن سے، لطف لفظ کی خوشبو ہی اڑ گئی، رشتے ناطے، برادری، یارانے سب بے معنی، بدرنگ، لجلجے سے محسوس ہونے لگے۔ پھر بھی، نہ تو میں مر سکا اور نہ ہی گوتم بدھ بنا۔ کیونکہ روح خوابوں کے کانٹوں میں اٹکی ہوئی تھی۔۔۔ انھیں دنوں میں کچھ ایسے ساتھیوں کی صحبت میں آیا جو یا تو کسی نہ کسی وجہ سے احساس کمتری کے شکار تھے یا ماحول سے اکھڑ کر باغیانہ سوچ کے مالک بن بیٹھے تھے۔ وقت گذرتا گیا، صحبت کے رنگ گہرے ہوتے چلے گئے اور رنگوں میں سے کچھ بدشکل نقوش ابھرے۔ عادتوں کی صورت میں۔۔۔ موسیقی کے ساتھ اندھیرا ہونے لگتا ہے۔ جیسے جیسے اندھیرا گھنا ہونے لگتا ہے تو موسیقی کے ساتھ چیخنے، کراہنے کی آوازیں ابھرنے لگتی ہے۔

اندھیرا

کچھ پل بعد اجالا ہونے لگتا ہے۔ اجالے کے ساتھ موسیقی کم سے کم تر ہوتے ہوئے

خاموشی ہو جاتی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں۔ مہندر کرسی پر بیٹھا سنجیدگی سے پڑھ رہا ہے۔ اتنے میں اوپر سے ہوائی جہاز کے گزرنے کی آواز آتی ہے۔ مہندر اس آواز کو سن کر ایک عجیب کشش کے ساتھ اٹھ کر، بالکنی میں آ کر آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر اداس کھویا کھویا سا اپنی جگہ پر لوٹتا ہے۔ عورت چائے کا کپ لئے داخل ہوتی ہے۔ وہ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کر مہندر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔

عورت : چائے پی لو بیٹے۔

مہندر : (چونک کر) ہونہہ؟

عورت : چائے پی لے۔

مہندر : اونہوں۔

عورت : پی لے بیٹے۔

مہندر : (غصہ سے) نا کہا نا۔ چائے پینی ہو تو بھی دوسروں کی مرضی سے اٹھنا بیٹھنا دوسروں کی مرضی سے کھانا پینا دوسروں کی مرضی سے سالی ہماری مرضی تو جیسے کوئی چیز ہے ہی نہیں۔

عورت : تھکان دور ہو جائے گی، پی لے بیٹے۔

مہندر : نہیں، نہیں، نہیں نہیں پیوں گا۔ آپ لوگ کیوں ہر وقت اپنی مرضی کو میرے اوپر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عورت : ایسا نہیں کہتے۔ اب تو کچھ ہی مہینے رہ گئے ہیں، امتحان کو۔

مہندر : بھاڑ میں جائے امتحان

عورت : ایسے پریشان نہیں ہوتے۔ اب تو تو آدھا راستہ طے کر چکا ہے۔

مہندر : اسی کا تو غم ہے۔ کنارے پر ڈوبا ہوتا تو کہہ سکتا تھا کہ مجھے تیرنا ہی نہیں آیا۔ اب تو میری حالت دھوبی کے کتے جیسی ہو گئی ہے۔ میں تو نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔

عورت : اچھا چل، چائے نہیں پینی تو نہ سہی۔ کچھ کھائے گا؟ لا دوں؟

مہندر : ہاں۔

عورت : کیا کھائے گا؟

مہندر : زہر۔ زہر لا دو مجھے۔

عورت : کیا ہو گیا ہے تجھے؟ آج کل ہر وقت جھگڑنے پر آمادہ رہتا ہے تو۔

مہندر : پاگل ہو گیا ہوں۔ پاگل۔ سمجھی

عورت : ہم نے کیا برا کیا ہے تیرا؟ جو ایسی باتیں کرتا ہے تو۔

مہندر : بھلا بھی کیا کیا ہے۔ جو اس سے اچھی امید کرتی ہو تم؟

عورت : ہاں، ہاں۔ ہم نے برا ہی برا کیا ہے تیرا۔ تجھے پیدا کیا، برا کیا۔ تجھے بڑا کیا برا کیا۔ تجھے پڑھایا لکھایا برا کیا۔ تیرے پتا جی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تجھے دو حرف پڑھنا کیا آ گیا ہے کہ۔۔۔۔۔۔

مہندر : میں اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ یہی نا؟

عورت : ہاں۔

مہندر : میں اپنے آپ کو کچھ کیا خاک سمجھوں۔ آپ لوگوں نے مجھے کچھ بننے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔

عورت : عمر بھر یہی رونا روتے رہے گا۔ یا کچھ آگے کی بھی سوچے گا؟ تیرے پتا جی کی طرف دیکھ، ان کی عمر کا خیال کر، کچھ ہی دنوں میں وہ ریٹائر ہونے والے ہیں۔ گھر کا خرچ بھی تو چلانا ہے۔ انھیں۔ گھر چلانے میں ان کی مدد نہیں کر سکتا، نا سہی۔ مگر کبھی تو نے اتنا بھی کہا ہے ان سے کہ آج آپ آرام کیجئے سودا سلف میں لے آتا ہوں۔ سارا دن دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اس پر لونگ لکڑی کی فکر۔ ڈھلتی عمر میں آدمی کتنا کچھ کرے گا! مانا کہ ہم نے تیری مرضی کے خلاف ڈاکٹر بننے کو کہا۔ ڈاکٹر ہی تو بننے کا کہا، کوئی چور ڈاکو تو بننے کو کہا۔ جو تو آج تک اسی بات کو پکڑ کر بیٹھا ہے۔۔۔ سن رہا ہے، میں تجھ سے کہہ رہی ہوں، تجھ سے۔۔۔ تو کالج میں آیا تب تک ہر سال امتحان میں اول آتا رہا۔ اور اب۔۔۔ اب دو سالوں سے۔۔۔ اب تو کیا اول نہیں آ سکتا؟ کیوں؟ بتا۔ کیوں نہیں آ سکتا؟ (خاموشی) دیکھو بیٹے، جو بات ہونی تھی، ہو گئی۔ اب اسے

بھول جا۔ جا گے، تب سے سویرا۔۔۔ لے چائے پی لے، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

(مہندر جھٹکے کے ساتھ چائے کے کپ کو گرا کر بالکنی کے پاس جاتا ہے)

مہندر : نہیں پینی ہے مجھے چائے۔

یہاں سارا جسم جل رہا ہے۔ وہ کیوں نہیں دکھتا ممی تجھے؟

(اتنے میں ہوائی جہاز کے گذرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مہندر غور سے اسے ہنستے ہوئے اس طرف دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں۔)

مہندر : (رونی سے آواز میں) ممی۔۔۔ممی کیا ہم یہ مکان بدل کر کہیں اور رہنے نہیں جا سکتے؟

عورت : کیوں؟ یہاں تجھے کیا تکلیف ہے بیٹے؟

مہندر : تکلیف۔۔۔ نہیں تکلیف تو کچھ نہیں ہے مگر۔۔۔ مگر یہ آواز۔۔۔ (رونے لگتا ہے) یہ آواز مجھے ڈاکٹر بننے نہین دے گی ممی۔

عورت : میں سمجھ سکتی ہوں بیٹے، ایسی آواز میں پڑھنا تو پڑھنا سونا بھی کتنا مشکل ہوتا ہے (ٹوٹے کپ، رکابی کے ٹکڑے سمیٹتے ہوئے) میں شادی کر کے آئی تھی، تب تو شروع شروع میں مہینوں سو نہیں پائی تھی۔ آج بھی کئی بار نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔

مہندر : تمہیں یہ آواز سونے نہیں دیتی ممی، مگر مجھے یہ جینے نہیں دیتی۔

عورت : کیا کریں بیٹے، اس آواز کو روکا بھی تو نہیں جا سکتا۔ ہوائی اڈہ قریب ہونے سے۔۔۔ خیر، تو فکر نہ کر میں تیرے پتا جی سے بات کر کے دیکھوں گی۔

(عورت کپ، رکابی کے ٹکڑے لے کر اندر جاتی ہے۔ مہندر کی آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں۔ اسے گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگتی ہے، جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ وہ جھٹ سے ٹیبل کی دراز کھول کر اس میں سے انجکشن کا ایمپیول اور سرنج نکال کر، شرٹ کی آستین کے اوپر کر کے، بانہہ میں انجکشن لگاتا ہے اتنے میں باہر سے جگناتھ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مہندر جلدی سے سیرنج دراز میں رکھ دیتا ہے۔ دوا کی ایمپیول وہیں رہ جاتی ہے)

جگناتھ : (باہر سے) ویسا کرنے سے شاید۔۔۔

آدمی : (باہر سے) جے رام جی کی لالہ جی۔

جگناتھ : جے رام جی تیواری جی۔

آدمی : بازار گئے تھے؟

جگناتھ : ہاں بھئی، کیا کریں؟ دال آٹا بھی تو جٹانا ہے۔۔۔۔ ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ویسا کرنے سے وہ یقیناً کامیاب ہو جائے گا۔

(جگناتھ داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سبزیوں سے بھری ایک تھیلی ہے اس کے پیچھے پیچھے سدھیر داخل ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اناج سے بھری دو تھیلیاں ہیں، جگناتھ اپنی تھیلی بینچ پر رکھ کر، سدھیر سے تھیلیاں لیتا ہے۔)

جگناتھ : لاؤ بھئی لاؤ۔ بڑی تکلیف دی تمہیں۔

(وہ تھیلیاں لے کر اندر جاتا ہے۔ سدھیر، مہندر کے پاس آکر پیٹھ پر ہاتھ مارتا ہے)

سدھیر : کیوں یار، کیا چلا، (مہندر چونکتا ہے) کیوں کیا بات ہے؟

مہندر : میں۔۔۔۔ میں تو سمجھا۔۔۔۔

سدھیر : پتا جی ہیں؟

مہندر : ہاں۔

سدھیر : (ہنستا ہے) کیوں اکھاڑے میں اترنے کا ارادہ ہے کیا؟

مہندر : (جلدی سے آستین نیچے کرتے ہوئے)۔۔۔ مگر تم کب آئے؟

سدھیر : ابھی، انکل کے ساتھ یہیں آرہا تھا، راستہ میں وہ مل گئے۔ تو ساتھ ہولیا۔

مہندر : آج کل دکھتے ہی نہیں؟

سدھیر : کیا کروں یار، جب سے Housemenship کر رہا ہوں، مریضوں سے فرصت نہیں ملتی۔

مہندر : ہاں، اب تو تم ڈاکٹر بن گئے ہو۔

سدھیر : پورا نہیں، آدھا۔ ابھی دو مہینے اور ہیں، بس۔۔۔۔ پرسوں سے میری P & M کی ڈیوٹی پالگھرے کے ہسپتال میں لگی ہے۔ سوچ رہا ہوں۔ کل ہی پالگھر چلا جاؤں۔

تا کہ پرسوں سے ڈیوٹی جوائن کرسکوں۔

مہندر :آگے کیا ارادہ ہے؟

سدھیر :سیٹ ملی تو M.S. کروں گا، ورنہ پریکٹس

(عورت داخل ہوکر بینچ پر رکھی تھیلی کی جانب جاتی ہے)

عورت :ارے سدھیر، تم کب آئے؟

سدھیر :انکل کے ساتھ ہی آیا۔ آپ کیسی ہیں ماتا جی؟

عورت :اچھی ہوں بیٹے (تھیلی اٹھاتی ہے) تم کیسے ہو؟

سدھیر :اچھا ہوں۔

عورت :گھر میں سب کیسے ہیں۔

سدھیر :سب لوگ مزے میں ہیں۔

عورت :جانا نہیں، میں چائے بناتی ہوں۔

سدھیر :آپ اس وقت کیوں تکلیف اٹھائیں۔

عورت :ان کے لئے بنا رہی ہوں، تمہارے لئے بھی بن جائے گی۔۔۔مہندر۔تم چائے پیو گے؟

سدھیر :پئے گا۔ پئے گا کیوں نہیں؟ چائے تو اس کی پسند کی چیز ہے۔

عورت :کبھی کبھی پسند بھی ناپسند بن جاتی ہے۔ بیٹے۔ تب لوگ ہاتھ پاؤں اچھال کر بے جان کپ رکابیوں پر غصہ انڈیلتے پھرتے ہیں۔ (عورت اندر جاتی ہے)

سدھیر :کیا بات ہے؟ ماتا جی خفا دکھ رہی ہیں تم پر؟

مہندر :کچھ نہیں، یونہی۔ کچھ دیر پہلے چائے پینے پر زور دے رہی تھیں۔ میں نے طیش میں ہاتھ ہلا کر نا کہا۔ کپ ٹوٹ گیا۔

سدھیر :تو ابھی بھی تمہاری رفتار بے ڈھنگی ہی ہے۔

مہندر :(انجکشن کے اثر سے جوش میں آکر) نہیں سدھیر، اب میں نے طے کرلیا ہے، میں ڈاکٹر بنوں گا۔ ڈاکٹر، بہت بڑا ڈاکٹر۔

سدھیر : بہت اچھے، بہت خوب۔ چلو دیر آید درست آید۔

مہندر : کپ ساسر کے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی ایک ایسا زلزلہ سا محسوس کیا میں نے اپنے جسم میں۔ ایک ایسی جلن سی محسوس کی اپنے ذہن میں کہ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ پرانی سوچ کے لبادہ کو اتار پھینکا۔ اب میں بہت ہی ہلکا سا محسوس کرر ہا ہوں۔، اپنے آپ کو۔ بالکل تر و تازہ، کھلتی کلی سا ایسے لگتا ہے۔ جیسے میں اڑ سکتا ہوں۔ مگر میں اب اڑوں گا نہیں۔۔ میں نے سوچ کی جس نئی دھرتی پر پاؤں رکھے ہیں۔ وہاں اپنے قدم جماؤں گا۔ ڈاکٹر بننے کے لئے۔

سدھیر : اماں یار، تم نے شاعری کرنا کب سے شروع کی؟

مہندر : یہ شاعری نہیں ہے سدھیر۔ میری سوچ کے دریا نے رخ بدلا ہے۔ اب میں پڑھوں گا۔ خوب پڑھوں گا۔۔۔۔ سالی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے؟ ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے، تو پھر کیوں نہ اپنے ماں باپ کو خوش کر کے ہی مروں۔

سدھیر : مہندر، یہی بات تم دو چار سال پہلے سمجھتے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ ابھی راستے میں تمہارے پتا جی تمہاری ہی بات کرر ہے تھے۔ وہ بہت ہی پریشان ہیں تمہیں لے کر۔ تم دو بار امتحان میں فیل کیا ہوئے، وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔

مہندر : میں بہت ہی شرمندہ ہوں اس کے لیے۔

سدھیر : کہاں گولڈ میڈلسٹ مہندر اور کہاں آج کا یہ مہندر!!

مہندر : میں سب سمجھتا ہوں یار۔۔ مگر اب میں وعدہ کرتا ہوں۔ تیری قسم، میں ڈاکٹر بن کے دکھاؤں گا۔ وہ بھی گولڈ میڈل کے ساتھ۔

سدھیر : مہندر۔۔۔۔ تمہارے پتا جی، تمہاری منگنی کرنا چاہتے ہیں۔

مہندر : سچ!!! کون ہے وہ لڑکی۔

سدھیر : لڑکی کون ہے، نہیں معلوم۔ مگر اتنا کہا انھوں نے کہ وہ بھی میڈیکل میں ہی پڑھتی ہے۔

(عورت دو کپ چائے لے کر داخل ہوتی ہے)

عورت :سدھیر بیٹے۔اچھا ہوا جوتم آج آگئے۔دیکھو نا۔کئی دنوں سے صبح اٹھنے پر مجھے کمر میں درد رہتا ہے۔کوئی دوا لکھ دو بیٹے۔

سدھیر :دوا تو میں لکھ دوں گا ماتا جی،مگر میں تو ابھی آدھا ڈاکٹر ہوں۔کہتے ہیں نا۔نیم حکیم خطرۂ جان۔

عورت :نہیں نہیں بیٹے،تمہارے ہاتھوں میں گن ہے۔اس دن تم نے جو گولیاں لکھ دی تھیں نا۔دو گولیاں لیتے ہی بخار غائب ہو گیا تھا۔۔سچ پوچھو نا بیٹے، بڑی تمنا تھی بڑھاپے میں مہندر کے ہاتھوں علاج کراتے کراتے آنکھ موند لینے کی۔مگر نہ جانے یہ کب ڈاکٹر بنے گا۔مہندر کتاب بند کر کے،اٹھ کر اپنی ماں کے پاؤں پکڑتا ہے۔کتاب کی جلد کے نیچے پڑی انجکشن کی خالی ایمپول پر سدھیر کی نظر پڑتی ہے وہ اسے اٹھا کر لیبل پڑھتا ہے۔دوا کا نام پڑھ کر چونکتا ہے اور ایمپول جیب میں رکھ لیتا ہے۔

مہندر :(پاؤں پکڑ کر)نہیں ممی،اب میں ڈاکٹر بنوں گا(روتے ہوئے)میں نے آپ لوگوں کو بہت دکھ دیئے ہیں۔اس کے لیے مجھے معاف کرو۔معاف کرو ممی عورت اسے اٹھاتی ہے۔

سدھیر :مہندرtake it easy, take it easy

عورت :چائے پی لو بیٹے۔

عورت دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے ،اندر جاتی ہے۔وہ دونوں خاموش ہلکے ہلکے چائے کے گھونٹ لینے لگتے ہیں۔سدھیر بالکنی کے پاس آکر آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔

مہندر :کچھ بھی کہو یار،ممی کے ہاتھ کی چائے بہت بڑھیا بنتی ہے۔

سدھیر :ہوں۔

مہندر :میں چھوٹا تھا تب ایک بار بیمار پڑ گیا۔بیماری کی وجہ سے منہ کا ذائقہ اتنا خراب ہو گیا کہ کچھ کھاتے نہیں بن پا رہا تھا۔انھیں دنوں میری موسی آئی ہوئی تھیں۔انھوں نے کہا۔مہندر چائے پی لو۔میں نے انکار کیا۔کہنے لگیں بیٹے۔ایک بار اپنی ماں کے ہاتھوں بنی

چائے پی کرتو دیکھ، تب پتہ چلے گا۔ چائے کسے کہتے ہیں۔ بس، تب سے منہ کو لگی چھٹتی ہی نہیں۔

سدھیر :ہوں

مہندر :یہی سبب ہے، مجھے ہوٹل ووٹل کی چائے اچھی نہیں لگتی۔

سدھیر :ہوں۔

مہندر :دن میں ایک بار بھی ماں کے ہاتھوں کی بنائی چائے مل جائے نا، تو طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔

سدھیر :ہوں

مہندر :ان کے ہاتھوں کی چائے پی لوں تو لگتا ہے۔۔۔

سدھیر :کہ تم اڑ رہے ہو۔

مہندر :ہاں۔

سدھیر :اپنے آپ کو ہلکا سا محسوس کرتے ہو، کھلتی کلی سا۔

مہندر :ہاں۔

سدھیر :اور محسوس کرتے ہو کہ تمہاری سوچ کا دریا رخ بدل رہا ہے۔

مہندر :ہاں، مگر۔۔۔مگر یہ بات تو۔۔۔

سدھیر :کچھ دیر پہلے تم ہی نے کہی تھی۔۔۔نہیں مہندر، یہ سب تم نہیں بول رہے تھے۔ یہ تو دوا بول رہی تھی، جو اس وقت تمہاری رگوں میں۔۔۔

مہندر :دوا؟ کون سی دوا؟

سدھیر خالی ایمپیول جیب سے نکال کر دکھاتا ہے۔ مہندر ایمپیول دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔

سدھیر :مہندر! میں نے سنا تھا کہ تم اسٹوڈنٹ یونین کے رکن بن کر ہڑتالوں کے ہنگاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہو۔ میں نے سوچا تم اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حقوق کے لئے لڑ رہے ہو۔ پھر سننے میں آیا۔ تم نے مینڈریکس لینا شروع کی ہے۔ مگر نوبت

یہاں تک آئی ہے، وہ مجھے نہیں معلوم تھا۔مگر اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ ان ہنگاموں میں پیش پیش رہنے کی قوت تم میں کہاں سے آتی تھی۔ وہ آگ برسانے والے نعروں کی زبان تمہاری اپنی زبان نہیں تھی۔ وہ ان دواؤں سے ادھار لی ہوئی زبان تھی۔

مہندر :اپنے حقوق کے لئے جہاد کرنا گناہ ہے؟

سدھیر :نہیں۔۔تم نے دواؤں سے طاقت حاصل کر کے جو نعرے اگلے ہیں اس کے لئے مجھے اتنا افسوس نہیں۔مگر آج تم نے اس انجکشن کے اثر میں آ کر جن جذباتی خیالوں اور حرکات کا مظاہرہ کر کے اپنی بوڑھی ماں کے دل میں امید کی جو نئی کرن روشن کی ہے، اس کا بڑا دکھ ہے مجھے۔

مہندر : چھوڑو یار، تم تو پھر نصیحت کرنے بیٹھ گئے۔تمہیں تو کوئی پنڈت، مولوی ہونا چاہئے تھا۔غلطی سے ڈاکٹر بن بیٹھے ہو۔ارے بھئی جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے طے کر لیا ہے کہ۔۔۔۔

جگناتھ ہتھیلی پر بڑی سونف لئے داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے عورت ہاتھ میں بڑے سونف کی بوتل لئے آتی ہے۔

جگناتھ :(سونف منہ میں ڈال کر) چائے پی لی سدھیر تم نے؟

سدھیر :جی ہاں۔

عورت :لو سونف لو گے؟

سدھیر ہتھیلی پر سونف لیتا ہے تھوڑی کھا کر بچی ہوئی سونف مہندر کو دیتا ہے۔

سدھیر :اچھا ماتا جی میں چلتا ہوں۔

عورت : کیوں بیٹھو گے نہیں؟

سدھیر : مجھے ابھی ذرا کاندھیوالی جانا ہے۔ایک دوست سے ملنے۔مہندر، ذرا میرے ساتھ چلو۔

مہندر : کہاں؟ کاندھیوالی؟

سدھیر :نہیں، ذرا نکڑ تک۔

مہندر :نہیں۔ مجھے پڑھنا ہے۔

سدھیر :مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔

عورت :جاؤ تھوڑی دیر کھلی ہوا میں گھوم آؤ، پھر بیٹھنا پڑھنے۔

مہندر :نہیں ممی، مجھے پڑھنا ہے۔

سدھیر :ارے ہاں، ماتا جی، آپ کہہ رہی تھیں نا کہ آپ کی کمر میں درد ہوتا ہے۔

عورت :ہاں بیٹے۔۔۔۔۔

جگناتھ :اس سے پوچھو تو سہی۔ اس کے جسم میں ایسا کون سا جوڑ ہے۔ جہاں درد نہیں ہوتا۔

عورت :ان کی باتوں میں نہ آنا بیٹے۔ تم دوا لکھ دو۔

سدھیر :مہندر، تمہیں کیا لگتا ہے، (جیب سے ایمپیول نکال کر) ان کی کمر کے درد کے لئے یہ انجکشن کیسا رہے گا؟

مہندر چونک کر، پریشان ہو جاتا ہے۔

عورت :انجکشن کیوں دیتے ہو بیٹے کوئی گولی لکھ دو نا۔

مہندر : (جلدی سے) ہاں ہاں بیکار میں انجکشن کیوں دیتے ہو! چلو، میں چلتا ہوں نکڑ تک۔ تمہیں چھوڑ بھی دوں گا اور آتے آتے گولیاں بھی لیتے آؤنگا۔ چلو چلو چلو۔

سدھیر :جیسی تمہاری مرضی، ورنہ میں نے تو سوچا۔۔۔۔

مہندر :اب سوچتے ہی رہو گے یا چلو گے بھی۔ چلو چلو۔

مہندر اسے جبراً کھینچ کر لے جاتا ہے۔

جگناتھ :سدھیر! لڑکا بڑا ہونہار ہے۔

عورت :ہاں! مگر مہندر نے بھی طے کر لیا ہے کہ وہ ڈاکٹر بن کر دکھائیگا۔

جگناتھ :وہ طے کرے یا نہ کرے، تم دیکھتی جاؤ، میں اسے ڈاکٹر بنا کر ہی دم لوں گا۔۔۔ میں آج گیا تھا ہوں۔۔۔۔

عورت :کہاں؟

جگناتھ :جگل کشور بترا کے وہاں

عورت :ا کیسے گئے تھے؟

جگناتھ :وہ میری سسرال ہے؟ جوا کیلے جاتا، ہونہہ۔۔۔۔رام پرساد کو لے کر گیا تھا۔

عورت :کیا کہا انھوں نے؟

جگناتھ :باقی تو سب ان کے حلق میں اتار کر آیا ہوں۔ بات اٹکے گی تو وہیں اٹکے گی۔

عورت :کہاں؟

جگناتھ :پوچھ تو ایسے رہی ہو، جیسے بات تیرے پوت کی نہیں، کسی اور کی ہو رہی ہے۔

عورت :سمجھی۔ارے آپ کہہ دیتے کہ اس کی صحت اچھی نہیں تھی اس لیے وہ امتحان میں۔۔۔

جگناتھ :بیوقوفوں سے پالا پڑ جائے تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ارے، جب انھوں نے پوچھا نہیں تو کیا مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے جو بتا دیتا تیرے پوت کے کارنامے۔۔۔ویسے جگل کشور تو یہ سب پوچھے گا نہیں۔ کبوتر کے بچے جیسا آدمی ہے مگر لڑکی کا کہہ نہیں سکتے، پڑھی لکھی ہے۔

عورت :کہاں تک پڑھی ہے؟

جگناتھ :اس نے تو اسی سال ڈاکٹری پاس کی ہے، اور تیرے بڑھاپے کی لاٹھی ابھی دوسرے سال میں ہی لنگڑا رہا ہے۔۔۔خیر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔۔۔۔رام پرساد نے ذمہ تو لیا ہے، لڑکی کی کھوج کرنے کا۔حرام زادے نے پورے پانچ سو اینٹھ لیے ہیں مجھ سے ،اس کام کے لئے۔

عورت :لڑکی کیسی ہے؟

جگناتھ :تم سے اچھی ہے۔

عورت :آپ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے جو ہر وقت۔۔۔۔

جگناتھ : لٹکے تو ایسے کر رہی ہو، جیسے مٹھی میں سونے کا سکہ لے کر نکلی ہو۔ ہونہہ، پوچھ رہی ہے۔لڑکی کیسی ہے۔

عورت :کہے دیتی ہوں پہلے میں لڑکی دیکھوں گی، مجھے پسند آئی۔۔۔۔

جگناتھ :ہاں ہاں دیکھ لینا۔اور اپنے لاڈلے کو دکھا دینا۔مگر یہ مت بھولنا تیری مٹھی میں سونے کا

سکہ نہیں ہے، کھوٹا سکہ ہے کھوٹا سکہ جسے تم بھنانے نکلی ہو۔

عورت : کھوٹا کیسے ہے؟ سونے کا ہے۔ کھرے سونے کا۔ دو سال امتحان میں فیل ہوا تو کیا ہوا؟ اس نے پہلے، سونے کا میڈل نہیں لیا کیا اس نے؟

جگن ناتھ : تو اس سے کہو، اس میڈل کو گلے میں باندھ کر پھرے۔ (روشنی کم ہونے لگتی ہے) لڑکی والے پہلے یہ پوچھتے ہیں کہ لڑکا کرتا کیا ہے؟ پڑھتا ہے؟ پڑھتا ہے تو کیا پڑھتا ہے؟ یہ نہیں پوچھتے کہ اس نے کتنے شیر مارے ہیں۔ میں آج کی بات کر رہا ہوں، تب بیگم پرانے تکیوں کے غلاف پھاڑنے بیٹھ گئیں۔۔۔۔۔

روشنی کم سے کم تر ہوتی چلی جارہی ہے۔ اب ان دونوں کی باتیں سنائی نہیں دیتیں۔ جگن ناتھ کے چہرے کے تاثرات اور حرکات سے لگ رہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو لتاڑ رہا ہے۔ عورت بھی کچھ کہتی ہے۔ پھر آنسو پونچھتے ہوئے خالی کپ لے کر اندر جانے کو مڑتی ہے اتنے میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔

مہندر کی آواز: (اندھیرے میں) مسٹر جج، اس طرح، مجھے زندگی کے ایک نئے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ لوگوں کی زندگی میں نئے نئے موڑ آتے ہیں۔ تب میری زندگی میں یہ موڑ قصداً لایا گیا۔ میں گھبرائے ہرن کی طرح اس موڑ پر مڑا، مگر بہت ہی جلد مجھے وہ موڑ راس آ گیا۔ وہ نئی راہ مجھے اچھی لگنے لگی۔ اس راہ پر ہر وقت ایک بھینی بھینی سی خوشبو میری گواہ تھی۔ اس خوشبو سے میری حالت اس ہرن کی سی ہونے لگی، جو خوشبو کے سہارے کستوری کی تلاش میں بھٹکتا ہے۔

ہلکے سے روشنی ہونے لگتی ہے۔ مہندر بالکنی میں ٹھہرا آسمان کی جانب دیکھ رہا ہے۔

مہندر کی آواز: سدھیر کے پالگھر جانے کے تیسرے دن۔ میں سدھیر کو گلی کے نکڑ تک چھوڑنے گیا اس کے چوتھے روز، میری منگنی جگل کشور بترا کی لڑکی روپا سے کر دی گئی۔ میرے پتا جی اس بات سے حیران تھے کہ لڑکی نے میرے لئے کچھ دریافت کرنا تو درکنار، مجھے دیکھنا تک ضروری نہیں سمجھا۔ مسٹر جج۔ تو اس انداز سے روپا پیچ وخم سے الجھی میری زندگی میں، میری ہم سفر ہونے میری منگیتر بن کر آئی۔ روپا ہاتھ میں چائے کا

کپ لے کر داخل ہوتی ہے۔ اس کی نظریں مہندر کو کرسی پر نہ دیکھ کر، یہاں وہاں ڈھونڈتی ہیں، مہندر کو بالکنی میں کھڑا دیکھ کر وہ چائے کپ ٹیبل پر رکھ کر اس کے قریب آتی ہے اور اشارے سے پوچھتی ہے کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ مہندر آہ بھرتا ہے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ٹیبل کے قریب لاتی ہے اور اسے چائے کا کپ دیتی ہے۔ مہندر چائے پینے لگتا ہے۔

مہندر کی آواز: میں اس چاہت میں موم کی طرح پگھلتے چلا گیا۔ رشتہ ناطوں میں پھر ایک بار مہک سی اٹھنے لگی۔ کالج، یونین، نعرے، ہڑتالیں سب ایک ایک کر کے چھٹتے چلے گئے۔۔۔۔ نہ چھوٹ سکی تو ایک چیز یا یوں کہوں کہ جسے میں نہ چھوڑ سکا، وہ ایک ہی چیز تھی۔ پیتھے ڈین۔ وہ انجکشن جس کے سہارے میں اس کی مسکراہٹوں کے گھیرے میں اپنے آپ کو مسکراتا رکھ کر، اس سے ہم قدم ہو سکتا تھا۔

مہندر چائے پی کر پڑھنے کے لئے کتاب اٹھاتا ہے۔ روپا کپ اٹھا کر اندر جانے سے پہلے پیار سے اس کے بالوں کو سہلاتی ہے۔ روپا کے اندر جاتے ہی مہندر جلدی سے جیب سے چابی نکال کر دراز کھولتا ہے۔ پھر سرنج بھر کر بڑی بے رحمی کے ساتھ پینٹ ہٹائے بنا ہی اپنی ران پر انجکشن لگا کر پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔ روپا لوٹتی ہے وہ بھی ایک ناول اٹھا کر پڑھنے بیٹھتی ہے۔ مہندر اسے اشارے سے اس کی کرسی اپنے قریب رکھ کر بیٹھنے کو کہتا ہے۔ وہ مسکرا کر ویسا کرتی ہے۔

مہندر کی آواز: میری زندگی میں اس کے آنے سے۔ مجھے ڈاکٹر بننا ہی چاہئے۔ ایسا چاہنے والوں میں ایک کا اضافہ ہوا۔ وہ دن رات بڑی لگن سے خدمت کرتے ہوئے میری پڑھائی میں دلچسپی لینے لگی۔ (روشنی کم ہونے لگتی ہے) روپا Housemanship کر رہی تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی میرے پاس چلی آتی۔ میں اس کے آنے تک اس کا انتظار کرنے لگا۔ وقت گذرتا گیا۔ وہ سمجھتی رہی کہ میں پڑھائی کر رہا ہوں اور میں اسے اپنے قریب بٹھا کر، کتاب میں آنکھیں ڈالے اس کے کنوارے جسم سے اٹھتی ہلکی ہلکی سی شبنمی خوشبو سمیٹتے رہا۔

اندھیرا

ہنے سے روشنی ہونے لگتی ہے۔مہندر پریشان حال کمرہ میں چکر کاٹ رہا ہے۔اس کے چہرے کے تاثرات اور ہاتھ کے حرکات سے لگتا ہے جیسے وہ کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ پھر وہ بالکنی میں آ کر نیچے کی طرف جھانکتا ہے۔ اتنے میں دروازے پر گھنٹی بجتی ہے۔ وہ لپک کر دروازے کی جانب جاتا ہے۔

مہندر :(باہر سے) یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے؟

آدمی :اپن تو روز اسی ٹائم کو آتا ہے۔

مہندر :ٹھیک ہے ٹھیک ہے لاؤ۔

دور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آتی ہے۔مہندر اخبار لیے داخل ہوتا ہے۔ وہ اخبار ٹیبل پر پٹکتا ہے اور کمرے میں چکر کاٹنے لگتا ہے۔

مہندر :(رک کر) ممی، ممی!

عورت :(داخل ہوتے ہوئے) کیا ہے؟

مہندر :یہ ابھی تک نہیں آئی نا۔

عورت :آتی ہی ہوگی۔کل اس کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ کہہ گئی ہے، ڈیوٹی ختم ہوتے ہی سیدھے یہیں آئے گی۔

مہندر :آئے گی وہ تو میں بھی جانتا ہوں، مگر کب آئے گی؟

عورت :دیکھو بیٹے، وہ ڈاکٹر ہے۔مریضوں سے۔۔۔۔

مہندر :وہ ڈاکٹر ہے، یہ مجھے معلوم ہے۔ایسا کہہ کر طعنہ کیوں مارتی ہو؟

عورت :میں نے طعنہ کب مارا ہے بیٹے!

مہندر :طعنہ نہیں مارا تو کیا آرتی اتاری ہے میری؟ کس نے کہا تھا میری منگنی کسی ڈاکٹرنی سے کرنے کو؟ ڈاکٹرنی ہی سے منگنی کرنی تھی، تو میرے ڈاکٹر ہونے تک انتظار کرنا تھا بس باندھ دی رسی گلے میں۔

(مہندر کا دایاں ہاتھ کانپنے لگتا ہے)

عورت :تم تیار تو ہو گئے ہو ناشتہ کرلو، تب تک وہ آجائے گی۔

مہندر : نہیں کرنا ہے ناشتہ مجھے۔

روپا ایک ہاتھ میں ایسپرن اور اُٹھتکسوپ لیے داخل ہوتی ہے۔عورت اسے دیکھتی ہے۔روپا مسکرا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتی ہے۔

عورت : کرلے بیٹے، وہ آتے ہی مجھ سے پوچھے گی تم نے ناشتہ کیا یا نہیں۔دودھ لیا یا نہیں

مہندر : یہ سب دکھاوے کی باتیں ہیں۔اتنی ہی فکر ہوتی تو اب تک آنہ جاتی اسے میرے کالج جانے کا ٹائم معلوم نہیں کیا؟ اب آتے ہی کہے گی I am Sorry مہندر کیا کروں، ہسپتال کا کام ہی ایسا ہوتا ہے۔۔۔ہسپتال، مریض۔۔۔۔کمبخت نے مجھے بھی مریض بنا کے چھوڑا ہے۔آئے تو کہہ دینا اس سے کہ مجھے ڈاکٹر نہیں بننا ہے۔میں اب کبھی اس کی صورت بھی۔۔۔۔

مہندر جانے کو مڑتا ہے تو سامنے روپا کو دیکھ، وہ اسے کچھ پل غصہ سے دیکھ کر پلٹتا ہے۔اب اس کا ہاتھ زوروں سے کانپنے لگتا ہے، آنکھیں بڑی ہو کر پھیلنے لگتی ہیں۔

روپا : I am Sorry,really I am Sorry Dear

عورت مسکراتے ہوئے اخبار لے کر اندر جاتی ہے، مہندر اپنے کانپتے دائیں ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے دبا کر پکڑ لیتا ہے۔

روپا : کیا بات ہے مہندر، تمہیں کیا ہورہا ہے۔

مہندر : کچھ نہیں۔

روپا اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھتی ہے وہ جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتا ہے۔

مہندر : کہا نا کچھ بھی نہیں۔مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔

روپا : (مسکراتے ہوئے) مجھ سے بھول ہوگئی معاف کرو۔آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔۔۔اچھا اب بھول جاؤ ڈیئر۔میں ناشتہ لے آتی ہوں۔

روپا اندر جاتی ہے۔مہندر جیب سے چابی نکال کر جھٹ سے دراز کھولتا ہے اور جلدی سے سرنج بھر کر حسب معمول اپنی ران پر انجکشن لگا کر سرنج دراز میں رکھتا ہے اور روپا داخل ہوتی ہے وہ اسے دراز میں کچھ رکھتے ہوئے دیکھتی ہے۔

روپا :(مذاق سے) مجھ سے چھپا کر کیا رکھا جا رہا ہے؟

مہندر :(چابی جیب میں رکھتے ہوئے) کچھ نہیں۔

روپا :ماتا جی نے آج اڈلی بنائی ہے۔ تمہیں بہت پسند ہے نا، اس لئے (مہندر خاموش رہتا ہے) اتنی چھوٹی سی بات کے لیے، اتنا بھی کیا غصہ۔ دیکھو تو مارے غصے کے کانپ رہے ہو۔

روپا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے سہلاتی ہے۔ مہندر کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔

روپا :ارے ارے رے یہ کیا؟ چھی ---- یہ کیسا بچپنا!!(آنسو پونچھتی ہے) ماتا جی دیکھیں گی تو کیا کہیں گی۔

مہندر :روپا، تم نے ایسا کیا جادو کر دیا ہے مجھ پر؟

مہندر اس کے ہاتھ کو سونگھتے ہوئے اپنی ناک اس کے کاندھے تک لے جاتا ہے۔

روپا :(مسکرا کر) یہ کیا کر رہے ہو؟

مہندر :تمہارے جسم کی مہک مجھے پاگل بنا دے گی روپا۔

روپا :مہک، اور وہ بھی ایک ڈاکٹر کے جسم سے؟

مہندر :(اسے بانہوں سے پکڑ کر) ہاں روپا، ہاں۔ مہک ---- ایک ایسی مہک، جس سے ----

مہندر اسے اپنے قریب لیتا ہے۔ روپا اپنے آپ کو اس سے چھڑانے لگتی ہے۔

روپا :نہیں مہندر پلیز ---- نہیں ---- (الگ ہو کر) مہندر، تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے؟ تمہارے ڈاکٹر ہونے تک یہ سب ----

مہندر :وعدہ لیا ہے تم نے مجھ سے۔

روپا :مہندر، تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میں تم پر ظلم کر رہی ہوں؟ نہیں ویسا نہیں ہے۔ خواہش، جذبات، خواب یہ سب ---- مجھ میں بھی ہیں مگر ---- (آہ بھرتی ہے) چلو ناشتہ کر لو۔

وہ ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھاتی ہے اور چمچ سے کھلانے لگتی ہے۔

عورت : (داخل ہوتے ہوئے) لے یہ گرم گرم دودھ پی لے۔

روپا چمچ مہندر کے ہاتھ میں تھما دیتی ہے۔ عورت دودھ کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر، الماری کی طرف جاتی ہے۔

عورت : بہو، تم رات بھر ڈیوٹی دے کر تھک گئی ہوگی۔ پہلے نہالو۔ دواؤں کی باس آرہی ہے۔ تمہارے جسم سے (روپا مہندر کو دیکھ کر مسکراتی ہے) پھر ناشتہ کر کے آرام کرنا اب گھر دوپہر کو کھانا کھا کر ہی جانا۔

الماری سے تولیہ نکال کر روپا کو دیتی ہے۔

روپا : اچھا ماتا جی، ان کے جانے کے بعد نہالوں گی۔

عورت : تم ذرا جلدی آجایا کرو، ورنہ یہ بہت جلدی پریشان ہو جاتا ہے۔

روپا : (شرماتے ہوئے) میں جلدی ہی آرہی تھی۔ ریلیور بھی وقت پر آیا تھا، مگر اتنے میں پوائزن کے دو کیس آگئے۔

عورت : کس نے زہر کھایا تھا؟

روپا : ماں بیٹی تھیں دونوں۔ ماں نے پہلے بیٹی کو کھلایا بعد میں خود نے کھالیا۔

عورت : بیچاری، نہ جانے کیا دکھ ہوگا انھیں۔۔۔ بمبئی شہر ہے یا دکھوں کا سمندر! عورت اندر جاتی ہے مہندر دودھ کا گلاس خالی کر کے اٹھتا ہے۔

مہندر : اچھا ماں، میں چلتا ہوں۔

عورت : (اندر سے) اچھا بیٹے۔

مہندر : روپا میں۔۔۔

روپا : پانچ بجے واپس آئیں گے۔ مجھے یاد ہے۔ میں تب تک حاضر ہو جاؤں گی۔

وہ مسکراتی ہے۔ مہندر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔

روپا : ایسے ہی دیکھتے ٹھہرو گے، تو پھر بن گئے ڈاکٹر۔ (پیار سے دھکیلتے ہوئے دروازے تک لے جاتی ہے)۔۔۔ لائبریری سے فارنسک میڈیسین کی کتاب لانا مت بھولنا

مہندر :اچھا۔

مہندر جاتا ہے۔روپا اسے جاتے ہوئے دیکھتی ٹھہری ہے۔

عورت :(داخل ہوتے ہوئے)مہندر گیا بہو؟

روپا :جی ہاں۔

عورت :اب تم نہالو، میں تب تک گرم گرم اڈلی اتارتی ہوں۔تمہارے لئے اوران کے لئے۔

روپا :پتا جی نہیں دکھ رہے؟

عورت :وہ ذرا صبح کی سیر کو گئے ہیں۔آتے ہی ہوں گے۔(جانے کو مڑتی ہے)

روپا :ماتا جی!(عورت رکتی ہے)ایک بات پوچھوں؟

عورت :پوچھونا۔

روپا :(کچھ سوچ کر)مہندر کو آپ نے دیکھا؟

عورت :میں تو اسے، جب سے وہ پیدا ہوا ہے، تب سے دیکھ رہی ہوں۔

روپا :میرا مطلب ہے۔۔۔ابھی آپ نے دیکھا؟ جب وہ غصہ میں تھے تو۔۔۔ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

عورت :آدمی غصہ میں ہوگا تو ہاتھ کانپے گا ہی۔اس کے پتا جی بھی ویسا ہی کرتے ہیں۔

روپا :اور وہ۔۔۔ان کی آنکھوں میں آنسو بھی بہت جلدی۔۔۔

عورت :وہ تو، وہ بھولا ہے نا، غصہ کرنے کے بعد اسے افسوس ہوتا ہے تو۔۔۔

روپا :ماتا جی، ایسا ان کو کب سے ہو رہا ہے؟

عورت :یہ لو!! تم نے تو ڈاکٹری شروع کر دی۔ارے پگلی اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ جا نہالے۔ میں اڈلی اتارتی ہوں۔

عورت ناشتہ کی طشتری اور دودھ کا خالی گلاس لے کر اندر جاتی ہے روپا ٹیبل کی دراز کو دیکھتے ہوئے۔آہستہ آہستہ اندر جانے لگتی ہے۔اندھیرا پھیلنے لگتا ہے۔

اندھیرا

مہندر کی آواز:اس دن سے روپا کی آنکھیں میرے ٹیبل کی دراز پر پہرہ دینے لگیں۔گھر میں دوسری

کوئی ایسی محفوظ جگہ نہیں تھی، جہاں میں اپنے اس راز کو چھپا سکتا۔۔۔کچھ دنوں بعد جب میں کالج گیا ہوا تھا تو روپا کو میرے گاڑھے راز کو کھودنے کا موقعہ مل ہی گیا۔

ہلکے سے روشنی بھرنے لگتی ہے۔ روپا کرسی پر بیٹھی پڑھ رہی ہے اتنے میں عورت ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے داخل ہوتی ہے۔

عورت : بہو! تم ذرا بیٹھو۔ میں بازار ہو آتی ہوں۔۔۔وہ درگا پرساد کی لڑکی تارا ہے نا، اس کے دہیز کے لئے کچھ ساڑھیاں لینی ہیں، درگا پرساد کی گھر والی بہت کہہ رہی ہے، تو ذرا اس کے ساتھ آتی ہوں۔

روپا : میں بیٹھی ہوں آپ ہو آیئے۔

عورت : (جاتے ہوئے رک کر) دیکھو، دودھ الماری میں رکھا ہے۔ چائے پینی ہو تو بنالینا۔

روپا : جی۔

عورت : (جاتے ہوئے) دروازہ بند کر لینا بہو!

روپا اٹھ کر دروزہ بند کرنے عورت کے پیچھے جاتی ہے۔ وہ دروازہ بند کر کے لوٹتی ہے، تو اس کی نظریں ٹیبل کی دراز پر جم جاتی ہیں وہ ایک بار دروازے کی جانب دیکھتی ہے پھر تیز قدموں سے بالکنی میں آکر باہر کی طرف جھانکتی ہے پھر تیزی سے ٹیبل کے قریب آکر اپنے پرس سے کچھ چابیاں نکال کر دراز کھولنے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنے ہیئر پن سے کوشش کر کے دیکھتی ہے۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔

آدمی : (سڑک پر سے) ٹوٹی ہوئی چھتریاں ٹھیک کروالو۔ کھوئی ہوئی چابیوں کے تالوں کی چابیاں بنوالو۔

روپا وہ آواز سنتی ہے تو جلدی سے بالکنی کی جانب بڑھتی ہے۔

آدمی : ٹوٹی چھتریاں ٹھیک کروالو۔ تالوں کی چابیاں بنوالو۔

روپا : (بالکنی میں سے) ارے او چابی والے! ذرا اوپر تو آنا۔۔۔اس طرف سے۔۔۔روپا کچھ دیر نیچے دیکھتی ہے پھر پلٹ کر دروازے پر جاتی ہے۔ وہ لوٹتی ہے تو چابیاں بنانے والا اس کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔

روپا : یہ رہی ٹیبل۔اس کی چابی کھوگئی ہے(کلائی کی گھڑی دیکھ کر) ذرا جلدی بنادو بھئی۔

آدمی : ابھی بنائے دیتا ہوں۔

آدمی اپنے چابیوں کے بڑے سے گچھے میں سے ایک چابی نکال کر دراز کی سوراخ میں گھماتا ہے پھر فائل میں سے گھس کر۔کچھ ٹھوک پیٹھ کر چابی بنا کر دیتا ہے۔

روپا : کتنے پیسے؟

آدمی : تین روپے۔

روپا پیسے دیتی ہے۔وہ آدمی پیسے لے کر جاتا ہے۔آدمی کے جاتے ہی روپا دراز کھولتی ہے۔سب سے پہلے اس کے ہاتھ انجکشن کی سرنج لگتی ہے پھر کچھ خالی اور بھرے ہوئے پیتھے ڈین کے ایمبولینس ہاتھ لگتے ہیں۔

روپا : پیتھے ڈین!!!Oh my God(سرنج اٹھا کر دیکھتی ہے) سرنج کتنی گندی ہے!تو کیا ابالے بنا ہی ؟؟؟اب سمجھی ،اس کا ہاتھ کیوں کانپتا ہے۔۔وہ جلدی اپ سیٹ کیوں ہو جاتا ہے۔۔دو پاگلوں کی طرح۔۔Oh, no no no,۔۔

اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے ہیں،اتنے میں سدھیر داخل ہوتا ہے۔

سدھیر : (داخل ہوتے ہوئے) ماتا جی مہندر!۔۔۔

آواز سنتے ہی روپا آنسو پونچھ کر،جلدی سے سب چیزیں دراز میں ڈال کر،دراز کو چابی لگا دیتی ہے۔

سدھیر : آپ؟۔۔۔ماتا جی نہیں ہیں؟

روپا چابی مٹھی میں دبا کر پلٹتی ہے۔وہ سدھیر کو دیکھ کر چونکتی ہے۔

روپا : سدھیر،تم!!

سدھیر : روپا،تم یہاں؟۔۔گھر میں۔۔۔

روپا : کوئی نہیں ہے۔

سدھیر : مگر تم یہاں؟

روپا : (آہ بھر کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں۔۔۔میں اس گھر کی ہونے والی بہو۔۔۔

سدھیر : کیا!!! کیا کہہ رہی ہو روپا؟

روپا : ہاں۔

سدھیر : مگر۔۔۔ مگر یہ سب کب ہوا؟

روپا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تیز نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال لیتی ہے۔

روپا : مگر تم کئی مہینوں سے کہاں غائب رہے؟ کوئی خبر تک نہیں دی۔ کیا کر رہے ہو آج کل؟

سدھیر : میں نے گھاٹ کوپر میں دواخانہ شروع کیا ہے۔

روپا : پریکٹس کر رہے ہو؟ اچھا (اٹھ کر) بیٹھو۔ کب شروع کیا دواخانہ ہمیں اطلاع بھی نہیں! کیسا چلا ہے؟

سدھیر : تمہارے سوالوں کے جواب تو میں دوں گا روپا، مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہاری منگنی مہندر سے کب ہوئی۔

روپا : یہ تم پوچھ رہے ہو سدھیر۔

سدھیر : کیوں؟ میں نہیں پوچھ سکتا۔

روپا : قتل کر کے مسیحائی جتانا چاہتے ہو؟

سدھیر : میں سمجھا نہیں۔

روپا : نہیں سمجھے! تو اس بھرم کو بھرم ہی رہنے دو سدھیر (پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ) اب اپنی کہو، تم M.S. کرنا چاہتے تھے نا؟ کیوں نہیں کیا؟

سدھیر : میں نے M.S. کیوں نہیں کیا، پراکٹس کیوں اور کب شروع کی۔ میں اتنے روز کیا کرتا رہا، یہ سب اتنا اہم نہیں ہے۔ روپا جتنا اہم میرے لئے یہ جاننا ہے کہ تم مجھ سے ایسا سلوک کیوں کر رہی ہو؟ میرے آتے ہی تم چوری کرتے پکڑی گئی ہو ویسے ڈر کیوں گئیں؟

روپا : اگر میں یہ کہوں کہ میں اس گھر میں چوری کر رہی تھی تو؟

سدھیر : میں یقین نہیں کرونگا۔

روپا : (مٹھی کھول کر دکھاتے ہوئے) تو یہ دیکھو۔ یہ رہی چابی اس ڈرائر کی اب تم یہ جاننا چاہو گے کہ مجھے اس ڈرائر سے کیا ملا؟ (دراز کھول کر سرنج اور ایمپلول نکا کر دکھاتے ہوئے) یہ ملا ہے۔ یہ سب۔ اب یہ بھی جان لو، یہ سب پراپرٹی میرے منگیتر کی ہے۔ میرے ہونے والے شوہر کی ہے اور یہ سب تمہاری مسیحائی کا دیا ہوا تحفہ ہے سدھیر

سدھیر : میری مسیحائی!

روپا : ہاں، تمہاری مسیحائی کا تحفہ۔ تم ہی نے تو ماں سے کہا تھا کہ مہندر بہت اچھا لڑکا ہے اسکولر ہے۔ گولڈ میڈلسٹ ہے۔ جب سے میری تقدیر اس سے جڑی ہے، تب سے میں ان میڈلوں کو ڈھونڈ رہی تھی، تب کہیں جا کر وہ آج میرے ہاتھ لگے اور میں پکڑی گئی۔ وہ بھی تمہارے ہاتھوں۔

سدھیر : میں نے کہا تھا یہ سب تمہاری ماں سے؟

روپا : کیوں، بھول گئے؟ پالکھر جانے کی اگلی شام تم گھر آئے تھے۔ میں گھر پر نہیں تھی۔ ماں نے تم سے پوچھا تھا اور تم نے مہندر کے نام پر تعریف کے پل باندھ دئے تھے اور پھر خود غائب ہوئے تو آج صورت دیکھنے کو ملی ہے۔

سدھیر : اس میں ضرور کچھ گڑ بڑ ہوئی ہے روپا!

روپا : گڑ بڑ کچھ بھی نہیں ہوئی۔ تم نے اپنے دوست کی زندگی کو پار اتارنے کے لیے میری زندگی سے پتوار کا کام لینے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔ سدھیر، میرا کوئی بھائی نہیں، میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا بڑا بھائی مانا۔ جب ماں نے مجھ سے کہا کہ سدھیر اس لڑکے کو جانتا ہے، اسے وہ لڑکا پسند ہے۔ تو یقین مانو سدھیر، میں نے مہندر کے لئے دریافت کرنا تو دور رہا اسے دیکھنا تک تو ضروری نہیں سمجھا۔

سدھیر : نہیں روپا، تمہاری قسم میں نے ایسے لفظوں کا استعمال نہیں کیا تھا تمہاری ماں کے سامنے۔ انھوں نے مجھ سے اتنا ہی پوچھا تھا کہ میں مہندر کو جانتا ہوں؟ میں نے کہا کہ اس نے گولڈ میڈل لیا ہے اور پھر میں نے ان سے جاننا چاہا کہ وہ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں۔ تو انھوں نے کہا یوں ہی خاص کچھ نہیں ہے۔ وہ اگر مجھ سے اپنے ارادے

کہہ دیتیں تو میں انھیں نہ سہی مگر تمہیں آگاہ کیے بنا ہرگز پا لکھر نہ جاتا۔

خاموشی

سدھیر پریشان حال سوچتے ہوئے کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگتا ہے۔

سدھیر :(رک کر) روپا۔

روپا :ہوں؟

سدھیر :کیا سوچ رہی ہو؟

روپا :اب سوچنے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟

سدھیر :میں۔۔۔۔میں سمجھانے کی کوشش کروں گا اسے۔تم پریشان مت ہو۔

روپا :تم اس کے دوست ہو، اس سے پہلے بھی کبھی تم نے کوشش کی ہی ہوگی اسے سمجھانے کی۔

سدھیر :ہاں، کی تھی کوشش بہت سمجھایا تھا۔

روپا :تب کچھ نہ ہوا تو اب کیا ہوگا۔

سدھیر :مایوسی کا دامن مت پکڑو روپا۔

روپا :پہلے نوالے میں ہی کنکر آیا ہے سدھیر، اب کس امید پر ہاتھ بڑھاؤں؟

عورت :(داخل ہوتے ہوئے) بہو، بہو۔ایسے دروازہ کھلا رکھ کر مت بیٹھا کرو، یہ بمبئی ہے، کوئی گھس آئے گا تو۔۔۔(سدھیر کو دیکھ کر) کون؟

سدھیر :(پلٹ کر) میں سدھیر، نمستے ماتا جی۔

عورت :ارے سدھیر، تم کب آئے بیٹے؟ اتنے دن کہاں چلے گئے تھے؟ دیکھو، یہ مہندر کی بہو ہے بہو یہ سدھیر ہے، مہندر کا خاص دوست۔

روپا سدھیر کو نمستے کرتی ہے۔

سدھیر :میں روپا کو جانتا ہوں ماتا جی

عورت :تو پھر بہو تم اسے نمستے کیوں کر رہی ہو؟

روپا :(سدھیر کی جانب دیکھ کر) یہ مہندر کے خاص دوست ہیں۔یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا۔

(سدھیر نظریں جھکا لیتا ہے)۔۔۔مگر آپ بازار نہیں گئیں؟

عورت : کیا جاتی بہو، درگا پرساد کی بیوی کے سر میں درد تھا۔ سوچنے لگی کل چلیں گے وہ تو بتیا نے بیٹھنے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا نہیں، میں اب بیٹھوں گی تو نہیں، بہو گھر میں اکیلی ہے۔ سدھیر تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو نا۔ کہاں ہو تم آجکل؟ اس طرف آنا ہی چھوڑ دیا ہے کیا؟

روپا :انھوں نے دواخانہ کھولا ہے۔

عورت : سچ کہاں کھولا ہے؟ ہمیں بتایا تک نہیں۔

سدھیر :ویسا تو نہیں ماتا جی، کچھ اسی جلدی میں سب ہو گیا کہ میں کسی کو بھی خبر نہ کر سکا۔

عورت :مگر کھولا کہاں ہے؟ کیسا چلا ہے؟

سدھیر : گھاٹ کوپر میں۔ اچھا چلا ہے۔

عورت : اچھا چلا ہے نا، تو بس۔ اب ہمارا مہندر بھی ڈاکٹر بن جائے تو اس کا دواخانہ کھلوا دینگے۔

سدھیر اور روپا ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں۔ روپا مایوسی کے ساتھ دھیرے دھیرے پلٹتی ہے۔

عورت : بہو تم نے چائے بنا کر پی لی؟

روپا :نہیں ماتا جی۔

عورت :تو پھر چائے بناؤ نا، سدھیر بھی پئے گا۔

سدھیر :نہیں، اب اس وقت چائے تو نہیں پیوں گا۔ پھر کبھی (کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے) دواخانہ جانے کا وقت ہو رہا ہے۔

عورت : ارے کتنے دنوں بعد آیا ہے! چلے جانا، اتنی بھی کیا جلدی ہے، مہندر کے آنے کا بھی وقت ہو گیا ہے۔

سدھیر :شروع شروع کا معاملہ ہے، وقت پر نہیں تو مریض کیا سوچیں گے (جیب سے وزٹنگ کارڈ نکال کر) یہ میرا پتہ ہے۔ مہندر آئے تو اسے دیدینا اس میں فون نمبر بھی ہے۔

ویسے فون میرے پاس تو نہیں ہے، بغل کی دوکان میں ہے، کہنے سے بلا دیتا ہے (ایک کارڈ روپا کو بھی دیتا ہے) میں چلتا ہوں ماتا جی۔

عورت : کچھ دیر بیٹھیے تو۔۔۔

سدھیر : پھر آؤں گا، ناتب۔(روپا سے) میں چلتا ہوں۔

سدھیر جاتا ہے

عورت : بڑا اچھا لڑکا ہے۔ مہندر کی اس سے خوب پٹتی ہے۔ (اندر جاتے ہوئے) بہو میں کپڑے بدل لوں، تم ذرا دروازہ بند کر کے چائے بنادو۔ عورت اندر کی طرف مڑتی ہے روپا دروازہ بند کرنے جاتی ہے۔ وہ لوٹ کر اداس قدموں سے ٹیبل کے قریب آتی ہے۔ ایک نظر رسوئی گھر کی جانب دیکھ کر ٹیبل کی دراز کھولتی ہے۔ دراز سے ایک ایمپیول نکال کر اسے دیکھنے ٹھہرتی ہے۔ کچھ ایک پل کے بعد وہ دراز کی چیزیں سمیٹ کر اپنے پرس میں ڈالتی ہے، اتنے میں دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے۔

عورت : (اندر سے) بہو، دیکھنا تو کون ہے؟

روپا دروازہ کھولنے جاتی ہے۔

مہندر : (داخل ہوتے ہوئے) ممی نہیں ہیں؟

روپا : اندر ہیں؟

مہندر : تم کب آئیں

روپا : کچھ دیر پہلے۔

مہندر آ کر ٹیبل پر اپنی کاپیاں رکھتا ہے۔ پھر روپا کا پرس اٹھا کر کاپیوں پر رکھ دیتا ہے۔

مہندر : (بیٹھتے ہوئے) آج بہت گرمی ہے۔۔۔ موڈ خراب کر دیتی ہے یہ گرمی اس کی نظر پرس پر پڑتی ہے، وہ پرس اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے۔ روپا چونکتی ہے۔

مہندر : اچھی ہے۔۔۔ کہاں سے لی۔

روپا جواب نہیں دیتی اتنے میں ہوائی جہاز گذرنے کی آواز آتی ہے۔ جسے سن کر مہندر پرس کو ساتھ لیے گیلری میں جاتا ہے۔ پرس مہندر کے ہاتھ میں دیکھ کر روپا پریشان

ہوتی ہے۔

مہندر : (لوٹتے ہوئے) تم کبھی ہوائی جہاز میں بیٹھی ہو؟ (روپا سر ہلا کر نہ کہتی ہے) میں بھی نہیں بیٹھا۔ سچ پوچھو نا بیٹھنے سے بھی۔One should fly it۔۔۔پائیلٹ کی وہ سیٹ، سر پر ہیڈ فون، ہاتھوں میں اسٹیرنگ راستے کے نام کھلا آسمان۔ بس، اڑتے رہو، پرندے کی طرح۔۔۔سالا۔۔وہ روپا کی جانب دیکھتا ہے۔روپا کو خاموش دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگتے ہیں۔

مہندر : (اونچے لہجے میں) تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟

روپا : کیا بولوں؟

مہندر : میں تب کیا دیواروں سے باتیں کر رہا ہوں؟ پاگل سمجھا ہے مجھے؟۔۔۔دوائیوں اور مریضوں کو چھوڑ کر بھی تو اور سبجکٹ ہیں، جس پر باتیں کی جا سکتی ہیں۔۔۔سنتی ہو؟ میں تم سے کہہ رہا ہوں (روپا خموش رہتی ہے) ۔۔۔عجیب موڈ ہے سالا تمہارا بھی ۔۔۔باتیں کرنے بیٹھو گی تو ڈھیر ساری کرو گی، ورنہ ہونٹوں کو سی کر بت بنی بیٹھی رہو گی۔ مسکرانے پر آؤ گی تو مسکراہٹوں کا خزانہ لٹا دو گی، اور جب ہم کہیں گے مسکرانے کو تو۔ سالی کیا مجال ہے جو اک دانت بھی دکھ جائے۔۔۔اونہہ۔ مانگنے سے تو بھیک کی قیمت بھی بڑھا دیتے ہیں لوگ۔۔۔اب کچھ بکو بھی۔۔۔مہندر کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔روپا ان کانپتی انگلیوں کو دیکھتی ہے۔

مہندر : (ہاتھ چھپا کر) کیا دیکھ رہی ہو؟

روپا : کچھ نہیں۔تم آرام کرو میں چائے بناتی ہوں۔

مہندر : نہیں پینی ہے چائے مجھے۔

روپا : ماتا جی کو پینی ہے (روپا اندر چلی جاتی ہے)

مہندر : (بڑبڑاتے ہوئے) سالی کو بہت مستی آئی ہے۔ (غصہ سے ٹیبل پر مٹھی مارتا ہے) ۔۔۔کوئی نہیں سمجھتا مجھے۔۔۔کبھی کوئی نہیں سمجھا، آرزوؤں کے یہ خالی خانے کیوں چیخ رہے ہیں کوئی سمجھنے کو تیار نہیں۔ سب کو اپنی اپنی۔۔۔غصہ سے آہ ہا (پھر ایک بار زور

سے ٹیبل پر ہاتھ مارتا ہے۔)

اس کا دایاں ہاتھ کانپنے لگتا ہے۔ وہ جیب سے چابی نکال کر دراز کھولتا ہے۔ دراز کو خالی دیکھ کر وہ بوکھلا جاتا ہے دراز میں ہاتھ سب طرف گھماتا ہے۔

مہندر :(زور سے) ممی، ممی

عورت :(داخل ہوتے ہوئے) کیوں چلا رہا ہے؟

مہندر :میرا خانہ کس نے کھولا تھا؟

عورت :!!وہ بھلا کون کھولے گا؟ چابی تم اپنے پاس رکھتے ہو۔

مہندر :میں پوچھتا ہوں میرا خانہ کیوں کھولا تھا؟

عورت :میں نے نہیں کھولا، کیوں کیا ہوا؟

مہندر :روپا۔۔۔۔روپا۔

روپا داخل ہوتی ہے۔

مہندر :تم نے یہ خانہ کھولا تھا؟ (روپا جواب نہیں دیتی) میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم نے یہ خانہ کھولا تھا؟

روپا :ہاں۔

مہندر :حرامزادی، کیوں کھولا؟ کہاں ہیں میری وہ چیزیں؟

عورت :(غصہ سے) مہندر!

مہندر :کہاں ہیں وہ چیزیں؟۔۔۔میری چیزیں مجھے واپس کر دو روپا، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

عورت :شرم نہیں آتی تجھے، بہو سے ایسی باتیں کرتے ہوئے؟

مہندر :بہو! یہ تیری بہو نہیں ہے۔ چور ہے، چور سالی اس نے میری سانسوں کو چرایا ہے (آگے بڑھتا ہے)

عورت :(بیچ میں آکر) تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟

مہندر :نہیں ہوا تو یہ کر دے گی۔ (ماں کو ایک طرف ڈھکیل کر) کہاں ہیں میری چیزیں؟

عورت :مہندر، مہندر۔۔۔۔

وہ پھر عورت کو دھکیل دیتا ہے، عورت گر پڑتی ہے،

مہندر : you know ,i can then kill someone for this

عورت تیزی سے اٹھ کر پھر اسے روکتی ہے۔

مہندر :تم بیچ میں مت آؤ ممی ۔اس حرامزادی کی موت آئی ہے میرے ہاتھوں ۔میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

عورت روتے ہوئے اس سے لپٹ جاتی ہے۔

عورت :نہیں نہیں مہندر۔۔۔۔۔بہو! کیا لیا ہے اس کا؟ دیدے، دیدے اسے ۔مہندر اپنے آپ کو جبراً عورت سے الگ کر کے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ روپا کی گردن کی طرف بڑھاتا ہے۔روپا اس کا ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔

روپا :خبردار، جو مجھے ہاتھ لگایا۔میں تمہاری منگیتر ہوں، بیوی نہیں۔

مہندر :تو میری کچھ بھی نہیں۔میری چیزیں دیدے۔

عورت :(دونوں کے بیچ آ کر) بہو دیدے، دیدے اس کی چیزیں۔

مہندر :مت کہو بہو اسے یہ میری دشمن ہے۔

عورت :میں پرائی لڑکی پر ہاتھ اٹھانے نہیں دوں گی تجھے، تجھے گلا گھونٹنا ہی ہے تو میرا گھونٹ دے۔(پلٹ کر) بہو ضد مت کر، دیدے اس کی چیزیں!

روپا :ٹھیک ہے ماتا جی، آپ کہتی ہیں تو دیدیتی ہوں۔مگر آپ نہیں جانتیں۔۔

مہندر :بھاشن مت دے جلدی لا۔

عورت :دیدے بہو۔

روپا وہ رکھی میری پرس میں۔

مہندر لپک کر پرس کھولتا ہے۔سرنج اور ایمپیول نکالتا ہے۔عورت یہ سب دیکھتی ہے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا مہندر جھٹ سے ایمپیول پھوڑ کر سرنج بھرتا ہے اور اپنی ران پر ٹیکا لگاتا ہے اس سے تسکین نہیں ہوتی اس لئے دوسری ران پر ایک اور ٹیکا لگاتا ہے اس سے تسکین نہیں ہوتی اس لئے دوسری ران پر ایک اور ٹیکا لگاتا ہے۔عورت حیران ہے

۔روپا یہ سب خاموش سے دیکھتی ہے۔رفتہ رفتہ روشنی۔

(عزم کے ساتھ) ماتا جی ، میں آج سے اس گھڑی سے آپ کے بیٹے سے سارے رشتے توڑ کر اس سے تعلقات ترک کر رہی ہوں۔

بہو!!!

روپا جاتی ہے

مہندر :ارے جا جا۔تو چلی گئی تو میں کیا عمر بھر رنڈوا رہ جاؤں گا؟

عورت :(دروازہ کی طرف بڑھ کر) بہو، بہو سن تو میری بات سن ۔۔۔۔

(غصہ سے پلٹ کر) نالائق ،تو نے آج خاندان کا نام ڈبو دیا ہے۔تیرے پتا جی نے کتنے پاپڑ بیلے تھے اس رشتہ کے لئے انہیں معلوم ہوگا تو۔۔۔۔۔

مہندر :(بینچ پر بیٹھتے ہوئے) معلوم ہوگا تو کیا کرلیں گے میرا؟ جان سے مار ڈالیں گے یہی نا؟ تو اب تک کونسا سکھ دیا ہے؟۔۔۔۔۔۔اور تم کیا سمجھتی ہو اس روپا کی بچی کو میں ایسے ہی چھوڑوں گا ؟ ارے ، بھرے چوراہے پر خون کردوں گا ۔سالی کا بڑی ایکٹر دکھا کر گئی ہے نا ٹھیک ہے وہ بھی کیا یاد کرے گی۔۔۔۔میں نہیں چھوڑوں گا اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔۔۔۔

عورت روتے ہوئے کھڑی ہے۔مہندر بڑبڑا رہا ہے ہلکے ہلکے کراہوں اور چیخوں سے بھرپور موسیقی ابھرتی ہے اور اس کے ساتھ رفتہ رفتہ روشنی کم ہونے لگتی ہے۔مہندر بینچ پر لیٹتا ہے۔

اندھیرا

کچھ پل بعد روشنی بڑھنے کے ساتھ ساتھ موسیقی کم ہوتے ہوئے خاموش ہو جاتی ہے مہندر کٹہرے میں کھڑا ہے۔وہ بہت ہی جذباتی اور تھکا ہوا نظر آتا ہے۔

مہندر :مسٹر جج اس طرح میرے والد نے محبت کی آڑ میں ذبح کیا۔میرے جسم سے بوند بوند خون ٹپکنے لگا۔یہ بوندیں تاج محل کے گنبد سے ممتاز کے مزار پر گرنے والی شبنمی بوندوں جیسی سرد نہیں تھیں ۔ یہ بوندیں بھگوان شنکر کے مندر میں کلس سے ٹپکنے والے

پانی کی بوندوں جیسی بے رنگ نہیں تھیں یہ بوندیں گرم تھیں گرم تھیں سورج کے باوجود جیسی ان بوندوں کا رنگ سرخ تھا آگ سے اٹھنے والے شعلوں کی لپلپاتی زبان کی نوک جیسا یہ جہاں بھی ٹپکیں .زمین جل گئی ۔ یہ جہان جہاں بھی اچھلیں وہ چیز سرخ ہوگئی میرے دوست ڈاکٹر سدھیر نے کئی بار میری عادتوں کا علاج کرنا چاہا ۔کبھی نصیحت بھری باتوں سے تو کبھی دواؤں سے مگر اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ جسم کی بیماریوں کا علاج کرسکتا ہے ۔مگر ذہن اور دل کے ان خانوں کا علاج نہیں کرسکتا جہاں خواہشیں اور خواب جنم لیتے ہیں (مہندر تھکان محسوس کرتا ہے ۔ کچھ دیر سانس لے کر) مسٹر جج اس طرح بوند بوند مرنے کے دوران جب میں تڑپ رہا تھا یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں اس وقت میری پھڑ پھڑاہٹ کی زد میں آ کر روپا کی موت ہوئی ہے اس لئے میں اپنے آپ کو اس کی موت کا ذمہ دار نہیں سمجھتا۔۔۔۔۔بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔

آواز :مہندر ،ہم نے تمہارا بیان سنا (اندھیرا ہونے لگتا ہے) ہم یہ مانتے ہیں کہ تمہارے والدین نے تمہارے سوچنے اور کچھ کرنے کی خواہش کی حق تلفی کی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے مگر انہوں نے قانون کو کہیں بھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔

اندھیرا

آواز جب کہ تم نے سرعام چوراہے پر حملہ کر کے مس روپا کا خون کیا ہے اور ایسا کر کے تم نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیکر اس کے جینے کے حقوق کو چھینا ہے۔۔۔

روشنی پھیلنے لگتی ہے مہندر بیچ پر گہری نیند میں سویا ہوا ہے سدھیر عورت کو ڈھارس بندھا رہا ہے ۔ جو سسک رہی ہے جگناتھ کمرے میں پریشان حال چکر کاٹ رہا ہے ۔مہندر کے جسم میں حرکت ہونے لگتی ہے جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

آواز :۔۔۔۔لہذا تمہارے بیان اور قانون کی باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم تمہاری اس جذباتی کیفیت کے عوض تمہیں سزائے موت سناتے ہیں۔

مہندر :(چیخ کر اٹھتے ہوئے) نہیں ۔ میں نے اس کا خون نہیں کیا سب گھبرا جاتے ہیں

عورت جلدی سے مہندر کے قریب جا کر اس کے سر اور سینہ پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔

عورت : کیا ہوا؟ کیا ہوا مہندر؟ مہندر۔۔۔۔

سدھیر : آپ پریشان مت ہوئیں ماتا جی اسے کچھ نہیں ہوا (مہندر سے) مہندر ا۔۔۔۔

مہندر چاروں طرف دیکھتا ہے جیسے وہ اجنبی جگہ پر آ گیا ہو۔ پھر وہ باری باری تینوں کو دیکھتا ہے جیسے وہ اجنبی ہوں۔ پھر یک بیک جیسے ہوائی جہاز اڑ رہا ہو ویسے بازو پھیلا کر زوئیں ئیں ئیں کرتے ہوئے کمرے میں چکر کاٹتا ہے۔

عورت : اسے کیا ہو گیا ہے سدھیر؟

سدھیر : آپ گھبرائیے نہیں۔ انکل۔۔۔۔

جگناتھ : کیا ہے؟

سدھیر : انکل یہ۔۔۔ (عورت کو دیکھتا ہے)

سدھیر : اس نے شاید اور کوئی ڈراونا خواب دیکھا ہے۔۔۔۔۔ آپ ایسا کیجئے ایک گلاس پانی لے آئیے۔

(عورت جلدی سے اندر چلی جاتی ہے)

جگناتھ کیا ہوا!!!

سدھیر ہاں۔ شاید پیتھی ڈین کا ہیوی ڈوز وہ برداشت نہیں کر سکا

مہندر ا ''زوئیں کہتا ہوا میں بازو پھیلائے کمرے میں چکر کاٹ رہا ہے عورت پانی کا گلاس لے کر داخل ہوتی ہے۔ آسمان سے ہوائی جہاز گذرنے کی آواز سنائی دیتی ہے رفتہ رفتہ روشنی کم ہونے لگتی ہے

اندھیرا

پردہ گرتا ہے

رین بسیرا

• ظہیر انور

کردار

بیساکھی والا آدمی

آواز

چند بے نام کردار

جبار اور عورت

وسط اسٹیج پر ایک مختصر سی چوکی ہے، روشنی چوکی پر پڑتی ہے، ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہے، دائرہ نما شکل میں روشنی سرکتی ہوئی بیساکھی پر پڑتی ہے، نیم اندھیرے میں دور سے گھڑی کی آواز تیز ہوتی ہے۔ پس منظر سے آہستہ آہستہ رونے کی آواز آتی ہے۔ گہری خاموشی کے درمیان بیساکھی والا آدمی اب دھیرے دھیرے اٹھتا ہے۔ داہنی اور بائیں طرف سے فٹ لائٹ کی روشنی بیساکھی والے آدمی کے پاؤں پر پڑتی ہے۔ اس کا چہرہ اب بھی نیم اندھیرے نیم اجالے میں اداس تصویر پیش کر رہا ہے۔ بیساکھی اٹھا کر ایک ہاتھ کو سہارا دے کر وہ چلتا ہے دائیں سے بائیں ....اور بائیں سے دائیں........صرف بیساکھی کی آواز........کھٹ کھٹ.......کھٹ کھٹ، اب روشنی آدمی پر اس طرح پڑتی ہے کہ بیساکھی اور آدمی کا سایہ پیچھے دیوار یا پردے پر پڑتا ہے۔ ہلکی روشنی پھر چہرے پر، آدمی چلتے چلتے رکتا ہے،.....................خاموشی............چہرے پر روشنی..........ہلکی موسیقی..................

بیساکھی والا آدمی: ہر روز، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں.........دیوار سے دھوپ اتری نہیں کہ رات کا آخری پہر بھی چل چل کر آپہنچا..........کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی۔ بس دور سے آتی ہوئی جھینگر کی آواز..........کوئی چیز سنساتی ہوئی (رک رک کر) ہر پل دور تک خاموشی، صبح جب نرم روشنی پھیلتی ہے........تب بھی.......کھڑکی پر ایک طرح کی اداسی ....پل پل ٹپکتی ہوئی.....میرے ہونٹوں پر بے صدا سی ایک ہی آواز، بغیر کسی شور کے، اپنے اندر پھیلتی ہوئی

.......(ایک دوقدم آگے بڑھ کر) جبار........جبار ....(چلتا ہے، بیساکھی کی آواز.........
اداس موسیقی)

بیساکھی والا آدمی: جبار، میرے بیٹے.......جبار........کہاں نکل لیا رے۔

(چلتے ہوئے ......مختصر سی چوکی پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ روشنی اور بھی کم ہو جاتی ہے ۔بیساکھی کوقریب ہی رکھ دیتا ہے۔ بیساکھی ٹھیس لگ کر گر جاتی ہے)

اوہ.........ہر بار.........(اٹھاتا ہے) ہر چیز ساتھ چھوڑ دیتی ہے...........

اف (اٹھتا ہے، سانس درست کرتا ہے) ارے میرا بچہ..........(آسمانوں کو تکتا ہے)

آواز (پس منظر سے): ان خلاؤں میں کیا ڈھونڈ تے رہتے ہو، اور کیوں بار بار خاموش ہو جاتے ہو، یہ دنیا، یہ نظارے، یہ خواب، یہ حقیقت، یہ شام وسحر، یہ دن رات کا چکر، بس تھوڑے سے وقفے کے لئے...........بس ایک قطرہ کے گرنے تک، آسمان سے زمین تک، قطرہ کبھی دریا بن جائے اور کبھی........بے نشان، پوری زندگی تو اس پھیلے ہوئے مہمان خانے میں گھری ہے.......بکھراؤ میں صدمے میں..........نہ کچھ تیرا، نہ میرا، بس رین بسیرا، ٹرین کی طرح ہر اسٹیشن پر مسافر اترتے ہیں، یہ چمن آرائی تو بس نظر کا دھوکہ ہے۔ گزرتے مٹتے لمحوں کا پرانا کھیل، (روشنی بیساکھی والے آدمی پر مزید مرکوز ہوتی ہوئی) کچھ دیر ہنستا، کچھ دیر روتا، پھر بس چپ چاپ، زخموں سے چور گزر جانا، ایک ایسی گھڑی کا آنا کہ بس ....بس فنا ہو جانا.......تم ایک بے بس، بے رس، بے خبر، بے صبر ایک معمہ..........روح میں بجھتا ہوا ایک شعلہ........بس، بے بس بے خبر، دنیا میں آنے پر قدرت اور نہ جانے پر، جو ہو سکا، کیا، جو نہ ہو سکا اس کا غم کیا، جو سمیٹ سکے وہ تمہارا، جو چھوٹا..........سو چھوٹا.......سو چھوٹ گیا.........وقت کے سامنے کوئی کچھ بھی ہو، سب لاچار، بے سہارا، تم کیا اور ہم کیا........اس لئے یہ بے لذت خاموشی کیوں؟ یہ گھبرائی گھبرائی سی بے بسی؟ سناٹے کو چیخ میں بدلو، کچھ تو بولو، صبر.........صرف صبر کہ چارہ بھی تو نہیں.......خاموشی توڑو، کچھ تو بولو، جی کو بہلاؤ، اکیلے نہیں ہو تم بھائی، سنو، جمشید بھی تو ہے، زندگی سے اس کی لازوال محبت کو دیکھو ،جسم میں سرسراتے زہر سے تن تنہا لڑتا ہوا، نہ جام نہ پیالہ، نہ ''شب ماہ'' رواں مشین، ہر دم جواں، غیروں کے لئے، اپنے اور اپنوں کے لئے ہونٹوں پر ہنسی چپکاتا ہوا......تڑپاتا پل پل، ترساتا

خون کو پانی کرتا........وقت بے وقت سارے بدن کو جلاتا...........نہیں حوصلے کی داد دیئے بغیر چارہ نہیں......عمر کی شام آ رہی ہے، بے آواز اور وہ بھی بھرے پورے دن میں........چاروں طرف سے آنگن میں اترتی ہوئی اماوس کی رات.....صرف خاموشی، رات، خاموشی چیختی ہوئی خاموشی...........(دھیرے سے) موت کی خاموشی........(سرگوشی کے لہجے میں) فنا کی مہکتی خوشبو............ڈوب رہا ہے دل، ڈوب رہی ہے نظر، ڈوب رہے ہیں کئی نگر، اس کی آنکھوں میں اندر ہی اندر..........ہاں ڈوب رہا ہے اس کا دل، الٹی گنتی شروع، رنگ ماسٹر کی آواز (تیز آواز میں) دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین،.......دو.....کسی بھی لمحہ، بس آخری لمحہ، بس فنا، بس ایک پھیلا ہوا، نا........

(چند کردار بے نام سرتاپا کپڑوں میں ڈھکے، چہرے بھی جو صاف نہیں ہیں، اسٹیج پر ہلکی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ پراسرار کیفیت سے مملو، اسٹیج پر بے ترتیب انداز میں آگے بڑھتے ہیں۔دبے پاؤں، نیم اندھیرے میں بیساکھی والے آدمی کی طرف بڑھتے ہیں۔اس کے گرد گھومتے ہیں، پہلے خاموش، پھر اداس Humming کے ساتھ بیساکھی والا آدمی ایک طرح کی، بے کیفی، کرب اور ایک حد تک لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے روشنی چہرے پر آتی ہے، دھیرے دھیرے کرداروں کے ذریعہ آہ بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔یہ سارے کردار اس کے پاؤں کے قریب بیٹھ جاتے ہیں، گہری سسکیوں کی آواز......اور پھر نہایت سحر کارانہ لہجے میں)

یکے بعد دیگرے: رین بسیرا ہے، وہی صدیوں پرانا کھیل، ہر کھلاڑی اپنی چال چلتا ہے، اور پھر بازی ہار جاتا ہے، کوئی بے خبر نہیں، پھر بھی سب جیسے انجان.....آ رہے ہیں لوگ، بس رہی بستیاں، جا رہے ہیں لوگ، اجڑ رہی ہے بستیاں، جو گیا، بس وہی گیا۔جس کا گیا بس اسی کا گیا، ہزاروں سال، ہزاروں ہزار سال، ''مزاج بدلا نہ زندگی'' گہری نیند —— گہری خاموشی —— گہرے پاتال میں اترتی ہوئی —— جانے کب سویرا ہوگا —— جانے ....کب...........سویرا...........ہوگا۔

بیساکھی والا آدمی: جبار.....میرا بچہ.......جبار رے......جب........بار........

(اب روشنی صرف بیساکھی پر پڑتی ہے۔پس منظر سے جبار کی آواز سنائی دیتی ہے

۔اس کردار کو سر سے پاؤں تک سفید لباس میں نیم روشنی میں دکھایا جا سکتا ہے۔صرف اس کی آنکھیں نظر آتی ہیں)

جبار: معاف کرنا بابا، تمہاری بیساکھی نہ بن سکا، تمہارے کام ہی نہ آ سکا۔سوچا تھا کہ تمہاری آنکھوں میں ستارے سجاؤں گا تمہاری پھیکی بے رس زندگی میں امید کی کرنین پھیلاؤں گا۔دنیا کی ہر خوشی تمہارے لئے .... ہر صبح ، نرم روشنی اور ہواؤں کے خوبصورت جھونکے کیساتھ سبز موسموں کی سیر کراؤں گا۔تم تھکو گے تو میرا دل ڈوبے گا۔تم ترسو گے تو میری روح زخمی ہوگی، تمہاری آنکھوں میں آنسو ہوں گے تو میرے جیون پتھ پر اندھیرا ہوگا۔تم اندھیرے میں بھٹکو گے تو مشعل میرے ہاتھوں............ نہیں کچھ بھی نہ ہو سکا....... تمہاری کشتی منجدھار میں رہ گئی بابا۔صرف تشنگی ،صرف مایوسی ،صرف بے بسی ،صرف لاحاصلی..... آخر کیوں........ آخر کیوں بابا، کہاں کمی ہوئی، عبادت ، ریاضت ،محنت ،محبت...... کیوں آخر میں آسمانوں سے جنگ نہ کر سکا۔

(روشنی اب بھی بیساکھی پر)

بیساکھی والا آدمی: جبار...... جبار....... جبارر ے......... جب........... بار.........

جبار: کتنے دن جیا میں ، بولو، کتنی بہاریں دیکھیں میں نے ، ہمیشہ بے رنگ خستہ پتے کی طرح.......... آخر کیوں؟ کیوں میرے ساتھ ہی.......... کیا کیا تھا میں نے ، میرے سپنے، میرے جذبے، میرے دوست، میرے سہارے.......... میرے ساتھ ہی ایسا کیوں...... (خاموشی)

بیساکھی والا آدمی: نہیں.......... (روتا ہے) نہیں، یقین نہیں ہوتا ہے۔

جبار: ماں کی نرم چھاؤں میں کتنے دن رہا، اسی خوشی کے بجائے عمر بھر کا دکھ میری آواز ، مُردوں کی دنیا سے آتی ہوئی، سن رہے ہونا بابا..... تو پھر سنو، وہ درد، وہ جلن، جس نے مجھ کو تم سے چھین لیا، اس درد اور چبھن کی کوئی سیما نہیں ۔کٹتا تھا ایک ایک انگ ، چھری چلتی رگوں میں ،خون پانی ہوا، کاش ایک ہی جھٹکے سے ٹوٹ گیا ہوتا......... کتنے دن رہا بابا......

بیساکھی والا آدمی: ۲۴ سال ،صرف ۲۴ سال ،کل کی بات ہے ، وہ ابھی یہاں تھا، میرے پاس (دقت انگیز وائلن موسیقی ،سایہ نما کرداروں کی سسکیاں)

جبار: بابا وہ جو دنیا چلاتا ہے ہمارا پالن ہار، میں اس کا بھگت ،بس ایک کٹھ پتلی ، جب چاہا،

کھینچ لیں ، اس کی مرضی کا ایک معمولی کھیل ، جب چاہا کھیل سمیٹ ، نام عمر ، نام بیماری ، نام مصلحت ، کیا دیا ہے اس نے ، بلایا ہے اپنے پاس ، اکثر بے وقوف ، کبھی وقت پر ، ابھی تو صبح کی ہلکی روشنی اور ہوا میں پتوں کو بھی سرشار نہیں دیکھا اور........(تاسف کرتا ہے)(گمبھیر آواز میں) پچھلے پندرہ برسوں سے دل کے طاق پر اسی کا دیا جلتا رہا ، عبادت ، انکساری ، بھگتی ، سر جھکانا ، ہمیشہ سر جھکا ہی رہنا ، ڈرنا ، ڈر کر قدم بڑھانا ، یہی سوچ کر ، ہر چیز پر اس کی قدرت ہے ـــــ پھر بھی مہلت نہیں ، کس سے پوچھوں میں ، کیا پوچھوں میں ، بتاؤں کون میں ، کیوں تھا میں ، اتنی جلدی ، اف اس قدر تیز ، شام وسحر کے درمیان ٹمٹماتی ہوئی روشنی دیکھنے کی تمنا......دعاؤں میں اثر نہیں ، بابا...... بابا...... یہ میری محبت ، میری انکساری ، میری رفاقت ، میری نرمی ، میری سادگی ، میرے اجلے پن ، میرے سیدھے پن کی کیسی سزا اور کیوں؟

ایسی سزا کہ آگ پر چل کر آیا ہوں ، اس پار ، جسم زخمی ، روح زخمی ، عمر ۲۴ کے آس پاس ، مرا......بہت مرا........بہت بہت مرا........تب کہیں جا کر پورا مرا ، نہیں کیسے مان لوں ، کیسے آخر ـــ.....؟ (دیگر کردار حرکت کرتے ہیں ، ایک ایک کر کے ، پھر ایک ساتھ)

یکے بعد دیگرے: مقرر ہے وقت ، وقت مقرر ہے ، سب کا ، جاندار ، بے جان ، کل نفسٍ ذائقة الموت ، بچہ ، بوڑھا ، ادھیڑ ، جوان ، پورا ادھورا ، ہوشیار ، نادان ، راجہ رنک ، امیر غریب ....ہر انسان کا وقت.....مقرر....ہے۔

(یہ مکالمے ادا کرتے ہوئے بیساکھی والے آدمی کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اور سسکیوں کے درمیان آواز کی گونج ، جس میں humming کی لہر اور تلاوت۔ بجھن کا گہرا احساس ہو)

جبار: میں گزر چکا ہوں ، گزرے ہوئے وقت کی طرح ، بہت دور ، نامعلوم منزل کی طرف ، رات اور سمندر ، دور بہت دور ، کوئی اور چھور نہیں بابا ، یاد بن کر آنکھوں میں جب آؤں تو اپنی نمی سے پیار کر لینا ، یہ اندھیرے سے اندھیرے کا سفر ، بے انت ، وشال ، لامحدود ، ـــــ اپنے نام کی ایک کشتی پر سوار۔ نامعلوم لہروں پر ، انجانی دشاؤں کی طرف ، نہ خوف نہ ڈر ، بس ایک سفر ، نامعلوم کی طرف ، مجھے الوداع کہہ لو بابا ، مجھے اپنے سے جدا کرو بابا۔(روشنی بیساکھی والے آدمی کے چہرے پر)

چھوٹ رہا ہے سب کچھ، اندھیرا، شاید اس طرح روشنی ملے، مجھے.........الوداع کہہ لو بابا..... یوں دھڑکنوں میں گوندھ کر نہ رکھو.........

(بیساکھی والا آدمی اٹھتا ہے، گہری خاموشی، بیساکھی اٹھاتا ہے، دائیں اور بائیں طرف چلتا ہے، بیساکھی کی آواز، کھٹ کھٹ کھٹ.....ایک عورت گھونگھٹ منھ پر ڈالے سفید ساری میں آتی ہے)۔

عورت: بابو چلا گیا.....چلا گیا بہت دور، جبار کے ابو، نہ آوے گا وہ، یاد ہے چھوٹے میں کتنا شرارتی تھا، دیس میں تو بس میدان میدان......پکڑ لاتے تھے۔ جاکر...........اب نہ آوے گا ،..........جبار نہ آوے گا، جبار کے ابو.........

(اسے ہاتھ سے پکڑ کر ہلاتی ہے) چلو اب گھر کے اندر.......

بیساکھی والا آدمی: ہوں (دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہے)

آواز (پس منظر سے): زندگی کی شام، دیکھتے ہی دیکھتے، چار دن ہو کہ چالیس سال، لمبائی، چوڑائی یا عمر کی چڑھائی سے ناپی نہیں جاتی یہ، ہر جاندار کو بے معنیٰ، بے سمت، بے حصول، بے مہار، بے کار زندگی کا زہر پینا پڑتا ہے۔ جو کر لیا وہ ہو گیا، جو رہ گیا سو رہ گیا۔ پر سچ ہے، ہر چیز ہے وہی، پھر بھی کچھ بدلا گیا ہے، کچھ بے رنگ، کچھ پھیکا پن، حُسن، خوشی، غم، شام و سحر، بات چیت، تارے ستارے، رشتے ناطے، چہرے مہرے، دکھ سکھ، چلنا پھرنا.......جیسے سب پر ایک گرد کی چادر، جیسے ایک پتلی سی جھلی، پھر نہ چاہتے ہوئے بھی گھور، بے انت، لا مقام بے منزل، نامعلوم گہرے گھنے ابدی سناٹے کی طرف، گم ہوتے ہوئے بے آواز سایوں کا ہجوم.....سانس کی ہلکی سی ڈور، کسی مریض کی آواز سے بھی کمزور.....آب و دانہ اٹھا، بسیرا اجڑا، آشیانے چھوٹے، شام آئی نئے آشیانے کی طرف.......(سارے کردار ''آہ'' کی آواز نکالتے ہیں، بیساکھی والا آدمی اور عورت قدم آگے بڑھاتے ہیں)

آواز: کچھ خواب، کچھ حقیقت، تھوڑی ہنسی، بڑا غم، پھر کہانی ختم
لمحہ لمحہ دم بہ دم، بس فنا ہونے کا غم

(سارے کردار اِدھر اُدھر بکھرتے ہوئے، مخصوص Hummimg کے ساتھ ایک

ایک لفظ کو ادا کرتے ہیں)

لمحہ..........لمحہ........دم........بے دم................بس فنا............

(اسی کے ساتھ وہ باہر چلے جاتے ہیں اور پھر ایک ایک کر کے اندر آتے ہیں)

کردار نمبر۱: رولو جی بھر کے

کردار نمبر۲: جی ہلکا ہوتا ہے

کردار نمبر۳: دھیرے دھیرے

کردار نمبر۱: سب کچھ دھندلا جاتا ہے

کردار نمبر۲: باقی بچتی ہے تمہاری زندگی

کردار نمبر۳: ہاں پہاڑ جیسی زندگی

کردار نمبر۱: اور جینا شرط ہے

کردار نمبر۲: جینا ضروری ہے

کردار نمبر۳: کتنی آفت جاں ہے زندگی

آواز (پس منظر سے): تو اکیلا نہیں، اسے رو کر گذار کہ ہنس کر، کتنے ہی حادثوں کے بھنور میں، بچے، بوڑھے، جوان، ڈوب رہے ہیں، ابھر رہے ہیں، تو اکیلا نہیں، بس ایسی ہی یہ بستی ہے، رنگوں سے بنی ہے، چہروں سے سجی ہے، لفظوں سے گھری ہے، بند ہوئی آنکھ تو بس درد بھری ہے، یہ زندگی ہے۔

(پورے اسٹیج پر کردار ''یہ زندگی ہے'' دہراتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ بیساکھی والا آدمی اپنی عورت کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے)۔

بیساکھی والا آدمی: چل جبار کی ماں، اب کب تک......

(دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے، دونوں کردار پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے سائے پس منظر پر نظر آتے ہیں)۔

آواز (پس منظر سے): کیسی یہ ہستی ہے

تیری بھی کوئی ہستی ہے

تو ہنستا ہے تو جگ ہنستا ہے

اور تو روتا ہے تو بس اکیلے روتا ہے
رنگوں سے بنی ہے
چہروں سے سجی ہے
لفظوں سے گھری ہے
بند ہوئی آنکھ تو درد بھری ہے
یہ زندگی ہے

(روشنی ہر طرف سے کم ہوتی ہوئی بیساکھی والے آدمی اور اس کی عورت کے چہرے پر مرکوز ہوتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے سے ختم ہو جاتی ہے)۔

(پردہ)

کل دیکھیں گے

• رفعت شمیم

کردار

ودیاساگر : ادیب شاعر۔ کہانی نویس۔ عمر چالیس پینتالیس کے درمیان۔ تعلیم یافتہ، آبائی وطن بنارس۔ چہرے پر وقت کی جھریاں۔ مزاج میں سنجیدگی۔ پچھلے چند سالوں سے بمبئی کی فلمی دنیا میں ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہیں چنانچہ مفلوک الحال ہیں

بابو بھائی : ان پڑھ۔ عمر پچاس کے آس پاس۔ چہرے پر چاقو کے گھاؤ کا نشان۔ اوائل عمر میں ہی ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بمبئی کے سڑکوں پر پل کر بڑا ہوا۔ سماج کی ہر برائی کو قریب سے دیکھا اور عملی طور سے اس میں شامل بھی رہا۔ اس لیے زندگی کے نشیب وفراز اور خیر وشر سے واقف ہو گیا۔ ایک دو بار جیل بھی کاٹی۔ انداز گفتگو سے بمبئی کا مخصوص مقامی لب ولہجہ نمایاں ہے۔

سندھی : رینٹ کلکٹر، قدرے بوڑھا۔ ناک پر عینک ٹکی ہوئی ہے۔ سر پر کھچڑی سے بال ہیں گفتگو میں سندھی لب ولہجہ کا شدید اظہار۔ عادتاً لالچی اور مکار۔ طبعاً بے حد ڈرپوک ہے۔

راج : ناتجربہ کار۔ خوبرو پنجابی نوجوان۔ بی اے فیل فلمی ہیرو بننے کے جذبے میں سرشار۔ اسی شوق اور جنون میں اپنا سارا گھر بار تیاگ کر بمبئی بھاگ آیا ہے۔ بول چال میں فلمی ڈائیلاگ کا پر تصنع رنگ بدرجہ اتم نمایاں ہے۔ سال بھر سے فلمی دنیا کی خاک چھان رہا ہے۔ لیکن ہنوز ناکام ہے تاہم اپنے مستقبل سے ناامید نہیں ہے۔

پس منظر

بمبئی کی کسی گنجان آبادی کا علاقہ، جس میں زیادہ تر غریب، مزدور اور متوسط درجے کا نوکر پیشہ طبقہ آباد ہے شہر کی اسی آبادی میں ایک پرانی شکستہ عمارت ہے جس کے کسی منزلے پر ایک لمبی سی چال ہے (چال یا چالی بمبئی میں عام طور پر اس جگہ کے لیے مشہور ہے جو کسی عمارت میں ہر منزلے کے اندر زینے کے اختتام پر واقع ہوتی ہے) اور اسی چال میں ایک تنگ و تاریک کمرہ ہے (ایسا چھوٹا رہائشی کمرہ جس میں مختلف کرایہ دار رہتے ہیں بمبئی میں کھولی کہلاتا ہے۔)

ڈرامے کا منظر دراصل یہی کمرہ ہے جس میں داخل ہونے کا دروازہ بیچ اسٹیج پر نظر آتا ہے۔ دروازے سے ملحق دو تین قدموں کا ایک چھوٹا سا زینہ ہے۔ باہر سے ہر آنے والا اسی زینے سے اندر آتا ہے۔ کمرے کے بائیں جانب ایک گندی سی کانچ کی بند کھڑکی ہے۔ اکثر شام کو باہر سڑک کے میونسپلٹی لائٹ کی روشنی اسی کھڑکی سے بمشکل تمام گذر کر کمرے کے فرش پر پھیل جاتی ہے کمرے کے دائیں جانب دو فٹ کا اونچا چبوترہ نما ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم ہے جو اندر غسل خانے کی گذرگاہ کا تعین کرتا ہے۔

پردہ اٹھتا ہے

(کمرے کے ایک کونے میں ایک لمبی رسی بندھی ہے۔جس پر بنیان، تہبند اور ایک دو قمیص لٹکی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔دوسرے کونے میں بانس کی ایک کھر دری چارپائی کھڑی نظر آتی ہے۔ایک طرف ایک مٹکا اور گلاس رکھے ہوئے ہیں۔

باہر سڑک کا اجالا کھڑکی سے کمرے کے اندر جھانک رہا ہے اور جالی کی روشنی کی دھندلی سی پرچھائیں دروازے پر بکھری نظر آتی ہے۔روشنی کا یہی تاثر ہے جو اندر کے اداس اور بوجھل ماحول کی غمازی کر رہا ہے۔

ساگر میز پر سر جھکائے لکھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔کچھ لکھتا ہے اور کاٹ دیتا ہے پھر اچانک سر اٹھا کر سامنے فضا میں گھورنے لگتا ہے۔آہستہ آہستہ اپنے لکھے ہوئے جملوں کو غم ناک لہجے میں دہراتا ہے۔ساگر جیسے ہی اپنی کرسی سے اٹھتا ہے۔بابو بھائی داخل ہوتا ہے اور وسط اسٹیج میں زینے کے پہلے قدم پر کھڑا ہو کر ٹکٹکی باندھے ساگر کو دیکھنے لگتا ہے۔)

ساگر : ''شدکا کے گھور اندھیارے بادل چھائے ہوئے ہیں۔لیکن ایک روپہلی سی کرن آہستہ آہستہ اندھیروں سے پھوٹتی ہے۔یہی ایک آشا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر ساتھ دیتی ہے''(بابو بھائی ساگر کے آخری جملے پر دبے پاؤں بڑھتے بڑھتے ساگر کے قریب پہنچ

جاتا ہے اور ساگر کے جملے کے اختتام پر پیار سے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے)

بابو :جبھی دیکھو۔الو کے مافق اکھا ٹائم بیٹھ کر سوچتا رہتا ہے۔

ساگر :(چونک کر پلٹتا ہے اور خوش آمدید تعجب سے بابو بھائی کو مخاطب کرتا ہے) ارے بابو بھائی تم۔تم کب آئے؟

بابو :ابھی۔اسی وقت

ساگر :کیوں۔کہاں چلے گئے تھے؟

بابو :ہوا پانی بدلی کرنے کو اور کدھر

ساگر :(تشویش ناک لہجے میں)۔پر۔۔بول کے تو جانا تھا

بابو :ابھی اس میں بولنا کیا۔۔یہ آرتھر روڈ ہے نا۔اس کا ناکے اوپر بہت فائن جگہ۔۔

ساگر :تو یوں کہو پھر پکڑ لیے گیے

بابو :پن یہ بارتو کوئلہ کی دلالی میں ہاتھ کالا ہوا

ساگر :کس کی بھلائی کرنے گئے تھے؟

بابو :(منظر کشی کرتے ہوئے)ہاں، جمعہ روج تھا۔اپن فجر سے بھوکے تھے، راستے پر ایک مسجد دیکھا۔میں بولا ''بابو! کبھی نماج (نماز) نہیں پڑھا۔آج پڑھ ڈال (اپنے منظر نامے میں اضطرابی کیفیت پیدا کرتے ہوئے) نماج خلاص کرکے باہر نکلا تو ایک جنٹلمین سری کا میرے باجو سے جوتا اٹھا کر بھاگا میں بولا۔یہ سالا کھدا (خدا) کے گھر میں بھی چوری کرتا ہے۔میرے کو بہت غصہ آیا (یقین دلاتے ہوئے) کھدا قسم بہت غصہ آیا اپن بھی اس کو پکڑنے بھاگا، بھاگتا تھا، تو بھائی لوگ میرے ہیچ کو سپڑا دیے نے پیچھو سپڑا دینے پیچھو چوکی پر۔(کرسی کے اوپر پیر رکھ کر) چوکی پر ایک جاڑا سری نو اصاب (صاحب) کیا رواب (رعب) سے بولتا ہے باپ (زور سے) بند کرو بلا ڈی چور کا ساتھی ہے۔ہم بولا'' صاحب، چور کو چور دکھتا ہے نے اپنا جوتا تو تم سے بھی فسٹ کلاس ہے'' پن وہ کاہے کا سنتا۔سیدھا لوک اپ (Lock-up) میں

ساگر :(اشک شوئی کرتے ہوئے) قانون اندھا ہوتا ہے بابو بھائی تو بے گناہوں کو پکڑا جاتا ہے۔

بابو : (تائید کرتے ہوئے) نہیں تو فر۔۔۔(گفتگو کے بوجھل پن کو عمدہ اردو کرتے ہوئے) پن یہ بتا یار۔ تیرا زندگی کیسا چلتا ہے اور وہ۔ وہ اپنا۔ ہیرو راج کیسا ہے؟ تم لوگ راضی خوشی ہو؟

ساگر :(انتہائی سنجیدگی سے) جہاں ہم لوگ رہتے ہیں وہاں خوشی بھول کر بھی نہیں آتی

بابو :(بابو کو یہ احساس ہے کہ ساگر بہت اداس ہے چنانچہ وہ اس کے غم میں شریک ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے قریب جا کر بڑی کوشش سے اپنی ہمدردی کا اظہار کر پاتا ہے) ساگر۔ ساگر۔ تو بہت دکھی دکھتا ہے۔ سالا میں جیل کے اندر تھا، پن میرا دل ادھر ہوتا۔

ساگر :دکھی۔ دکھ تو اب جیون بھر کے ساتھی بن گئے ہیں۔

بابو :اٹھ کر فضا میں گھورتا ہے اور نہایت مایوس ہوکر) سوچتا ہوں جیل کے اندر بھی وہیچ اندھیرا۔ نے جیل کے باہر بھی وہیچ اندھیرا (زور سے) سالا اپن لوگ کا یہ اندھیرا کبھی دور ہوگا؟ (عمداً موضوع گفتگو بدلتے ہوئے) چل تو فکر مت کر (پکوڑوں کی پڑیا نکال کر ساگر کو دیتا ہے) لے۔ میں تیرے لیے رام بھروسے ہوٹل کا کاندے کا بھجیا لایا ہوں۔ لے کھالے۔ دیکھ۔ (کندھے پر ہاتھ رکھ کر) جو پیدا کیا ہے نا۔ اوپر والا۔ وہ فکر کرے۔ غم کرے۔ ٹھیر میں تیرے لئے پانی کا گلاس لاتا ہوں (پانی مٹکے سے گلاس میں ڈالتا ہے اور ساگر کی طرف متوجہ ہوتا ہے) ساگر۔ وہ تیری چوپڑی کا کیا ہوا جو تو لکھ ریلا تھا۔

ساگر :ناول! (مایوسی سے سر ہلا کر) ناول پاس نہیں ہوا

بابو :(تعجب اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے) تو اتنا فسٹ کلاس رائٹر نے تیرا ناول پاس نہیں ہوا؟

ساگر :فسٹ کلاس رائٹر ہوا تو کیا قسمت تو فسٹ کلاس نہیں

بابو :پن تو تو بولتا تھا کتاب والا تیرا دوست ہے۔

ساگر :اگر اسے کچھ روپئے پیسے کھلا دیتے تو دوستی بھی کام آجاتی

بابو :(غصے سے) مت کر۔ بھروسہ مت کر۔ وہ تیرا نہیں روپیے کا دوست ہے

ساگر :(طنزیہ لہجے میں) کہتا تھا۔ زندگی میں کسی کا خون نہیں کیا۔ اسی لئے ناول میں جان نہیں۔

بابو :(اچھل کر فخریہ انداز میں) ایسا! تو پھر اپن فسٹ کلاس خونی نے فسٹ کلاس رائٹر، کل سے اپن بھی ایک چوپڑی لکھتے، جیل کا داستان لکھنے وال بابو بھائی داخلے باز (غصے میں) پن میرے کو تو بول کون ہے وہ

ساگر :ابھی ابھی تمہارے آنے سے ذرا پہلے گیا ہے

بابو :کون وہ بڈھا سری کا پھکٹر، مکھی چوس، کنجوس، چشمش پہلے سے کاہے کو نہیں بولا۔ ایمان سے اپن اس کو ادھر ہیچ سلا دیتا اس کا پاکٹ مارا تو سالا باپ دادا کے زمانے کا ایک پیسہ نکلا وہ بھی چھید والا۔ (بابو یہ کہہ کر رسی پر سے تہبند اور تولیا اتارتا ہے اور غسل خانے کی طرف رخ کرتا ہے) اچھا بھائی! اپن تو ابھی نہانے کو فٹے (ڈھونڈتے ہوئے) وہ صابن کدھر ہے۔ جیل کے اندر سالا بہت پلید لوگ تھا۔ اکھا بدن میرا باس مارتا ہے (صابن کی ٹکیہ ہاتھ میں لے کر) ہاں ملا ملا صابن ملا (بابو کمرے کے عقب میں غسلخانے کی طرف دیکھتا ہے۔ اسٹیج کا یہ عقبی حصہ نیچے پہلے منزلے کی علامتی نشان دہی کرتا ہے)۔ اے۔ جاڑی۔! نیچے والی۔ نل بند کر نل بند کر کسا۔ تم چی ممبئ کی تو آئی چی۔ (مرہٹی میں کچھ جملے غصے سے بولتا ہے اور بڑبڑاتا ہے اندر غائب ہو جاتا ہے۔ اس درمیان سندھی رینٹ کلکٹر ہے کوئی حجام نہیں (کالفظ ادا کرتے ہی اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے)۔۔۔اوہ وڑی ''ماشیو کرے لا بھولی ویو'' (میں شیو کرنا بھول گیا) ۔۔۔وڑی ہم سنا۔ تم کو بی ٹی اور میرا مطلب ٹی بی ہے سائیں یہ بھاڑے کا کھولی ہے۔ کوئی دھرم شالہ نہیں۔ ہاسپٹل نہیں، ہمارا سیٹھ بولتا ہے نمبر چودہ کو ایک دم خالی کا نوٹس مارو۔ سمجھا کیا ورجہ۔۔(سندھی کے آخری جملے سے پہلے بابو بھائی کے گنگنانے کی آواز اندر آنے لگتی ہے۔ سندھی کے جملے کا اختتام پر بابو بھائی سندھی کے سامنے کھڑا ہو چکا ہے بابو ایک کھٹل سا چاقو گھماتے ہوئے سندھی کی جانب بڑھتا ہے۔

سندھی کی آواز میں خوف سے لکنت پیدا ہو جاتی ہے)

بابو :(گنگناتے ہوئے) نہ شرماؤ تم ہمارے نزدیک آؤ۔خدا کی قسم تم جواں ہو گئے ہو۔ ''ورنہ کیا۔'' آگے بول آگے بول۔۔۔۔

سندھی :اوہ بابو بھائی !تم۔۔۔سائیں نمستے۔وڑی سلام علیکم

بابو :(سندھی کو کالر سے پکڑتا ہے اور گول گھماتا ہے) اے وڑی یہ بوم بوکا ہے کو لگائے لا ہے

سندھی :وڑی بوم کون لگاتا تھا تو ہم تو ساگر بابو کا ساتھ ذرا ڈائیلاگ کا پریکٹس کرتا تھا۔

بابو :ایسا۔نے یہ راج کپور ہے۔دلیپ کمار ہے۔یہ کون بولتا تھا؟ تیرا باپ؟ (بابو بودھکا دے کر زمین پر گرا دیتا ہے)

سندھی :نہیں بابو بھائی نہیں

بابو :بول ابھی یہ لفڑا کیا ہے؟

سندھی :(اٹھتے ہوئے)لفڑا؟لفڑا تو کچھ بھی نہیں سائیں،وڑی وہ سیٹھ بوم مارتا تھا کہ نمبر چودہ کا کھولی کا بھاڑہ ابجون تلک نہیں ملا

بابو :تو کیا سالا ہم لوگ تیرا کرایہ لے کر ادھر سے بھاگ جائے گا

سندھی :ہم ایسا کدھر بولتا ہے سائیں۔وڑی ہم تو نوکر آدمی ہے وقت پر سیٹھ کو رینٹ نہیں دیا تو میرے کو نوکری سے تڑی پار کر دے گا

بابو :(برہم ہوکر) پنوتی مل !کاہے کو گھنس دلاتا ہے(پیار سے چمکارتے ہوئے) لے یہ بیڑی لے۔(یاد کرتے ہوئے) جبھی تو سندھ سے نوا نوا ادھر آیا تھا تو کیا لایا تھا؟

سندھی :صرف اپنا وائف کو

بابو :(بگڑ کر) ایسا؟۔۔۔نے سگڑی،جھاڑو،برتن نے کھٹلا تلک کون لایا تھا؟ تیرا باپ؟

سندھی :(ماں گئی آ ویو(میں لایا)

بابو :نے پیچھو ادھر ممبئی میں آکر کدھر مرا؟

سندھی :ورلی کا چال میں کھولی کا اندر

بابو :نے وہ کھولی کون دلایا؟

سندھی :تماں بابو بھائی (تم بابو بھائی)

بابو :صرف بابو بھائی

سندھی :ہاں۔صرف۔۔۔

بابو :نے پیچھو آج اکڑائی جماتا ہے جبھی تو سندھ سے کڑکا ہوکر نوانوادھر آیا تھا تو میں تیرے کو کھولی دلایا اور تو تو کھولی کا بھاڑ دتک کا نہیں بھراتھ۔وہ تو میں تیرے کو بچایا۔نہیں تو بھائی لوگ کبھی کا تیرے کو خلاص کرڈالتے۔

سندھی :(عاجزانہ لہجے میں)وڑی میں کدھر رواب جماتا ہوں

بابو :(دھکا دیتے ہوئے) چل شیانا بن۔شیانا بن۔کل پرسوں تک تیرا کھاتا چپتہ ہو جائے گا (سندھی تیزی سے باہر دروازے کی طرف بڑھتا ہے بابو لپک کر پیچھے اسے پکڑ لیتا ہے اور تفریح لیتے ہوئے ساگر سے مخاطب ہوتا ہے)

بابو :صبر۔۔۔(ساگر سے) کیا وچار ہے۔ٹھکانے لگاتا ہوں،تیرے ناول میں جان آجائے گا (ساگر مسکراکر نا لنے کا اشارہ کرتا ہے) نہیں جانے دوں؟ (سندھی سے) چل چل راستہ ناپ۔فٹ (سندھی تیزی سے باہر بھاگ جاتا ہے۔بابو کچھ لمحوں بعد اس کے پیچھے بھاگتے ہیں)

بابو :نے اے وڑی باہر والے سے دوسنگل چائے کم الیبلی نے ایک پان دیسی ٹکڑا مسالا نے چونا اوپر (ہاتھ جھاڑتا ہے اور زینے کے اوپر سے کھڑے ہوکر) دو ٹکے کا چھوکرا۔نے کھالی پیلی اتنی اکڑائی جماتا ہے (ایک لمحے بعد بڑی گمبھیرتا سے ساگر کے پاس جاکر) ساگر۔ساگر تیرے کوٹی بی ہوا؟

ساگر :ایک بیماری ہوتو کہوں۔ٹی بی۔بلڈ پریشر۔غریبی۔۔۔۔

بابو :ارے بلڈ پریشر تو،یہ اپنا کھولی کا سیٹھ ہے نا اس کو ہے۔یہ تو موٹا پیٹ والوں کو ہوتا ہے۔پن تو اس کا علاج ولاج نہیں کرایا؟

ساگر :فقط موت اس کا علاج ہے۔

بابو : (برہم ہوکر) کاہے کو زندگی میں مرنے کی بات کرتا ہے۔

ساگر : جی ٹی بی ہسپتال میں داخلے کی بہت کوشش کی لیکن وہاں کل ایک ہزار بیڈز اور پانچ ہزار اپلیکیشن تھیں۔

بابو : (معصومانہ انداز میں) تو گھسا دینی تھی ایک خود کی اپلیکیشن جدھر پانچ ہزار ادھر پانچ ہزار نے اوپر ایک اور

ساگر : اسطرح ایک سال بعد نمبر آتا۔

بابو : (متفکر ہوکر) بیماری آج۔۔۔نے علاج ایک سال پیچھو؟

ساگر : وارڈ بوئے بولتا تھا،۔۔"سو روپے کا نوٹ ڈھیلا کرو تمھاری اپلیکیشن اوپر رکھ دیتا ہوں۔"

بابو : تو چٹکا دینا تھا نا ایک سو کا پتہ (بابو کو احساس ہوتا ہے کہ یہ ساگر کی استطاعت سے باہر ہے تو نادم ہو جاتا ہے) اوہ۔۔۔تیرے پاس تو کھانے تک کا نوٹ نا ہے میں اپن بھی تو جیل میں تھا (فیصلہ کن انداز میں) ابھی کل سے اپن تیرے لئے سو کا بندوبست کر دیتے ہیں۔

ساگر : اس طرح دوسروں کا حق مارا جائے گا۔

بابو : (غصے سے) ابھی حق بھائی کو جو میں ڈال یہ اکھی دنیا بیچ ایسی ہے، تیرا کیسا کڑک تو سب لوگ سب سلام کریں گے (عمداً بات بدلتے ہوئے) یہ ہیرو ہجون تک نہیں آیا (دروازے کی طرف جا کر) نے باہر والا بھی کدھر مر گیا (ساگر کی طرف متوجہ ہوتا ہے) ساگر ایک بات بولوں تیرے کو تو اپنے ملک کا ٹکٹ کٹالے۔واں کھلی جگہ ہے۔۔پیچھو ہوا پانی بدلی کرے گا تو ایک دم اچھا ہو جائیگا (اپنے بازو کی مچھلیاں دکھاتے ہوئے) اے سینڈو حمیدہ پہلوان کا ماقق (ساگر کا ردعمل ایک اداس سی خاموشی ہے۔بابو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے) اے بھائی! اپن کچھ بولے تیرے سے۔

ساگر : خالی ہاتھ ملک میں جا کر کیا کروں گا

بابو : خالی ہاتھ تیرے کو کون بولا (ہنس کر بات ٹالتا ہے) بستر نے پیٹی بھی ساتھ لے کر

جانے کا،

ساگر :(قدرے زچ آکر) پلیز۔ بابو بھائی۔ مجھے یہ ناول کمپلیٹ کر لینے دو۔ صبح ہوتے ہی مجھے ناول پورا کرنا ہے۔

بابو :(اس درمیان بستر نکال کر زمین پر بچھاتا ہے) کیا کیا۔ بہت کیا ناول لکھے گا۔۔۔سو جا مہربان نہیں تو کھالی پیلی بتی کا بھاڑہ زیادہ آئے گا۔ گیارہ بجنے کو آیا مائی باپ۔ اجالے میں اپنے کو نیند نہیں آتا سالا؟ جیل کا عادت جو پڑیلا ہے۔

ساگر :تم سو جاؤ میں لیمپ جلا لیتا ہوں۔

بابو :(بستر پر دراز ہوتے ہوئے) یا اللہ۔۔۔یا معی توز دشمن کی نلی۔ جسے ڈھونڈتے تھے گلی گلی۔ وہ ملی بھی سالی کہاں ملی۔ تپلی گلی کے موڑ پر کھڑی ملی

ساگر :بابو بھائی۔ بھگوان کے لئے اب سو بھی جاؤ۔(ساگر کمرے کی بتی بجھا کر ٹیبل کی لیمپ جلاتا ہے اور بابو کی جانب ملتجی نگاہوں سے دیکھتا ہے کہ اب سو جاؤ)

بابو :(عمداً لمبے لمبے خراٹے لیتا ہے) خر۔خر۔خر۔

(روشنی مدھم ہو چکی ہے۔ ساگر میز پر جھک کر لکھنے میں مصروف ہے۔ بابو کے خراٹوں کی صدا تیز ہو کر ختم ہو جاتی ہے اس درمیان راج گنگناتا ہوا باہر سے کمرے میں داخل ہوتا ہے بتی جلاتا ہے۔ بابو ہڑ بڑا کر آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہو جاتا ہے ساگر مڑ کر راج کو دیکھتا ہے)

بابو :(قدرے برہم ہو کر) شا۔چھی۔ یہ بتی کون جلایا؟

ساگر :کون؟۔۔۔راج

بابو :(اٹھتے ہوئے) کون ہے یار، کون بتی سلگایا؟

راج :(بابو بھائی کو مسرت سے دیکھ کر) بابو بھائی

بابو :ہائے دل(آگے بڑھتا ہے)

راج :تیزی سے آگے بڑھتا ہے) جگر!(دونوں کے بیچ چارپائی حائل ہو جاتی ہے بابو بھائی چارپائی سمیت فرط مسرت سے راج جی کی طرف بڑھتا ہے اور گلے لگ جاتا ہے)

بابو : کلیجے!

راج : گردے!

بابو : تلی!

(دونوں ایک دوسرے سے بمعہ چارپائی بغل گیر ہوتے ہیں کچھ دیر گول گھوم کر چارپائی پکڑے ہنسنے لگتے ہیں)۔۔۔راج (نہایت شفقت سے) کاہے کو اتنی دیر سے آتا ہے۔

راج : راج جب بھی آتا ہے۔دیر سے آتا ہے

بابو : اے ابھی، رہنے دے یہ ڈائیلاگ خود کا باجو میں رکھ

راج : لیکن بابو بھائی تم کب آئے۔غائب ہوئے تو ایسے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ہم دونوں نے تمہیں کتنا تلاش کیا

بابو : اپن جیل کے اندر پڑے تھے بھائی۔پندرہ بیس دن تک سرکار کا بھتہ کھٹایا (قیدی کا یومیہ) نے پیچھو آج واپس چلے آئے

راج : کس کی شامت آئی تھی جس نے تمہیں پکڑلیا۔

بابو : یہ بات چھوڑ ابھی۔جیل جانا تو اپنا ہر مہینے کا بندھیلا ہے۔

راج : تمہارے بغیر یہ اجڑی ہوئی کھولی اور بھی ویران لگتی تھی!

بابو : چل ابھی کلیت مت چڑھا۔یہ بول تیرا زندگی کیسا چلتا ہے؟

راج : زندگی۔زندگی صبح سے شام تک اسٹوڈیوز کی خاک چھانا کرتی ہے

بابو : تو تو بہت تھکیلا ہوگا۔(اٹھ کر پکوڑوں کی تھیلی لاکر دیتا ہے) لے یہ بھجیئے کا پڑی لے، میں رکھا تھا تیرے لئے۔کھالے کھالے ابھی

راج : بھوک بالکل نہیں ہے۔

بابو : کھالے کھالے ابھی۔فجر سے شام تک اکھڑتا ہے نے فر بھی بھوکا نہیں؟

راج : کھانے کو غم اور پینے کو آنسو بہت ملتے ہیں۔پھر بھی تم سمجھتے ہو میں بھوکا رہتا ہوں

بابو : چل ابھی ڈائیلاگ مت بول۔گپ چپ کھالے۔

راج : (کھاتے ہوئے) بابو بھائی دنیا میں اگر تم جیسے انسان اور پیدا ہو جائیں تو اپنے اس دیش سے جانتے ہو بھوک اور غریبی سدا کے لیے ختم ہو جائے۔

بابو : فر (پھر) گلیٹ مارا۔ گپ چپ کھانے کا۔ (ایک دیا سلائی سے اپنا کان کھجاتے ہوئے) ساگر۔۔۔ یہ جیل میں میرے کو ایک آدمی بولتا تھا کہ یہ اپنا نوا پرائم منسٹر کبھی پانچ سال کے لیے جم جاوے تو بھوک اور غریبی سدا کے لیے خلاص ہو جاوے (ساگر لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے راج رسی پر سے قمیص اتارتا ہے) پن میں بولا (زور سے) اے بھائی پلٹ (ساگر اور راج دونوں بابو بھائی کی آواز سے چونک جاتے ہیں اور پلٹ کر دیکھتے ہیں) جب تلک اپن زندہ رہتے یا مرتے خدا کو معلوم

راج : کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

بابو : (خراج تحسین پیش کرنے کے انداز میں) ہاں مرجا غالب میں بھی ثریا نے کیا کمال گایا۔

راج : ایک تو اسٹوڈیو کے اندر پہنچنا مشکل۔ چپراسی سے لے کر بڑے تک سب خدائی فوج دار۔ بھگوان کے پاس پہنچنا آسان ہے مگر مشکل ہے تو یہ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کے پاس

بابو : یہ پہلا اپنا فلم کے نادر بہت پہچان ہوتا پر جبھی سے وہ ایکسٹرا سپلائر کو ٹھکانے لگایا تب سے اپن نے واں کا جانا بیچ بائیکاٹ کر دیا۔ پن یہ فلم والے کبھی وقت پر کام نہیں آتے بھڑوے۔ نہیں تو اپن کبھی تیرے کو چٹکا دیتے

راج : پندرہ روز سے خانصاحب کے برابر چکر لگا رہا ہوں۔ ہر روز یہی کہہ کر ٹال دیتا ہے ''کل دیکھیں گے''

ساگر : (قلم میز پر رکھتا ہے اور کتاب ہٹا کر گفتگو میں شامل ہوتا ہے)

ہاں۔ اچھی طرح یاد ہے

بابو : دیکھ اس کو بھی کیڑا کاٹا

ساگر : (گذشتہ سے پیوستہ کے انداز میں) رویل صاحب کی فلم کے ڈائیلاگ لکھے تھے۔

ابھی تک کم بخت نے پیسے نہیں دیے۔

بابو : (جوش میں آکر) تو بلا پھر اسماعیل قصائی کورٹ میں Small Causes (Court ایمان سے اپن بھی آدھ کیس لڑ ڈالیں۔

راج : میک اپ مین ٹھیک کہتا تھا فلم انڈسٹری کے داخلے کا آسان ٹکٹ ایک عدد حسین سہارا ہے۔

بابو : (رازدارانہ طور پر) تو کبھی بول تو اپن اپنی منی بائی سے چنی بائی کا بٹن کا بندوبست کر ڈالیں تیرے لیے

راج : ہر عورت یہاں آخر تمہاری منی بائی اور چنی بائی بن جاتی ہے۔

بابو : پن راج میں تیرے کو ایک بات بولوں۔تو یہ لائن کو چھوڑ نے کوئی اچھی لائن پکڑ۔ (راج کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے مگر کہہ نہیں پاتا) جبھی تیرے کو معلوم ہے یہ لائن کھراب ہے تو کاہے کا چھوڑ نہیں دیتا۔

راج : چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

بابو : تیرے بھیجے میں کوئی کام کی بات نہیں گھسنے والی، سوجا مہرنا! سوجا! نہیں تو بتی کا بھاڑہ چڑھ جائے گا۔ (بڑبڑاتے ہوئے لیٹ جاتا ہے) دلیپ کمار بنے گا۔راج کپور بنے گا۔کھانے تلک کے تو بھائی کے واندے ہیں (بابو بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔راج چارپائی بچھا کر سونے کی تیاری کرتا ہے، روشنی مدھم ہونے لگتی ہے)
یاعلی۔توڑ دشمن کی نلی۔جسے ڈھونڈتے تھے گلی گلی۔وہ ملی تو سالی کہاں ملی۔۔۔

(کچھ وقفے کے بعد)

ساگر : (کتابوں میں سے خط ڈھونڈتے ہوئے) ارے ہاں۔راج۔کیا سوچ رہے ہو۔ وہ۔وہ میں بھول گیا۔ہ۔۔تمہارا خط ہے (راج کو خط دینے کے لیے اٹھتا ہے) تمہارے جانے کے بعد آیا تھا۔

راج : (چارپائی سے اٹھ کر ساگر کے پاس خط لینے بڑھتا ہے) خط۔۔۔ہوسکتا ہے (خط کو لے کر) کسی فلم کے پروڈیوسر وغیرہ نے بھیجا ہوگا (فرط مسرت سے لفافے میں

سے خط نکالتا ہے) وہ مارا پاپڑ والی کو۔ (خط کو پڑھتے پڑھتے راج سکتے میں آجاتا ہے کرسی پر بیٹھ کے سر کو ہاتھوں میں تھام کر چپ سادھ لیتا ہے)

بابو : (جو بیدار ہو چکا ہے بستر سے اٹھتا ہے) کیا یار یہ کیا ہے؟ ارے یہ کیا ہے؟ (راج کے پاس جاتا ہے) کس کا خط ہے؟ (ساگر جس نے اس درمیان راج کے ہاتھوں سے گرے ہوئے خط کو زمین سے اٹھا کر پڑھ لیا ہے بابو بھائی کو خط پکڑا دیتا ہے بابو خط کو زمین سے اٹھا کر پڑھ لیتا ہے بابو خط کو ہاتھ میں لے کر) ارے بول ۔کون دیا ۔۔میں بولتا ہوں کدھر سے آیا یہ میں بولتا ہوں کدھر سے آیا یہ (راج اور ساگر کی خاموشی سے بابو بھائی نہایت طیش میں آجاتا ہے اور چیخ کر پوچھتا ہے) ناٹک کرتے ہو تم لوگ کیا؟

ساگر : (نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں)راج کا خط ہے۔۔اس کا پتا ایکا ایکی دہانت ہو گیا ہے۔

بابو : (انتہائی صدمے کے عالم میں ایک لمحے کے توقف کے بعد) میرے کو۔میرے کو پہلے بیج کھبر (خبر)تھا (فیصلہ کن انداز میں) پن فکر کا بات نہیں فجر کو اپن تیرا بندوبست کر دیتے ۔تو اپنا بوریا بستر سنبھالنا اور ملک کو چالو پڑ جانا۔ کیا؟

ساگر :مگر ۔مگر پیسے تو تمہارے پاس بھی نہیں ہیں

بابو :تم پیسے کا فکر مت کرو۔اپن کھیسا کاٹیں گے۔ پاکٹ ماریں گے پن تیرے کو تیرے گاؤں پہنچائیں گے

راج : (بے خودی کے عالم میں)لیکن گاؤں جا کر کروں گا بھی کیا؟اب وہاں رہا بھی کون ہے؟

بابو :(وفور جذبات سے ناصحانہ انداز میں) گاؤں نہیں جائے گا تو نے یہاں بھوکا رہ کر دلیپ کمار بنے گا۔راج کپور بنے گا کبھی نہیں بنے گا سالا کبھی نہیں بنے گا یہ شوق کا خاطر تو نے اپنے ماں باپ کو بھی سلا دیا (غصے سے بدحواس ہو کر گلا پکڑ لیتا ہے)شریف آدمی بن سالا شریف آدمی بن

راج :(چیخ کر) پر تم کیوں شریف آدمی نہیں بنتے ؟

(کچھ لمحوں کی خاموشی ۔بابو بھائی راج کے اس جملے سے ٹوٹ کر منتشر ہو جاتا ہے جیسے

کسی اونچی عمارت سے گر کر پاش پاش ہو گیا ہو۔ کچھ دیر کے بعد خود کو سنبھالتا ہے اور آنسو کو پی کر بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ساگر بھی محو حیرت دیکھتا رہتا ہے)

بابو :میں بھلے ہی کھراب (خراب) سہی راج۔ پن میرا دل کھراب نہیں میں بھی زندگی میں ایک دفعہ شریف آدمی بننے گیا تھا بولا'' بابو کوئی دھندا پانی کر'تو یہ نل بجار (بازار) پر بیٹھ کے بچہ لوگوں کا کھلونا لے کر فٹ پاتھ پہ بوم مارتا تھا'' روپئے میں دو'روپے میں دو۔'' اتنے میں ایک حولدار آکر اکڑائی جمایا۔ میں بولا حولدار ابھی اپنے کو دھندہ پانی کرنے کا ہے ۔شریف آدمی بننے کا ہے شریف آدمی کا ہے'' وہ بولا ''فیری (پھیری) کرنے کا ہے تو روج (روز) کا دس روپیہ ڈھیلا کر نہیں تو چالو پڑ۔ تیرا باپ بھی کبھی شریف آدمی بنا تھا۔'' باپ کا نام لیا ہے ایسا کھار آیا۔اس کو ادھر ہچ گھمایا ۔۔نے پیچھو۔۔دو مہینے کی کاٹ کر آیا۔۔یہ دنیا اپنا جیسا آدمی کو کبھی شریف نہیں بننے دے گا اپنا زندگی تو ایسا ہی چلتا ہے نے ایسا ہچ خلاص ہو جائے گا۔

ساگر :مجھے یقین ہے راج نے جان بوجھ کر دل نہیں دکھایا ہم سب جانتے ہیں یہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا

راج :(راج کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوتا ہے وہ بابو بھائی سے اپنی ندامت کا اظہار کرتا ہے)۔مجھ سے مجھ سے بھول ہوئی بابو بھائی مجھے شما کر دو میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا پلیز میں۔۔

بابو :خلوص وشفقت کے جذبات سے سرشار اپنے صدمے کو مسکراہٹ میں چھپا کر بولتا ہے دیکھ! تیرا جیسا اس دنیا میں کتنا لوگ اس شوق کا خاطر اپنا ماں باپ ،گھر بار۔۔ سب کچھ برباد کر دیا ہوگا۔(ناامیدی اور قنوطیت کی فضا کو ساگر بہر حال پر امید بنانے کی کوشش کرتا ہے عاجزانہ طور سے بابو سے مخاطب ہوتا ہے) لیکن بابو بھائی! ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔۔ایک موقعہ اور۔۔۔کل دیکھیں گے۔

راج :اضطرابی کیفیت میں) ہاں! میرا فلم اسٹوڈیو میں کل پھر اپوائمنٹ (appointment) ہے ایک پروڈیوسر نے بلایا ہے بڑی امید ہے کل دیکھیں

گے۔،کیا ہوتا ہے

بابو :دونوں کے قریب جا کر ان کے کندھوں پر اپنے بازو حمائل کرتا ہے اور مسکرا کر بادل نخواستہ ان کی تجویز کی تائید کرتا ہے)ابھی تم لوگ بولتے ہو کل تو اپن بھی بولتے ہیں کل دیکھیں گے کمرے میں روشنی مدھم ہو رہی ہے بابو بستر پر دراز ہونے کی تیاری کرتا ہے راج چارپائی بچھاتا ہے ساگر کرسی پر بیٹھ لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔موسیقی کی دھن گونجتی ہے اور فضا میں ساگر کی آواز بلند ہوتی سنائی دیتی ہے)

ساگر :یہی ایک آشا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر ساتھ دیتی ہے

(روشنی فیڈ آوٹ ہو چکی ہے)

(پردہ تیزی سے گر جاتا ہے)

آخری رات

● یوگ راج

کردار

جیلر

جارج

منگل

کشور

لڑکی

جیلر کا کمرہ

کھڑکی کے سامنے ایک میز اور کچھ کرسیاں۔ میز پر کچھ کاغذات بکھرے پڑے ہیں دونوں طرف فائل رکھے ہیں۔ فائلوں کے آنے اور جانے کے لئے الگ الگ فائل ٹرے ایک طرف کولکڑی کی الماری دائیں بائیں دونوں جانب قوس کی شکل کے راستے ہیں۔ ایک راستہ جیل کے باہر کے بڑے گیٹ کی جانب لے جاتا ہے اور دوسرا مجرموں کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں کو چلا جاتا ہے۔

رات بڑی اندھیری ہے باہر بڑے زوروں کی ہوا چل رہی ہے کھڑکی کے پٹ بار بار آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ کمرے میں ہوا کی شائیں شائیں کا شور گونج رہا ہے۔ کھڑکی کے باہر بالکل پاس میں کوئی گھنا پیڑ بھی ہے جس کی پتوں سے لدی شاخیں بے تحاشہ جھوم رہی ہیں اور کمرے میں لٹک رہی بلب کی روشنی جھول رہی ہے۔ ہوا کے زوردار جھونکوں نے میز پر رکھی فائیلوں، کاغذات کے ساتھ کمرے کی ہر چیز کو تحس نحس کر رکھا ہے۔ جیلر صاحب جلدی سے آتے ہیں۔ کمرے کی یہ حالت دیکھ کر فوراً کھڑکی کی طرف لپکتے ہیں۔ بڑی مشکل سے کھڑکی کے پٹ قابو کر، بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کھڑکی کی چٹخنی نہیں لگ پا رہی، جھنجھلاہٹ سے۔

جیلر : اب یہ کھڑکی کمبخت اتنی بار کہا...... کھڑکی کی چٹخنی نہ لگ سکی ۔ توبہ....توبہ
اتنی تیز ہوا۔
(آواز لگاتے ہوئے جھنجھلاتے ہوئے)
منگل ـــــ منگل۔
منگل تیزی سے داخل ہوتا ہے۔

جیلر : اس کھڑکی کی چٹخنی لگانے کوئی باہر سے آئے گا کیا...؟

چپراسی : جی... وہ

جیلر : اب منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ ...اس کھڑکی کا کچھ کرو۔

چپراسی : جی.... جی...
(جلدی سے کھڑکی سے کشتی کرتا ہوا کھڑکی بند کرتا ہے)......لو صاحب......اب نہیں کھلے گی۔ اگر چاہیں گے بھی تو نہیں کھلے گی۔

جیلر : کیا مطلب؟

چپراسی : نہیں صاحب......میرا مطلب ہے وہ۔

جیلر : اب یہ کاغذ اٹھا کر میز پر رکھ دو......

چپراسی : جی......جی......بہتر۔
(اور جلدی سے کمرے میں بکھرے کاغذ اکھٹے کر میز پہ قرینے سے رکھنے لگتا ہے)

جیلر : (جلدی جلدی ایک دو قدم فٹ لائٹ کی طرف بڑھ کر خود کلامی کے انداز میں)
کس قدر تیز ہوا چل رہی ہے......مانو ہر شے اڑا کے لے جائے گی اپنے ساتھ۔

چپراسی : ڈرامائی انداز سے پرخوف لہجے میں
طوفان ہے سر طوفان باہر والا پیپل کا پیڑ تو ٹوٹ کر گر بھی گیا ہے۔

جیلر : (طوفانی ہوا کی آواز سن کر) یہ شان، شان، کی آواز بھی کس قدر ڈروانی ہوتی ہے؟

چپراسی : سچ، باس ایسی!!! ایسی راتیں بڑی ڈراونی ہوتی ہیں۔

جیلر :وارڈ میں قیدیوں کی کوٹھڑیوں کی کھڑکیاں روشندان سب بند ہے نا......؟

چپراسی :ہاں، ہاں سر وہ تو میں نے شام کو ہی بند کردیئے تھے......سچ سر! ایسا طوفان تو نہ کبھی دیکھا اور نہ سنا۔

جیلر :ارے ہاں......قیدی نمبر سولہ کی......

چپراسی :وہ تو آپ خود چیک کر چکے ہیں سر۔

ہاں، ہاں وہ تو میں نے خود چیک کیا تھا۔

چپراسی :(بات کرنے کا موقعہ تلاش کر)

سر......وہ......قیدی نمبر سولہ کل صبح

جیلر :(چڑھ کر غصے سے) ہاں، ہاں، کل صبح اسے پھانسی دی جائے گی......کون نہیں جانتا۔

چپراسی :سہم کر......

جی سر......لیکن وہ......

جیلر :(غصے سے کھڑے ہوکر) لیکن وہ کیا—؟ جاؤ اپنی ڈیوٹی پر مستعدی سے رہو۔

جارج :(سفید چوغے میں ملبوس ہاتھ میں مقدس کتاب لئے پریشان سا داخل ہوتے ہوئے)

خدا جانے کس مٹی کا بنا ہے......زندگی سے اس قدر بیزار......؟

جیلر :(حیران کن لہجے میں) ایک مجرم سے اس قدر لگاؤ............؟

جارج :(زہر خندہ لہجے میں) مجرم......ہاں......لیکن کس قدر مختلف ہے یہ مجرم......کیا مجرم بھی کبھی۔

جیلر :کیا ہوگا ہمارا ایسا سوچنے سے......اسے کیا فرق پڑے گا؟ موت تو اس کا مقدر بن ہی چکی ہے۔

جارج :موت کس کا مقدر نہیں جیلر صاحب......لیکن اس کے دل پہ اک بوجھ ہے۔ بارود کی صورت میں پھٹ پڑنے کو بے چین......یا کوئی دل میں دبا راز......نہ جانے وہ کیوں......

جیلر :(پرزور لہجے میں سوالیہ انداز سے) مسٹر جارج—؟ آپ اس سے کیا توقع رکھتے

ہیں گناہ کا اعتراف تو وہ ڈنکے کی چوٹ پہ کر چکا ہے۔

جارج : میں انسانیت کا طالب علم ہوں۔ جیلر صاحب۔...... انسانی نفسیات سے مجھے گہرا لگاؤ ہے...... نہ جانے کیوں مجھے اس کا یہ اعتراف کھوکھلا جان پڑتا ہے...... یا اس کی اس انسان دشمن حرکت کے پیچھے پوشیدہ کوئی بہت بڑا راز ہے...... وہ کچھ چھپا رہا ہے۔

جارج : (اپنی بے چینی سے لڑتے ہوئے) مانا...... لیکن آخر وہ ایک انسان ہے وہ انسان جن کے دل میں مقدس باپ نے اپنی مظلوم مخلوق کے لئے بے پناہ درد بھر دیا ہے۔ جو زندگی سے بے پناہ محبت کرتا ہے دکھی دلوں کا دکھ دور کرنے والا مصیبت زدہ لوگوں کی مصیبت میں کام آنے والا...... زندگی سے پیار کرنے والا...... (جارج کی طرف آتے ہوئے جیلر)

جیلر : کس کی بات کرر ہے ہیں آپ؟ سولہ نمبر تو اپنی موت کا انتظار ایسے کرر ہا ہے جیسے کوئی بھوکا بچہ دودھ کا انتظار کرتا ہے۔

(بے چینی سے اٹھ کر)

جارج : یہی تو رونا ہے: اسے کیوں احساس نہیں کہ اس کی زندگی ان لوگوں کی زندگی ہے۔ ان کی امانت ہے جس کے دکھ میں وہ دکھی ہوتا ہے اور سکھ میں سکھی ہوتا ہے...... وہ اپنی زندگی کو اس قدر سستا بے مقصد اور حقیر کیوں بنا رہا ہے۔ کیوں رچا رہا ہے اپنے...... اس کھوکھلے اعتراف کا ڈھونگ؟ کیوں...... آخر کیوں!! دلاسہ دیتے ہوئے

جیلر : دیکھئے...... جس نظام کے ہم نوکر ہیں اور ملک کے وفادار اسی ملک کی عدالت نے اسے مجرم قرار دیا ہے اسی ملک کے قانون نے اسے زندہ گولیوں سے بھون ڈالنے کا حکم دیا...... ایک ایسے مجرم کے ساتھ ہماری ہمدردی اور ضرورت سے زیادہ لگاؤ......

جارج : (پوری طرح سے بے بس ولاچار سا جھنجھلاہٹ میں) یہ خلوص — یہ ہمدردی — یہ لگاؤ...... کیا ان پہ کسی کا بس ہے یہ تو خود بخود ہو جاتا ہے جیلر صاحب۔

(جارج کو اس کی کرسی پر بٹھاتے ہوئے)

جیلر : آپ ضرورت سے زیادہ جذباتی ہورہے ہیں مسٹر جارج! ملک کے قانون سے بڑھ کر

ہمارے لئے کچھ بھی نہیں ہونا چاہئے۔قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں...... پھر آپ یہ کیوں بھولتے ہیں۔مقتول بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اگر سولہ نمبر ملک کے غریبوں کے لئے خوشحال اور آسائشوں بھری زندگی کے خواب بنتا تھا تو لالہ گردھاری لال ان خوابوں کو عملی جامہ پہناتے رہے اپنی زندگی داؤ پر لگائے ہوئے تھے۔انہوں نے ہمیشہ لوگوں کی بھلائی کے کاموں کو ہی اپنا مقصد جانا۔ایسے شخص کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ناقابلِ معافی جرم۔

جارج : میں جانتا ہوں آپ کیا فرما رہے ہیں...... لیکن اس کے اس انسان کش عمل کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔سولہ نمبر کو یہ قتل کر کے کیا ملا؟

(اپنی کرسی پر بیٹھ کر)

جیلر : اس قتل کی وجہ اگر مل بھی جائے تو آپ کیا کریں گے؟ سر...... بہت دیر ہو چکی ہے مسٹر جارج...... بہت دیر ہو چکی ہے......

(اپنی بات کو اور زیادہ صاف کرتے ہوئے)

جارج : پھر دوسری بات...... سولہ نمبر نے اپنی صفائی میں کچھ کیوں نہیں کہا۔

جیلر : ایک قاتل اپنی صفائی میں کہہ ہی کیا سکتا ہے؟

(بے رخی سے)

جارج : (برداشت نہ کرتے ہوئے) اس سے کس کو انکار ہے کہ وہ قاتل ہے۔لیکن سولہ نمبر نے اپنے پہلے بیان سے کیوں انکار کیا۔اس نے کیوں کہا تھا کہ اس کے اس ناخوش گوار عمل کی اہمیت کا اندازہ آنے والا مورخ ہی لگا سکتا ہے۔اس نے ملک کو بہت بڑے خطرے سے بچانے کی بات کی تھی۔

جیلر : لاجواب سا ہو کر......

کیا ہمیں ایسی باتیں کرنے کا حق ہے؟ ایک طرح سے ہم اپنی حکومت کے قانون اور اس کے انصاف کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ رہے؟

جارج : میں آپ کا اِشارہ سمجھ گیا...... لیکن اس کا کیا کیا جائے؟ ہم سرکاری ملازم ہونے کے

ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کے بھی غلام ہیں ہم پڑھے لکھے بیدار مغز لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر حادثے پہ اپنی ذاتی رائے قائم کرنے پہ مجبور ہوتے ہیں۔ تحلیل نفسی کا فرض ہر روشن دماغ کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے...... جیلر صاحب! سولہ نمبر پیشہ ور قاتل نہیں ہے۔ اس کی پچھلی ساری زندگی اس کے اس وحشیانہ عمل سے میل نہیں کھاتی ۔ وہ اپنی زندگی اور سماج سے اس قدر مایوس بھی تو نہیں کہ......

جیلر : کیا یہ سب اس کی بے گناہی کی دلیل ہیں۔ نہیں! مسٹر جارج نہیں!

(سوچ کے مختلف دھاروں سے الجھتے ہوئے)

جارج : لیکن اس کے چہرے پہ یہ مکھوٹا کیسا ہے؟ یہ ماسک اس نے کیوں پہن رکھا ہے۔ جس شخص نے اسے پدری شفقت سے نوازا ہو۔ جس کو وہ قابلِ احترام سمجھتا ہو اس کے سینے میں چھرا گھونپنا...... یہ کیونکر ممکن ہے؟ بلا کسی ٹھوس وجہ کے لالہ گردھاری لال کا خون............................

جیلر : تو کیا آپ کو لالہ جی کے کردار پہ شک ہے۔ ان کی غریب پروری انسان دوستی اور ایمانداری پہ شک ہے۔ جارج صاحب! وہ صرف ملک کے بہت بڑے صنعت کار، تاجر اور رئیس ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ بہت بڑے انسان بھی تھے۔

(حقائق سے انحراف نہ کرتے ہوئے چڑھ کر دور جاتے ہوئے)

جارج : ہاں ہاں، وہ ایک فرشتہ سیرت انسان تھے۔ دوسروں کے لئے جینے والا۔ دوسروں کے کام آنے والا۔

(اٹھ کر پیچھا کرتے ہوئے)

جیلر : ملک کے کس شہر میں ان کے مالی امداد سے چل رہے تعلیمی ادارے نہیں ہیں۔ خیراتی اسپتال اور یتیم خانے نہیں۔ کس چیز کی کمی تھی ان کو............ چاہتے تو ملک کی سیاست پر بھی پوری طرح سے اثر انداز ہوتے۔ ہر سیاسی جماعت ان کو بلا مقابلہ منتخب کرنے کو تیار تھی...... لیکن وہ کبھی تیار ہوئے؟ نہیں! کیونکہ انھیں اپنے رتبے اپنی شہرت کا ڈنکا پیٹنے کی بھوک نہیں تھی۔ وہ کبھی ذاتی مفاد کی تو سوچتے بھی نہیں تھے۔

(گھوم کر روبرو ہوکر)

جارج : یہ آپ کس کو بتا رہے ہیں؟ میں جانتا ہوں اور کون نہیں جانتا؟ اس سلسلہ میں تو وہ ایک کھلی کتاب تھے ...... وہ تو بڑی حلیمی اور انکساری سے کہا کرتے تھے کہ یہ سیاست میرا میدان نہیں ہے میں تو ایک بیوپاری آدمی ہوں تجارت میرا پیشہ ہے۔ مجھ سے تو کوئی بھی بیوپار کر لو یہ سیاست میرے بس کی بات نہیں۔

(واپس آتے ہوئے)

جیلر : بہت ممکن ہے آپ صحیح کہتے ہیں یہ تو میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ وہ کسی بہت بڑے راز کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے بلا شبہ یقیناً وہ قاتل ہے مگر میرا دل اسے قاتل ماننے کو تیار نہیں ...... یہ خطوں کے بنڈل دیش کے بیشتر اخباروں میں شائع ہونے والے مضامین۔ اس کے شاندار ماضی قوم پرست ماضی کی داستان ...... کون کہتا ہے کہ آپ اکیلے ہیں۔ لیکن......

(جیلر صاحب کی طرف جاتے ہوئے)

جارج : اس قدر جلد بازی سے اس مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا کہ خواہ مخواہ شک ہونے لگتا ہے۔ ضابطہ بھی تو کوئی شے ہوتی ہے۔

(جارج کو سناتے ہوئے)

جیلر : قانون کو اس قدر سستا مت سمجھو۔

جارج : یہ میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے دل میں ان گنت سوالات جنم لیتے ہیں جن کا جواب مجھے نہیں مل رہا ہے نہ ہی میں جانتا ہوں کیونکہ اس ملک کی عدالت پہ کوئی حرف آتا ہے یا قانون پہ ...... لیکن حساس دل ہونے کے ناطے ایسے سوالوں کے جواب کی مانگ ضرور کرتا ہوں۔ کیا جرم ہے؟

(جارج سے متفق ہوتے ہوئے)

جیلر : میں تو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ آپ اکیلے نہیں ہیں۔ ان خطوں میں بھی ایسے ہی تشنہ سوال اٹھائے گئے ہیں۔ لیکن سوال تو یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مرنے والا صرف ایک

انسان ہی نہیں تھا بلکہ اپنے وطن کے لئے وہ ایک بے حد اہم شخصیت تھا۔ ملک کی ترقی وتوسیع میں اس کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ سماج کی فلاح و بہبود کی خاطر جو کارنامے لالہ جی نے سرانجام دیئے ہیں وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔

(اپنی کرسی پر بیٹھ کر)

جارج : بالکل بجا فرماتے ہیں آپ ... سولہ نمبر بھی تو ملک کا ایک بہت بڑا سماجی اور سیاسی رہنما ہے۔ ایک بہت بڑا قوم پرست ہے جس نے کبھی اپنے ملک کے مفاد سے بڑھ کر کسی چیز کو نہیں جانا۔

جیلر : اس سے تو آپ بھی واقف ہوں گے کہ سیاسی دنیا میں سولہ نمبر کو متعارف کرانے والا یعنی سیاست میں لانے والے لالہ جی ہی تھے۔ اس کا آپ کے اس سولہ نمبر نے اکثر اعتراف بھی کیا ہے۔

جارج : تو پھر ایسا کیوں ہے، کیوں ہے، ایسا کہ کل تک جو قابلِ ستائش واحترام تھا وہ یکا یک دشمن ہو گیا۔ کوئی وجہ تو ہوگی ... جیلر صاحب آخر کچھ تو ہوگا۔ قانون کو اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ان سب نقطوں پر بھی تو غور کرنا چاہیے تھا۔ اس قدر جلد بازی کیوں؟ آخر کیوں؟

جیلر : (بحث کو ایک دم ختم کرتے ہوئے) ہم یہ سب باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ سزا یافتہ مجرم کی پیروی کس سے کر رہے ہیں ... ہم اس وقت سرکاری ڈیوٹی پر ہیں۔ ہمارا فرض.....

جارج : لیکن ایسا کیوں ہے؟ عدالت کی نظروں میں جو گنہگار ہو وہ عوام کی نگاہوں میں بے گناہ کیوں بنے۔ ملک کے سبھی بڑے بڑے اخبارات سماجی وسیاسی اداروں کے کارکن عدالت کے اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔

جیلر : کیا ان لوگوں کے پاس سولہ نمبر کی بے گناہی کو کوئی ثبوت ہے؟

جارج : یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ سولہ نمبر ملک کی بہت بڑی عوامی شخصیت ہے۔ اس کی قوم پرستی انسان دوستی اور نیک نیتی پہ کسی کو شک نہیں ہوسکتا۔

جیلر : یہ سب جذباتی باتیں ہیں جارج صاحب بالکل کورے جذبات۔ ورقانون ثبوت مانگتا ہے۔ اور وہ بھی ٹھوس ثبوت جو ان لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

جارج : نہیں یہ بات نہیں ہے جیلر صاحب سولہ نمبر تو کسی سے لڑنے سے بھی انکار کرتا رہا ہے۔

جیلر : اس لئے نا کہ اس کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا۔

جارج : وہ پکڑا نہیں گیا۔ بلکہ اس نے خود اپنے آپ کو قانون کے حوالے کیا تھا۔

جیلر : اس سے کوئی فرق پڑتا ہے نہیں ...... کچھ بھی ہو ... دیکھئے جارج صاحب میں بھی سولہ نمبر کی شخصیت سے متاثر ہوں اور میرا بھی دل نہیں مانتا ... لیکن اس کا کیا جائے۔ حقائق تو جھٹلائے نہیں جاسکتے۔ پھر.....اگر.....سولہ نمبر غیر ملک کا ہر دل عزیز رہنما ہے۔ ایک قوم پرست لیڈر ہے تو لالہ گردھاری لال بھی ملک کے بہت بڑے صنعت کار تھے ملک کی صنعتی ترقی میں ان کی خدمات کی ان دیکھی نہیں کی جاسکتی میری نظر میں لالہ جی کا قاتل صرف ایک مجرم ہی نہیں بلکہ بہت بڑا غدار بھی ہے۔ اور غدار کی زندگی تو ملک پہ بوجھ ہوتی ہے۔ (برداشت نہ کرتے ہوئے تلملا کر)

جارج : ایسا مت کہو جیلر صاحب یہ خطوں کے بنڈل دیکھ رہے ہیں ان میں کسی نے اسے بیٹا تو کسی نے بھائی بنانے کی پیشکش کی ہے۔ ان میں بہت سے خطوط ایسے بھی ہیں جن میں اس کی جانب سے مقدمہ لڑنے کی پیشکش دی گئی ہے۔ ... وہ لوگ کیس کو سپریم کورٹ تک لڑنے کو تیار ہیں۔

جیلر : کس نے روکا ہے ان کو؟ لڑتے کیوں نہیں اس کیس کو۔

جارج : اس لئے کہ سولہ نمبر کسی سے لڑنا ہی نہیں چاہتا۔

جیلر : کیوں نہیں لڑنا چاہتا؟ کیوں گلے لگا رہا ہے اس بھیانک موت کو

(پرزور الفاظ میں)

وہ قاتل ہے! ملک کی صنعتی ترقی کا بہت بڑا دشمن......

جارج : یہی الزام عدالت نے بھی لگایا ہے..... لیکن جیلر صاحب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ

جیلر : آپ کے اور میرے سوچنے سے کیا ہوگا جارج صاحب؟ کیا عدالت کا فیصلہ بدل دیا جائے گا؟ میرا خیال ہے کہ ہم اپنا اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ [ال چارج بھرا ور لمبی سانس لیتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر۔]

جارج : شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہم اپنا اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سولہ نمبر کی پھیپی تک موت کا بھوت ہمارے دلوں پر سوار ہے۔

(گھبرایا ہوا جلدی سے داخل ہوتے چپراسی۔)

صاحب ... صاحب ...

(رکش کرتے ہوئے)

جیلر : کیا ہے؟ کیا ہوا منگل؟

بوکھلایا سا

چپراسی : صاحب...صاحب سولہ نمبر بہت ادھم مچا رہا ہے۔

جارج : کیا مطلب.....؟

(کھڑے ہوکر)

جیلر : کیا کہہ رہے ہو تم؟ سولہ نمبر

چپراسی : ہاں سر..... کہتا ہے وقت سے پہلے کیوں مار رہے ہو۔

جیلر : کیا مطلب؟ وقت سے پہلے......

چپراسی : صاحب.....میں نے تو بجلی آف کرنے کو کہا.....اور وہ شروع ہو گیا......

جارج : لیکن......

(ڈانٹتے ہوئے)

جیلر : تم نے بجلی آف کرنے کو کیوں کہا.....؟

(غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے)

چپراسی : صاحب: میرا مقدر جو خراب تھا۔ سوچا بیچارے کی آخری رات ہے وہ تو بیداری میں نہ کٹے.....اور کچھ نہیں تو بھر پیٹ سو لے۔

(اٹھتے ہوئے)

جارج :چلو...... میں سمجھاتا ہوں اسے......

جیلر :کیا سمجھائیں گے اسے......

چپراسی :جیلر صاحب...... اب تو وہ......

جارج :ارے ہاں...... میں تو بھول ہی گیا تھا اس نے کافی کے لیے کہا تھا......

جیلر :یہ شاید اس کی آخری خواہش ہوگی۔

چپراسی :وہ صاحب۔ میں بھی تو یہی کہنے آیا تھا......

جیلر :اچھا...... جلدی سے تیار کردو۔

چپراسی : جی...... بہت اچھا...... بہت بڑھیا کافی بناؤں گا صاحب اس کی زندگی کا آخری پیالہ...... گرم گرم کافی...... آپ بھی پئیں گے سر؟

جیلر :ہاں پئیں گے...... ہاں، سب سامان تیار رکھو۔ وقت بہت کم ہوگا...... اس موسم نے بھی تو......

چپراسی :آپ فکر نہ کریں۔

(چپراسی جانے لگتا ہے۔)

جیلر :ویسے باہر موسم کیسا ہے؟

(رک کر)

چپراسی بارش تو نہیں ہو رہی لیکن ہوا بڑے زوروں کی چل رہی ہے...... زمین پتوں سے لدی پڑی ہے۔

(باہر جاتے جاتے آواز لگا کر)

جیلر :اور ہاں بیچ بیچ میں چکر لگاتے رہنا...... کوئی مجرم جاگ تو نہیں رہا...... چپراسی دور سے جاتے جاتے صرف سولہ نمبر...... باقی سب تو گہری نیند سو رہے ہیں

جیلر :اچھا...... تم کافی تیار کردو...... تاکہ چین کی نیند وہ سو سکے۔

(فکر مند سا)

جارج اس بیچارے کو کیا نیند آئے گی...... اکیلے میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آتے ہوں گے

(چوٹ کرتے ہوئے)

جیلر :لالہ جی کا بھوت تو ستاتا ہوگا۔

جارج :موت اور زندگی کے بیچ کے یہ لمحے کس قدر جان لیوا ہوتے ہوں گے...... جب یہ پتہ ہو کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ جائیگا کیسا لگتا ہوگا؟

جیلر :یہ تو سچ ہے۔ میں بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ پھانسی کی سزا پانے والے کو بتایا جائے .... کم سے کم دن اور وقت تو نہیں بتانا چاہیے۔ کب پھانسی کی سزا دی جائے۔ کس وقت دی جائے کس دن دی جائے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اس پوری تفصیل سے......

جارج :لیکن ایسا نہیں ہوسکتا...... تنہائی اور غیر یقینی حالات میں گھر کی تنہائی تو اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہوگی...... ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیال آتے ہوں گے۔

جیلر :سولہ نمبر کی ذہنی حالت تو اس وقت بڑی قابل رحم ہوگی......

جارج :اور ہم کس قدر مجبور ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

جیلر :ٹھیک کہا آپ نے ہم چاہتے ہوئے بھی اس کے آخری وقت میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے......

کچھ سوچتے ہوئے ایک نتیجے پر پہنچ کر

جارج :نہیں ایسی بات تو نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو؟ —— صرف اگر آپ چاہیں تو...... بہت کچھ ہوسکتا ہے۔

کانوں پر یقین نہ کرتے ہوئے

جیلر :کیا مطلب...... کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟

کسی ان ہونی بات کا انکشاف کرتے ہوئے

جارج :کیا ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ سولہ نمبر کو۔ یہاں اپنے پاس بلالیں اس سے باتیں

کریں......

(کانوں پہ یقین نہ کر ذ انت کے لہجے میں)

جیلر : مسٹر جارج ! کیا آپ جانتے ہیں ۔آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ پاگل تو نہیں ہو گئے ۔آپ جانتے ہیں سولہ نمبر کو صبح پھانسی دی جائے گی۔

(سب کچھ بلا کسی پریشانی سے سنتے ہوئے)

جارج : جی ہاں —— جانتا ہوں ۔اور اسے موت کا بے چینی سے انتظار ہے۔

جیلر : تو پھر......اس سے کیا ہوتا ہے؟

جارج : اس کے سر سے تنہائی کا بوجھ اتارنے اس کی موت کو کچھ آرام دہ بنانے کا یہ ایک راستہ ہے۔

جارج کی باتوں کو رد کرتے ہوئے

جیلر : نہیں مسٹر جارج نہیں ! میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔

(اپنی سوچ پر زور دے کر)

جارج : اس میں رسک کی کیا بات ہے... آپ سمجھتے ہیں وہ بھاگ جائے گا۔

کچھ ڈھیلا پڑ ھ کر

جیلر : لیکن ۔ پھر بھی۔

جارج : پھر وہ زنجیروں میں بند... پھر سوائے ہمارے یہاں کون ہے؟ پلیز ۔جیلر صاحب میں نہیں سمجھتا کہ سولہ نمبر بھاگنے کی کوشش کرے گا

جیلر : آپ اس قدر بضد کیوں ہیں لیکن......

جارج : کیا ہم اس کی موت کو پر سکون اور آرام دہ نہیں بنا سکتے ؟ کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے ؟

جیلر : خیر ۔ جیسا آپ کہو......ایسا شاید ملک کی کسی بھی جیل میں نہیں ہوا ہوگا۔ گھنٹی بجاتے ہوئے

منگل......

جارج : ہمارے اس عمل سے ہمارے دلوں کو کس قدر روحانی سکون اور خوشی ملے گی ۔اتنے

میں منگل آتا ہے

جیلر :کافی تیار ہوگئی؟

چپراسی :جی۔ پانی رکھا ہوا ہے۔

جھجک پر قابو پاتے ہوئے

چپراسی :اچھا۔؟ ایسا کرو دو سپاہیوں کو ساتھ لے جاکر قیدی نمبر 16 کو یہاں لے آؤ۔ یقین نہ کرتے ہوئے

چپراسی :یہاں۔۔۔؟

چڑ کر

جیلر :ہاں، ہاں، یہاں۔۔۔ سنا نہیں.....

منگل جیلر صاحب کو دیکھ کر حیران سا چلا جاتا ہے۔ جیلر پریشان سا۔

ہم اسے بلا تو رہے ہیں..... مگر نہ جانے کیوں؟

جارج :آپ گھبرایئے نہیں جیلر صاحب..... ہم یہ سب..... ہمارا یہ قدم کسی کی بھلائی کے لئے ..... انسانیت کے ناطے ہم مرنے والے کو بس کچھ ذہنی سکون پہنچانے کی خاطر ہی تو کر رہے ہیں۔ ہماری نیت میں کسی بھی طرح کا خلل نہیں ہے۔ مقدس باپ نیک نیتی سے خوش ہوتا ہے۔

جیلر :کیا معلوم..... آزادی کا ہلکا سا شائبہ بھی کسی طرح کا خلل اس کے دماغ میں پیدا کردے۔ اسے باغی بنادے.....

جیلر کی سوچ کو رد کرتے ہوئے

جارج :نہیں جیلر صاحب نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ بلکہ بہت ممکن ہے باتوں باتوں میں اس کے چہرے سے ماسک اتر جائے۔

جیلر :وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

جارج :فرق پڑے گا۔ کیوں نہیں پڑے گا، وہ روحانی طور پر سبکسار یعنی ہلکا پن محسوس کرنے لگے۔

اسی میں فون کی گھنٹی سنجیدگی کے ماحول میں بدلاؤ ڈالتی ہے۔

گھبراہٹ کے لہجے میں

جیلر :اس وقت یہ فون کہاں سے آ گیا۔

اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے

جیلر :(فون اٹھاتا ہے) فون میں شور کی وجہ سے چیخ کر۔

جارج :یہی تو میں بھی سوچ رہا تھا......

جیلر :ہیلو......!......ذرا اونچا بولیے...... جی، جی......ہاں ہاں میں یہاں کا جیلر بول رہا ہوں......جی؟ ڈی آئی جی صاحب......!......سر لائین کلیر نہیں ہے۔ سر ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہا......جی......جی......کیا——؟ ایک لڑکی......ہاں ہاں......کیا وہ لڑکی یہاں آ رہی ہے؟......جی......یہاں بہت زوروں کی آندھی چل رہی ہے......لیکن سر......وہ لڑکی چل پڑی......؟ جی سر......یس سر......آپ بجا فرماتے ہیں۔ جیسا آپ کا حکم......جی سر......یس سر......آپ بجا فرماتے ہیں۔ جیسا آپ کا حکم......جی......جی......جیسا آپ کا حکم۔

جیلر صاحب اور زیادہ پریشان ہو کر فون رکھتے ہیں۔

جارج :ٹرنک کال تھا کیا——؟

پریشان سا

جیلر :جی......ہمارے ڈی آئی جی کا......وہ ایک لڑکی کو بھیج رہے ہیں......ان کا کہنا ہے کہ قیدی نمبر 16 اس لڑکی کا اکلوتا بھائی ہے......ٹولیٹ......پانی سر سے اوپر گزر چکا ہے۔

شک کی دھند میں گھرا۔

جارج :ویری سٹرینج—— کل تک اس کا کوئی نہیں تھا جو تھا اسے وہ مل کر جا چکا تھا۔ اور آج......یہ اس کی سگی بہن......کیا یہ لڑکی اس کی کسی بات پر کوئی روشنی ڈال سکتی ہے۔ کوئی سراغ تو ملے گا۔

افسرانہ بے رخی سے

جیلر : کیا سراغ ملے گا؟ اب! ... کہ وہ فلاں بہن کا بھائی اور فلاں باپ کا بیٹا۔ بس! اس میں بائیں جانب سے دو ہتھیار بند سپاہی لمبے قد بھرے جسم کے دلکش شکل وصورت کے آدمی کو لئے داخل ہوتے ہیں۔ اس کے داخل ہوتے ہی کھڑکی کے پٹ دھکے سے کھل جاتے ہیں۔ ہوا کے زوردار جھکڑے سے کمرے میں افراتفری مچ جاتی ہے جس کا اثر جیلر اور جارج پر بھی ہوتا ہے کاغذات اور فائلیں کمرے میں بکھر جاتی ہیں۔ جیلر خبردار کرتے ہوئے۔

ایک سپاہی کھڑکی بند کرتا ہے۔ دوسرا بکھرے کاغذ اکٹھے کر میز پر قرینے سے رکھتا ہے۔

جیلر : جلدی سے کھڑکی بند کرو... اوہو یہ آندھی ... کھڑکی بند کرو... ٹھیک ہے...... ان کاغذوں کو بھی اٹھالو۔

جارج : آیئے بیٹھے......

حالات کی سنجیدگی کو ہلکا پھلکا کرتے ہوئے۔

کشور : آندھیاں چلتی ہیں طوفان آتے ہیں جب حضرت جوش آتے ہیں۔ شکریہ۔ مجھے آپ نے کس لئے یہاں بلایا ہے؟

جارج : بس۔ ازراہِ مذاق... آرام سے بیٹھے

کشور : میرے آنے پہ اسقدر ہنگامہ

جیلر : نہیں وہ کیا کریں کھڑکی کی چٹخنی خراب ہوگئی ہے۔ کئی بار کہہ چکا ہوں مرمت کے لئے۔ آپ تو جانتے ہیں سرکاری کام......

شہ ملنے پر ازراہ مذاق

کشور : ہوں......تو کیا جیل کی کھڑکیوں کی چٹخنیاں ہوم منسٹر صاحب ٹھیک کرائیں گے۔

(کشور کے مزاج سے لطف اندوز ہوتے ہوئے)

جیلر : ٹھیک کہا آپ نے۔

کشور : نہیں نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا......

ہلکی سنجیدگی بھرے لہجے میں

جیلر : ہم تمہارے اور قانون کی بہتری کے لئے......

کشور : کیا میں ایک کولڈ ڈرنک کی فرمائش کر سکتا ہوں کولڈ ڈرنک۔

جارج : لیکن آپ نے تو کافی کے لئے کہا تھا نا؟ گرم گرم کافی۔

کشور : جی ہاں —— میں دونوں مزے ایک ساتھ لینا چاہتا ہوں۔

جیلر : اس طرح تو سرد گرم ہو جانے کا ڈر ہے۔

مزاحیہ انداز میں

کشور : کیا یہ موت سے بڑی کوئی بیماری ہے۔

جیلر اور جارج اپنی کھسیانی صورت چھپاتے ہوئے اپنی بات کہنے کی کوشش میں

جارج : ہوسکتا ہے آپ کو عجیب سا لگے۔ لیکن ہم جاننا چاہتے ہیں کہ آخر آپ نے یہ قتل کیوں کیا؟

لاتعلقی سے بات کو ٹالتے ہوئے

کشور : قتل ہو گیا ...ایک جان چلی گئی......دوسری جان سورج کی پہلی کرن کے ساتھ چلی جائے گی .....اس کیوں کا جواب اگر مل بھی جائے تو کیا حاصل.....؟

جیلر : اپنی بے گناہی کو چھپانا بھی اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا گناہ کرنا قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنا سب سے بڑا اخلاقی جرم ہے مسٹر کشور!!

(کشور پر زور ڈالتے ہوئے پر زور الفاظ میں)

جارج : آپ پڑھے لکھے روشن دماغ اور ماہر سیاست دان ہیں۔

جیلر : آپ لوگ تو قانون بناتے ہیں اپنی دانست میں بہتر نظام زندگی کی تشکیل کرتے ہیں ......کیا آپ سمجھتے ہیں کہ......

جارج : ہوسکتا ہے صحیح حالات ہی ایسے ہوں جن سے مجبور ہو کر آپ کو یہ جرم کرنا پڑا ہو......اگر آپ عدالت کو ٹھیک ٹھیک حالات سے آگاہ کر دیتے تو ہوسکتا ہے آپ کی سزا پھانسی سے عمر قید ہو جاتی۔

(کشور کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن پھر نہ جانے کیوں)

جیلر : آپ لوگوں کے ہر دل عزیز اور رہنما ہیں۔لوگوں کے دلوں میں آپ کی جو تصویر ہے ...... کیا آپ نہیں سمجھتے کہ آپ کی زندگی پہ آپ سے زیادہ آپ کے پرستاروں کا حق ہے۔ فلسفیانہ انداز میں کسی منبر پر بیٹھا ہو جیسے

کشور : وقت جس تیز رفتاری سے بھاگ رہا ہے میری زندگی کے لمحے بھی اسی تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ وقت کا خونخوار درندہ میری زندگی کو دبوچے ہوئے ہے۔اس کی خوراک ہی میری زندگی کی بچی کھچی سانسیں ہیں اس عمل کو اب کوئی نہیں روک سکتا...... میرے ہاتھ میں چھرا تھا جس سے گردھاری لال کا خون ہوا چھرا گردھاری لال کے خون سے ہی رنگا ہوا تھا۔اور میں موقعہ واردات پہ پکڑا گیا...... کیا اس سے بڑا اور ٹھوس ثبوت کوئی اور ہو سکتا ہے۔

جیلر : لیکن وہ حالات جن حالات کی گرفت میں آپ جکڑے ہوئے تھے یا کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے۔

جارج : آپ کی بے گناہی کا سب سے بڑا ثبوت آپ کی مسلسل خاموشی ہے۔نہ تو آپ نے اپنے مقدمے کے لئے کوئی وکیل کھڑا ہونے دیا اور نہ ہی خود کسی طرح کی دلائل پیش کیں۔

کشور : کس بات کی دلائل ...... کس بات کے لئے وکیل کھڑا کرتا کس بات کی پیروی کرتا۔ اگر میں نے جرم نہ کیا ہوتا۔اور مجھ پر جرم عائد کیا جاتا تو میں ضرور وکیل کرتا۔لیکن جب میں نے جرم کیا ہے۔میں اس جرم کا اقبال بھی کر رہا ہوں۔تو وکیل کس لئے...... کیا کرے گا وہ...... چوٹ کرتے ہوئے سوالیہ لہجے میں

جیلر : اور آپ کا وہ پہلا بیان ——؟اس سے آپ کس لئے منحرف ہو رہے ہیں؟ لالہ گردھاری لال کو قتل کر کے ملک کے کون سے ناموس کو ڈوبنے سے بچالیا ہے آپ نے؟

جارج : وطن کا ایک بہت بڑا صنعت کار جس کی خدمات ملک کی ترقی میں گنوائی نہیں جاسکتیں

جوایک سچے انسان دوست اورغریب پرور تھے۔ایسے شخص کاقتل تو غداری ہے غدّاری!!
(وارکواورزیادہ تیز کرتے ہوئے کشور کے ذہن پہ اس لہجے کا تاثر چہرے پہ نمایاں ہونے لگتا ہے اس پہ قابو پانے کی کوشش میں تلملاہٹ سے الجھتا ہے۔)

جیلر :آخرآپ یہ جان لیوا خاموشی کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں؟بس خاموشی سے سنتے رہنا خود پہ الزاموں کی داستان......

جارج :آپ جانتے ہیں؟آپ کی خاموشی نے لوگوں کے دلوں میں شک کی دھند پیدا کردی ہے۔
(اپنی تلملاہٹ سے الجھتے ہوئے درد پر قابو پاتے ہوئے)

کشور :آپ ا......آپ کسی......آپ کسی دوسرے موضوع پر بات نہیں کرسکتے؟

جارج :زندگی جیسی انمول شے اتنے سستے داموں لوٹا دی۔

اپنی بے بسی سے الجھتے ہوئے

کشور :اسکے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔

جیلر :کر کیوں نہیں سکتے تھے؟آپ اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ سکتے تھے۔
(زہرقند ہنسی کے ساتھ)

کشور :صفائی؟کس بات کی صفائی؟کس صفائی سے میں نے چھرا سینے کے پار اتار؟
(آخر میں جذبات کی گرفت سے نجات پاتے ہوئے ٹالتے ہوئے)

جارج :ہماری بات کو اس طرح ٹالئے مت۔

جیلر :ہم اکیلے نہیں ہیں!

جیلر :کیوں۔؟آخر کیوں......؟......کوئی وجہ تو ہوگی
زوردار لہجے میں جھنجھوڑتے ہوئے۔

جارج :ہرعمل کسی عمل کا ردِّعمل ہوتا ہے یہ تو آپ بھی مانتے ہیں۔
(خودکو پوری طرح سے لاتعلق کرتے ہوئے پرزور الفاظ میں)

کشور :کیا ہر بات کی وجہ ہوتی ہے......؟
اعتماد واعتقاد سے

جیلر : ہاں یہ قانون قدرت ہے ہر عمل کسی عمل کا رد عمل ہوتا ہے...... پھر لالہ جی تو آپ کے ایک باپ کا درجہ رکھتے تھے۔

کشور : ہاں، بلکہ اس سے بھی زیادہ انکی مہربانیاں انکی نوازش میں کیوں کر بھلا سکتا ہوں ان کی شفقت کی بدولت ہی تو میں اپنی زندگی کا یہ سفر طے کر پایا ہوں۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی مجھے وہ اکلوتا بیٹا کہا کرتے تھے۔ گو ہم میں اختلاف بھی تھے جو ہر دو سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں میں لازمی ہے۔ لیکن ہم نے کبھی اپنے اپنے اصولوں کا سودا نہیں ہونے دیا وہ اکثر مجھے بگڑا نواب بھی کہا کرتے تھے۔

باپ کا قتل ......؟ ......کوئی تو وجہ ہوگی۔

جارج : اور وجہ بھی ٹھوس ہونی چاہیئے

جیلر : اصولوں کا ٹکراؤ......اختلاف کی تلخی......؟

سنبھل کر

کشور : کیا کریں گے آپ جان کر؟...... پھر میرے بتا دینے سے کیا ہوگا؟ میں ایسا تو نہیں کہتا کہ قانون کی تفسیر......قانونی مدعوں کی تشریح پر احباب مکمل طور پر حاوی ہوتے ہیں لیکن انکی انٹرپریٹیشن (تفسیر) پہ حکومت کے افسران اثر انداز ہوتے ہیں...... یہ ایک طرح سے فطری عمل ہے

قدریں تو بدلتی ہیں۔ سیاہ و سفید ......ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جسے گئے وقتوں کے لوگ سفید کہتے آرہے ہوں اسکو زمانہ حال کی نسل بھی سفید ہی بتائے۔ رنگ تو رنگ ہے نہ بدلے......فرد فرد کی نگاہ ہے نگاہ تو بدلتی ہی ہے......

جارج : کیا یہ ان کی زندگی کا المیہ نہیں؟

کشور : کچھ اٹل نہیں ...... یہاں تک کہ حقیقت کی مختلف تفسیروں کے آئینے میں لباس بدلتی ہے حقیقت۔

جارج کچھ کہنا چاہتا ہے کشور داخل اندازی کرتے ہوئے

(تلخ حقائق کا انکشاف کشور کا ذہن وروحانی طور پر پریشان کرتا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے

پہلو بدلتا ہے اٹھتے اٹھتے بیٹھ جاتا ہے آخر کار کھڑا بھی ہو جاتا ہے۔)

کشور : طرز بیاں بڑی ظالم چیز ہوتی ہے جارج صاحب جیلر صاحب! یہ طرز بیان تو ایک جادو ہے۔بس سر چڑھ کر بولتا ہے۔اور یہ طرز بیان ہر شخص کی اپنی دولت ہوتا ہے جارج صاحب ...... معافی۔دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والے دلکش الفاظ پر اثر دلائل کا رنگین جال۔بس! سچ وہی ہوتا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔جو فرمایا جا رہا ہوتا ہے۔ زبان سے نکلا ہر لفظ اٹل سچائی۔باقی سب دروغ بیانی، بیان کی دلکشی تو لفظوں کے معنی بدل دیتی ہے۔

جیلر : آپ ... آپ اگر چاہو تو ...

کشور : میری جھولی ان اوصاف سے بالکل خالی ہے طرز بیان کا جادو میرے پاس نہیں۔ دلیلوں کے گلدستے میری زندگی کے ریگ زار میں کہاں ... پھر میں تو اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں سمجھتا ..... میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے ملک کا نقصان نہ ہو۔میرا وطن کمزور نہ ہو۔بس اب ایسا نہ ہوگا۔فی الحال تو یہ خطرہ ٹل گیا۔

جارج : یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں وہ کونسا خطرہ تھا ... کیا وہ گردھاری لال بھی ایسا کام کر سکتے ہیں۔

کشور : کیا اس کی تشہیر ضروری ہے..... ایک مقصد۔

جارج : کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کا اندازہ۔آپ کی سوجھ بوجھ آپ کی سوچ غلط ہو۔

جیلر : آپ کسی غلط فہمی کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔

جارج : اگر لالہ جی غلطی کر سکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں آپ بھی انسان ہیں

کشور : اگر ایسا ہی ہے تو میں اپنی اس غلطی کی قیمت اپنی زندگی دے کر چکا رہا ہوں۔

جارج : کیا یہ ضروری نہیں کہ عوام جن کی فلاح کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ان لوگوں کو سچائی کا پتہ چلے......

جیلر : یہ معلوم ہو کہ کون ان سے فریب کر رہا ہے اور کون اپنی زندگی کی بازی لگا رہا ہے۔

کشور : بہت ممکن ہے کہ میں اپنی صفائی یا نیک نیتی کا یقین دلانے سے قاصر ہوں میرے

پاس گواہ نہیں ہیں۔

جیلر : ملک کے بیشتر اخباروں اور بہت سی سیاسی رہنماؤں نے قانون کے اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔

کشور : کیا ان کے پاس کوئی ثبوت ہے؟ ان لوگوں کو تو سنسنی کی وبا پھیلانے میں لطف ملتا ہے۔ عوام کو جذبات کے ریلے میں بہالے جانا اور پھر ان کے جذبات سے کھینا۔

جیلر : اگر آپ کے والدین یا والی وارث کا پتہ چل جائے تو......

کشور : میں نے کہا نا! میں ایک یتیم خانے سے لاکر اپنایا گیا ہوں۔ پھر اس کی کوئی خاص ضرورت بھی تو نہیں...... گناہ میں نے کیا ہے سزا مجھے مل چکی ہے۔ دوسروں کا رشتہ اس سے کیا...

جیلر : لیکن موت کے بعد آپ کی باڈی...

کشور : لاش کا والی وارث کوئی نہیں ہوتا جیلر صاحب! ماں باپ بھی نہیں! دوسرے اسے آگ یا خاک کے سپرد کر دیتے ہیں۔ لاش سنبھال کر رکھنے کی چیز نہیں ہے جیلر صاحب!

جیلر : مسٹر کشور! قانون، قانون کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بے گناہ کا تحفظ بھی ہو سکے ڈیفنس ہو سکے۔

قانون کی بے بسی و نااہلیت پر رحم کھاتے ہوئے

کشور : قانون ——؟ جو اندھا ہے جس کے نہ تو اپنے ہاتھ پیر ہوتے ہیں اور نہ ہی آنکھیں۔ جو لوگوں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور وکیلوں کے کانوں سے سنتا ہے۔ گواہ——! جو کسی بھی قیمت پر خریدے جا سکتے ہیں...... پھر میں تو خود مان رہا ہوں کہ میں نے خون کیا ہے۔ ایک بہت بڑی ہستی کا خون...... اور آپ کی عدالتوں میں خون کا بدلہ خون ہے...... پھر یہ پوچھ گچھ کیوں؟ قتل کا تجزیہ چہ معنی؟

جارج : کیا آپ کو موت سے ڈر نہیں لگتا؟

کشور : ڈر؟ میرے لئے زندگی جتنی حسین تھی موت بھی اتنی ہی خوبصورت ہوگی میرے بہی خواہ!

جارج :یہ تو سراسر خودکشی ہے۔

کشور :خودکشی کیا ہے جارج صاحب؟ کیا یہ کوئی موت سے الگ چیز ہے؟ نہیں۔ موت کا ہی دوسرا نام ہے خودکشی۔ انسان چاہے جان بوجھ کر یہ مار دیا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جیلر :عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ ادھر سورج نکلے گا.... ادھر آپ....

کشور :وہ میری نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ جیلر صاحب۔

جارج :جو اس زندگی سے دفا نہیں کر سکا.... وہ نئی زندگی کی آرزو کیوں کرتا ہے؟

جیلر :کیسی دشمنی تھی آپ کو؟ وہ تو بڑے ہی رحم دل اور غریب پرور انسان تھے۔

جارج :تم نے ایک ایسی ہستی کا خون کیا ہے جو انسانی برادری کا بہت بڑا خیر خواہ ہونے کے ساتھ وطن کی صنعتی ترقی کا بھی بہت بڑا استون تھا۔

جیلر :ایسی شخصیت کی کمی کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔

کشور :ٹھیک ہے۔ میں نے قتل کیا ہے.... میں وطن کا دشمن ہوں اس کی سزا بھی مجھے مل رہی ہے......

ہاں، میں نے ایک کولڈ ڈرنک اور گرم گرم کافی کے لئے کہا تھا....

گھنٹی بجاتے ہوئے

جیلر :منگل......!

اسی میں پھرتی سے منگل آتا ہے۔

چپراسی :تیار ہے صاحب لے آؤں؟

جیلر :ہاں جلدی لاؤ

منگل چلا جاتا ہے کشور بے چینی سے ٹہلتا ہے منگل ٹرے میں کافی اور کولڈ ڈرنک لے کر آتا ہے۔

کشور :ہاں آپ لوگ شوق فرمائیں گے؟

جارج :نہیں نہیں شکریہ۔

کافی کے گھونٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے

کشور : گرم زندگی کی مانند اور میٹھی بھی۔

(بوتل سے ایک گھونٹ بھر اسی طرح لطف لیتے ہوئے لمبا سانس لیتے ہوئے)

یہ بھی ٹھنڈا موت کی مانند ہے۔لیکن میٹھا بھی یہ۔زندگی !اور موت کے درمیان کے وقفے بھی کیا چیز ہوتے ہیں چلتی ہوئی زندگی کی سانس اور موت کے تصور کی مانند بھیانک خیال موت کا ہاتھ پکڑے میری طرف اور بھی تیز ہو جاتا ہے۔

کشور پوری بوتل حلق میں انڈیل لیتا ہے اور پھر ساری کافی حلق میں گرا دیتا ہے۔

موت کے بعد زندگی......

جیلر :سگریٹ شوق فرمائیں گے آپ؟

کشور :جی۔بہت شکریہ!......آپ لوگ مجھ پہ اس قدر مہربان کیوں ہیں؟

جارج :مسٹر کشور کیا ایسا ممکن نہیں......کہ آپ اپنے فیصلے پہ پھر سے غور فرمائیں؟

کشور :مجھے اب کچھ نہیں سوچنا جارج صاحب!

جارج :کیا آپ اپنے پرستاروں کے خطوں کا جواب نہیں دیں گے؟

جیلر :آپ کون ہیں؟ آپ کا اصلی نام کیا ہے؟

کشور :میرے نام کو تو پھانسی نہیں دی جا رہی ہے؟

جارج :مسٹر کشور! میں آپ کی غیر معمولی قابلیت کی داد دیتا ہوں۔کس خوبی سے اپنے وجود پہ ہی نہیں بلکہ روح پہ بھی ماسک لگا رکھا ہے آپ نے۔

کشور :آپ مجھے کسی بھی نام سے بلا سکتے ہیں۔

چٹکی لیتے ہوئے

جیلر :غدار کے نام سے بھی؟

غصے سے بے قابو ہو کر

کشور :غدار ــــ؟!!نہیں......غدار؟

ہاں جارج صاحب غدار کے نام سے بھی......جس کو وطن پرستی وطن کی خدمت کے

لئے ملک کے بڑے سے بڑے اعزاز سے نوازا گیا اسے آپ غدار بھی کہہ سکتے ہیں۔
غدار وطن کا دشمن ... جس کو ماں کی لوریوں میں دیش بھگتی کا سبق ملا باپ ملک کی آزادی....

(جیسے کچھ ہاتھ لگ گیا ہو)

جارج :ہاں ہاں آپ کے والد....

فوراً سنبھل کر خود پہ قابو پاتے ہوئے

کشور :کچھ نہیں جارج صاحب کہانیاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں ...

جارج :انہی کہانیوں میں تمہاری اصلیت پوشیدہ ہو سکتی ہے۔

مایوس ہو کر بہت سختی سے

جیلر :آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں جارج صاحب

جارج :جانتا ہوں —— جانتا ہوں جیلر صاحب۔ لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی کیوں یہی سوچ رہ رہ کے ستائے جا رہی ہے اگر یہ اپنی روح پہ اپنے سینے میں دبے راز کے ساتھ اس دنیا سے چلا گیا تو میں سنگسار کر دیا جاؤنگا۔

کشور :بہت بہت شکریہ جارج صاحب۔

جارج :یہ آپ کس کی صلیب اپنے کندھوں پہ اٹھائے ہوئے ہیں۔

کشور :ایک مجرم کے ساتھ اس قدر لگاؤ؟

جارج :نہیں مسٹر کشور نہیں۔ میری ہمدردی ایک معصوم انسان کے ساتھ ہے..... میں نہیں جانتا کہ تم صحیح کر رہے ہو یا غلط موت کے بارے میں تمہارا نظریہ..... اپنی زندگی کے سلسلے میں مکمل لاتعلقی اور خاموشی .... کیا تم اس طرح حساس دل خدا پرست انسان کی ہمدردیاں بٹور کر اپنے گناہوں کو اپنی ابدی خاموشی کے کفن میں دفن کر دینا چاہتے ہو؟

کسی بھی طرح کے تاثر سے دور

کشور :آپ کچھ بھی سمجھ لیں

جارج :کیا تمہیں اپنے کیئے پہ کسی طرح کی ندامت نہیں؟.....تم کسی طرح کا پچھتاوا بھی نہیں

کرنا چاہتے۔

کشور : یہ الفاظ میں اکثر سنتا رہا ہوں ..... پچھتاوا..... اعتراف گناہ یہ ایک ابدی اور گہری کھائی ہے اور میں اس غار میں بالکل نہیں کودونگا..... جو آدمی مرنے کے قابل ہو اس کا زندہ رہنا بھی گناہ ہے اسے ختم کرنا میرا فرض تھا اور میں نے وہ فرض ہی پورا کیا ہے۔

جیلر : یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

کشور : اگر ایک قوم پرست عوام کا بھلا چاہنے والا آدمی غدار ہوسکتا ہے تو ایک نیک دل غریب پرور انسان دوست غدار کیوں نہیں ہوسکتا۔ میں پوچھتا ہوں کیوں نہیں ہوسکتا؟..... میں نے عمر بھر کسی کو بے خیالی میں بھی تکلیف نہیں پہنچائی..... لیکن جب مجھے اس ذلیل اور خطرناک وطن دشمن حرکت کا پتہ چلا تو میں انسان کشی پر بھی آمادہ ہوگیا۔

جیلر : یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں۔ یہ ذلیل اور خطرناک ملک فروشی کی حرکت کیا ہے؟ ملک پہ آنے والا خطرہ کیا ہے جسے روکنے کے لئے آپ نے لالہ گردھاری لال کا خون کیا؟!

مسٹر : اگر میں آپ سے کہوں کہ ملاح نے بلا کے طوفان میں ایک ناخدا نے خود ہی اپنی کشتی کو طوفانی لہروں سے بچانے کی بجائے خونی تھپیڑوں کے حوالے کردیا..... کشتی میں سوراخ کردیئے۔

جارج : لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ناخدا تو کشتی کا محافظ ہوتا ہے۔ کبھی میر کارواں بھی کارواں کو لوٹتا ہے؟

کشور : میں اسی لئے تو کہتا ہوں کہ خاموشی ہی سب سے بہتر ہے میرے کیس کا فیصلہ یہاں نہیں ہوسکتا جیلر صاحب۔ میرے پاس وہ دلائل نہیں ہیں جو قانون کی تسلی کرسکیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کی قیمت ادا کرنے جارہا ہوں کیونکہ یہاں کا یہی دستور ہے۔

جیلر : مسٹر کشور.....

میری شکایت اس قانون سے نہیں ہے یہ تو خود اندھا ہے بہرہ ہے گونگا ہے۔ جسے سننے اور بولنے کے لئے گواہوں کی گواہی اور وکیلوں کی دلیلیں چاہئیں۔ یہ سہارے ہی اس کا

وجود ہیں جیلر صاحب۔

جارج :مسٹر کشور!

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی خدا نام کی طاقت ہے اور میرے اعمال کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے تو مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ وہاں دوسرا آدمی بھی تو ہوگا۔ وہاں فیصلہ سنانے والے کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں ۔اس نے بھی تو سب کچھ دیکھا ہوگا...... میں صحیح کہہ رہا ہوں نا جارج صاحب کیا میں اس منزل تک پہنچنے کے لئے یہاں نہیں لایا گیا؟

اسی میں چپراسی داخل ہوکر

چپراسی :ایک میم صاحب آئی ہیں۔ یہ کارڈ دیا ہے۔

جیلر :ہوں......کیا کملا جی وہاں ہیں؟

چپراسی :جی صاحب

جیلر :ان سے کہو ان کی جامہ تلاشی لے لیں بس پھر میرے ساتھ والے کمرے میں بٹھاؤ۔ میں آواز دونگا۔

چپراسی :جی صاحب! بہت اچھا۔

منگل واپس چلا جاتا ہے

جیلر :مسٹر کشور! ابھی کوئی لڑکی تم سے ملنے آئی ہے۔

کشور پریشان ہوا اٹھتا ہے

کشور :اچھا——؟

جیلر :کیا تم اس سے ملنا چاہو گے؟

کشور :کوئی خاص ضرورت نہیں......وہ کیا چاہتی ہے۔

جیلر :اسے یقین ہے کہ تم اس کے بھائی ہو۔

کشور :وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہوگی۔ میری کوئی بہن نہیں

جیلر :وہ بہت دور سے آئی ہے ڈی آئی جی صاحب نے......

کشور : وہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہے

زور دیتے ہوئے

جیلر : ایسا میں ہی اس سے کہہ دوں یا تم خود اس سے کہنا چاہو گے؟

کشور : نہیں آپ ہی سمجھا دیں۔ کیا میں اپنی کوٹھری میں

جیلر : جیسا تم چاہو۔

اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگتا ہے کچھ سوچ کر رک کر۔

کشور : یہ لڑکی کون ہے؟ کیا چاہتی ہے مجھ سے مل کر۔

جیلر : ہوم منسٹری کی سپیشل پرمیشن سے وہ یہاں آئی ہے۔

کشور : اچھا—؟ پچھلے پانچ سالوں سے تو کسی کو خیال نہیں آیا... مگر..... آج

جارج : اگر چاہو تو کچھ دیر کے لئے تم اس سے مل سکتے ہو

لڑکی سے ہمدردی جتاتے ہوئے

کشور : میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں جیلر صاحب کیا یہاں..... ؟

جیلر : کیوں نہیں؟

کشور : تنہائی میں؟ کیا آپ لوگوں کو ڈر نہیں لگتا..... نہیں نہیں، میں آپ کی مہربانیوں کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔

جیلر : کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

کشور : ہاں—ہو سکتا ہے اس لڑکی کو مجھ سے ہمدردی ہے اور وہ مجھے اس بھیانک موت سے بچانا چاہتی ہو۔ اس کے پاس کسی قسم کا زہر بھی تو ہو سکتا ہے۔

جارج : کشور صاحب! یہ آپ کی ایمانداری اور نیک نیتی اور صاف گوئی ہی ہے جس نے ہر شخص کو موہ لیا ہے۔

کشور : شکریہ

جیلر : تم اس لڑکی سے یہاں اورا کیلے میں ملو گے۔

کشور : آپ کی مہربانی......

جیلر : ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ یہ صرف تمہاری مقدس شخصیت کا احترام ہے۔ چلیئے مسٹر جارج ..... منگل۔! کشور صاحب کو یہیں سے لے جائیں گے... تم ساتھ والے کمرے میں ٹھہرو۔۔۔ اور اس لڑکی کو یہاں بھیج دو... چلیئے جارج صاحب۔ سب چلے جاتے ہیں کمرے میں صرف کشور رہ جاتا ہے بالکل سناٹا ہلکی سی موسیقی۔ کشور کے قدموں کی آہٹ کشور کھڑکی کے پاس رک جاتا ہے اسی میں لڑکی داخل ہوتی ہے۔

لڑکی : ماتا جی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

سوالیہ انداز سے

کشور : جی۔؟

لڑکی : ہم نے ایک لمبے عرصے سے نہ اپنے کمار کو دیکھا ہے اور نہ ہم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ جب سے ماتا جی نے اس اخبار میں آپ کی تصویر دیکھی ہے تب سے وہ یہ رٹ لگا رہی ہیں۔

کشور : کہ بس یہ ان کا کمار ہو سکتا ہے۔

لڑکی : جی۔ بالکل وہ تو کہتی ہیں یہ ہی ہے ان کا کمار

کشور : لیکن آپ تو یہ دیکھ ہی رہی ہیں کہ میں آپ کا بھیا کمار نہیں ہوں

لڑکی : میں بھی تو یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی ... لیکن آپ کی شکل ہمارے کمار بھائی سے ملتی ضرور ہے وہ اور بات ہے..... میں نے اپنے کمار بھائی کے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

کشور : ٹھیک تو یہ ہے کہ میں آپ کا بھائی نہیں ہوں کسی اور کا بھی نہیں کیونکہ میری کوئی بہن نہیں ہے۔

لڑکی : آپ سچ کہہ رہے ہیں؟

کشور : ہاں۔ بالکل سچ

لڑکی : آپ کا اصلی نام کمار نہیں؟

کشور : نہیں۔۔ میرا نام کشور ہی ہے۔

لڑکی : آپ کو یقین ہے کہ آپ کا یہی نام ہے؟

کشور : بالکل۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں آخری وقت میں جھوٹ بولونگا؟ پھر کیا آپ اپنے بھائی کو بھی نہیں پہچانتیں۔

لڑکی : میری مجبوری جب بھیا گھر سے بھاگے تب میں بہت چھوٹی تھی۔ کوئی پانچ چھ سال کی۔

اپنے جذبات پہ قابو پاتے ہوئے۔

کشور : اچھا—؟ تو پھر آپ کی ماتاجی کو آنا چاہیے تھا۔

لڑکی : آنا تو ان کو ہی تھا لیکن وہ بہت بیمار ہیں۔

افسوس کا اظہار کرتے ہوئے

کشور : اچھا—؟

لڑکی : رات کو سونے سے پہلے میں اکثر ضد کیا کرتی تھی اور آپ مجھے ایک نظم ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ آپ کی آواز میں کتنی مٹھاس تھی

کشور : اچھا آپ کو یاد ہے؟

لڑکی : آپ کی کہانیاں تو اکثر ماتاجی یاد کرتی رہتی ہیں۔

کشور : میں نے کہا نا— آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ میں شاعری میں کسی بھی طرح کی دلچسپی نہیں رکھتا۔

لڑکی : آپ کو یاد ہوگا۔

غصے سے چڑھ کر

کشور : دیکھئے کیا نام ہے آپ کا......

لڑکی

کشور کے اس سوال کو نظر انداز کر، خیالوں میں ڈوبی

رات خوبصورت ہے

نیند کیوں نہیں آتی

آہنی حصاروں کو
خاردار تاروں کو
پار کر کے دامن میں

بھر کے اپنے دامن میں
ٹھنڈکیں پہاڑوں کی
جنگلوں کی خشبوئیں
میرے پاس لائی ہے رات خوبصورت ہے

روز رات کو یونہی
نیند میری آنکھوں سے
بے وفائی کرتی ہے

رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

پورے وجود کو جھٹک کر جذبات کی گرفت سے نکل کر

کشور: یہ سب بکواس ہے میں نے یہ نظم کبھی نہیں پڑھی سنی

مایوسی سے نڈھال ہو کر پختہ یقینی کے ساتھ

لڑکی: ہاں تم کمار نہیں ہو...... میرا بھیا تو...... لیکن ایک بار تو مجھے آنا ہی تھا واپس چلنے کو تیار ہوتی ہے کشور راحت بھرے لہجے میں

کشور: تو آپ جا رہی ہیں؟

لڑکی: ہاں......اور کر بھی کیا سکتی ہوں

کشور: کیا آپ اپنی ماں کے پاس جا رہی ہیں؟

اندر سے جیسے روکنا چاہتا ہو

لڑکی: ہاں......

کشور: اب کیسی ہیں آپ کی ماں جی......کیا بیماری ہے انہیں؟

لڑکی : بڑھاپے سے بڑی بیماری کیا ہوگی۔ اس پہ اکلوتے بیٹے کی جدائی کا غم: نہ زندوں میں نہ مردوں میں

دکھی ہوکر

کشور : ...... یہ تو بہت برا ہے۔

لڑکی : وہ کبھی بھی اچھی نہیں رہی کمار کا دکھ اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے..... میں لاکھ سمجھاتی ہوں کہ ماں میں تمہارا کمار بھی ہوں۔ مجھے تو اپنی بیٹی اور بیٹا دونوں سمجھو لیکن کہاں ... ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جو نہیں ہے جس کے ہونے کی کوئی سمبھاؤنا بھی نہیں ہوتی اسی کے آنے کی امید پختہ ہوتی جاتی ہے.... آپ ہی بتایئے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ماں کو کمار کیوں یاد آتا ہے۔ جو میرے لیے ہے ہی نہیں۔ جس نے پچھلے کئی سالوں سے اس کی خیر خبر نہیں لی۔ اگر ہے بھی تو اپنی ماں کو بھلا بیٹھا ہے اس کمار کی ماں کو بے حد یاد آتی ہے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟!!

کشور : تم جا کر جب اس سے کہوگی کہ میں اس کا بیٹا نہیں ہوں تو اسے ایک خوشی تو ہوگی کہ وہ ایک غدار کی ماں نہیں ہے۔

لڑکی : ہوسکتا ہے...... لیکن ...... صرف......

ماں کی بیماری کا غم جسے پریشان کر رہا ہو

کشور : اب کیا ہے.....؟

لڑکی : بیٹا...... اور بھی گھر سے بھاگا ہوا بیٹا بڑی جان لیوا بیماری ہوتا ہے...... ماں کو تو اب دن بدن ختم ہی ہونا ہے

کشور : ماں کی ایسی حالت کیوں ہو جاتی ہے۔ ماں ایسی کیوں ہوتی ہے کاش — میں نے بھی اپنی ماں کو سکھ پہنچایا ہوتا۔

(کہانی بناتے ہوئے)

میرا ایک دوست تھا اس کمبخت کو بھی اپنی ماں سے بڑا پیار تھا بات بات پہ ماں کا ذکر...... ماں کی محبت...... جب دیکھو ماں کی باتیں لے بیٹھے گا...... ہاں کیا نام تھا اس

کا......اس کا نام تھا اس کا......

لڑکی : کیا سوچ رہے ہیں

کشور : کمبخت کی شکل تو آنکھوں میں گھوم رہی ہیں لیکن نام یاد نہیں آ رہا...... ہاں ہاں یاد آیا کمار شرما......

حیران سی

لڑکی :لیکن یہ میرے بھیا کا نام ہے۔آپ کس طرح جانتے ہیں؟

کشور : جانتا ہوں اچھی طرح سے جانتا ہوں

(کہانی کے تانے بانے بنتے ہوئے)

ہاں ہم جنگ کے محاذ پر تھے۔ہم دونوں ایک ساتھ تھے ہماری بڑی دوستی ہوگئی تھی۔ ایک بار بارڈر پر گشت لگا رہے تھے۔تب میں بھی سپاہی تھا...... ہاں ہم گشت لگا رہے تھے اتنے دشمن کی جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی ادھر سے ہم نے بھی جوابی فائرنگ شروع کردی۔ دیکھتے دیکھتے ساری فضا گولیوں کی شاں شاں سے گونجنے لگی دشمن کا حملہ زوردار تھا۔ ہمارے جوانوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ ادھر میں اور کمار دونوں سوچ رہے تھے۔کیا کیا جائے۔ہم رینگتے رینگتے دشمن کے مورچے کے قریب پہنچ گیے تھے۔لیکن بیچ کی کھائی کو پار کرنا آسان نہیں تھا میری ہمت جواب دے گئی تھی وہ زخمی تھا اور مجھے کسی طرح کی کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔لیکن پھر بھی ڈر رہا تھا۔لیکن کمار بلاخوف رینگتا رینگتا۔کھائی پار کرگیا اب وہ بیگ سے گولے نکال کر دشمن کے مورچہ پر پھینکنے لگا۔ اسی میں دشمن کی سٹین گن کا منہ بھی اس کی طرف گھوم گیا۔ ادھر دشمن کا مورچہ فضا میں چھوٹے چھوٹے ذروں کی صورت فضا میں بکھرنے لگا ادھر کمار کی لاش کے چھیتھڑے اڑ رہے تھے

لڑکی :بس کیجئے۔پلیز بس

بھائی کی یادوں کے سنہری جال میں جکڑی برداشت نہ کرسکنے سے ٹوٹ سی جاتی ہے

کشور اسے دلاسہ دیتے ہوئے

کشور : اگر وہ تمہارا بھائی تھا تو اس طرح وہ اپنے وطن کی خاطر اس کی حفاظت کرتا ہوا بہادروں کی موت مرا ہے

پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے

لڑکی : میرا بھائی اس دنیا میں نہیں رہا۔ نہیں، نہیں

لڑکی پر برادرانہ شفقت نچھاور کرتے ہوئے جذباتی ہو کر

کشور : اپنی ماں سے کہنا...... کہنا کہ آپ کا بیٹا بہادروں کی موت مرا ہے ایک ایسی موت جس کے لئے ایک سپاہی ترستا ہے۔ اس سے تمہاری ماں کو بہت راحت ملے گی۔ ان کا سر فخر سے اونچا ہوگا۔

(اپنی قسمت کا مذاق اڑاتے ہوئے۔ لڑکی ہمت بڑھاتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے)

لڑکی : ہاں...... کیوں نہیں۔

خود کو سنبھالتے ہوئے

کشور : تمہیں بھی تو خوش ہونا چاہیے تمہارا بھائی تھا وہ۔

لڑکی : بہت خوش ہوں۔ اتنی خوش کہ میں رو بھی نہیں سکتی

کشور : رونے کی کیا بات ہے پگلی۔ تمہارا بھائی کسی مجرم کی موت نہیں مرا۔

کشور کی ہمدردی کو جھٹکتے ہوئے

لڑکی : میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میرے بھائی کو کہانیاں لکھنے کا بے حد شوق تھا...... وہ شوق اسے آج بھی ہے......

جلدی سے سنبھلتے ہوئے

کشور : کیا کہہ رہی ہیں آپ؟

موضوع بدلتے ہوئے

لڑکی : خیر جانے بھی دیجئے۔ ہاں وہ لالہ گردھاری لال تو آپ سے بیحد پیار کرتے تھے۔

ایک دم چونک کر

کشور :تو....تو اس سے کیا ہوتا ہے؟

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے

لڑکی :وہ سیاسی سرگرمیوں سے تعلقات نہ رکھتے ہوئے بھی ملک کے سیاسی اتار چڑھاؤ پہ پوری طرح سے حاوی تھے۔

ان کی رائے کی بہت اہمیت ہوتی تھی۔

(بڑھتی پریشانی کو روکتے ہوئے)

کشور :یہ آپ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں......

لڑکی :لالہ جی کی موت سے صرف چند روز پہلے ایک غیر ملکی ڈیلیگیشن آیا تھا۔

کشور :تو............؟

لڑکی :جس میں ہمارے ملک کی نمائندگی آپ نے بھی کی تھی

صفائی پیش کرتے ہوئے

کشور :لالہ جی ہمارے وفد کے صدر تھے۔

خبردار کرتے ہوئے

لڑکی :یہ وفد صرف کلچرل ہی نہیں تھا

کشور :تو......؟؟......کیا مطلب ہے آپ کا......؟

رازدارانہ انداز میں انکشاف کرتے ہوئے

لڑکی :اس غیر ملکی وفد کا مقصد کلچرل لین دین کی آڑ میں ہمارے ملک کے سیاسی استحکام کو تہس نہس کرنا تھا ان کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔

اپنے غصے پر قابو پا کر فیصلہ کن لہجے میں

کشور :آپ مجھ سے مل لیں؟......اب آپ جا سکتی ہیں

خبردار کرتے ہوئے

لڑکی :آپ ایک جھوٹ چھپانے کی خاطر بہت سی اہم حقیقتوں کا مذاق اڑا رہے ہیں دوٹوک بات کرنے کے انداز میں

کشور : دیکھئے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں...... میں آپ کا بھائی نہیں ہوں

لڑکی :لالہ جی اس خطرناک سیاسی اتھل پتھل میں آپ کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے بلکہ ذریعہ بنانا چاہتے تھے

کشور :کیا کہنا چاہتی ہیں آپ......؟

لڑکی :اس ملک کا یقین تھا کہ یہاں کا موجودہ نظام ان کے ملکی مفاد کو نظر انداز کر رہا ہے۔
چڑھ کر غصے سے

کشور :یہ سب جھوٹ ہے

لڑکی : نہ جانے کیوں شروع میں آپ رضا مند بھی ہو گئے تھے لیکن بعد میں بڑے سخت لفظوں میں اس کی مخالفت شروع کر دی کیوں؟ آخر کیوں؟......!......
بولئے مسٹر...... آپ کوئی بھی ہوں کمار یا کشور، بولئے آپ کی خاموشی آنے والی نسلوں کو گمراہ کر دے گی
پلیز——بولئے۔

(پوری طرح ذہنی طور پر خود کو رضا مند کرتے ہوئے سچائی اگلنے کے انداز میں9

کشور : میں سمجھتا ہوں کہ اگر ملک میں سیاسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔موجودہ نظام عوام کی فلاح کو نقصان پہنچا رہا ہے۔تو یہ تبدیلی موجودہ نظام کو بدل ملک کی بہتری کے لئے ہونا چاہئے اور اس تبدیلی کے لئے اگر کسی غیر ملک کی کسی بھی طرح کی امداد یا خوشنودی کی ضرورت ہے تو وہ بلا کسی طرح کی سودے بازی کی ہی ہونی چاہئے ......سودے بازی چاہے چھوٹی ہو یا بڑی۔چاہے وقتی طور پر ہی کیوں نہ ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔
کشور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

لڑکی :اس لئے آپ نے وزیر اعلیٰ کے عہدے کو بھی ٹھکرا دیا اس سودے بازی کا پتہ لگ چکا ہے چند ایسے ڈاکومنٹس سرکار کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔
رد کرتے ہوئے الزام لگانے کے انداز میں

کشور : آپ بلا کسی سوچ کے الزام تراشی کر رہی ہیں

لڑکی : یہ ثابت ہو چکا ہے کہ لالہ جی کسی بہت بڑے نجی فائدے کے لئے ملک میں بڑے پیمانے پر بدامنی پھیلانے شر پسندی کو ہوا دینے میں عملی طور پر کوشاں تھے۔ لڑکی کے نظریے پر سوالیہ نظر ڈالتے ہوئے۔

کشور : اگر اتنے بڑے پیمانہ پہ سانٹھ گانٹھ ہو رہی تھی تو حکومت..........

لڑکی : لالہ جی کی شخصیت کا ایک پہلو قوم پرست غریب پرور! اور انسان دوست بھی تھا۔ سماجی فلاح کے مکھوٹے کو انہوں نے بڑی چالاکی سے لگا رکھا تھا جس کی وجہ سے ان پر کسی طرح کے شک کی گنجائش ناممکن تھی ....اب آپ کیا چھپا رہے ہیں؟ کس کی پردہ پوشی کر رہے ہیں!......آپ نے عوام کے امن وچین اور ان کی زندگی سے کھیلنے سے بہتر سمجھا ایک آدمی کے خون سے ہاتھ رنگنا۔ وہ آدمی جس نے دشمن کو سب سے بڑا سمجھا۔ اس کے سب منصوبے دھرے دھرے کے رہ گئے بے حس اور چڑ چڑے پن میں ریزہ ریزہ

کشور : یہ سب بکواس ہے۔ جھوٹ ہے....

ناامیدی پر قابو یا خود کو سنبھالتے ہوئے واسطہ دیتے ہوئے

لڑکی : مسٹر کمار......کمار بھیا......اپنی بہن کو ناامید مت کرو۔ ماتا جی اپنی آخری سانسیں گن رہی ہیں۔ ان کو آپ کا انتظار ہے......وہ مرنے سے پہلے آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ جذباتی ہو کر بکھرے پن سے۔

کشور : مجھے ـــــ؟

لڑکی : ہاں ـــ اپنے بکھرے ہوئے بیٹے کو

ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے اپنے بیٹے کو۔

کشور : نہیں نہیں ......ایسا نہیں ہو سکتا

لڑکی : کیا نہیں ہو سکتا؟

کشور : نہیں نہیں تم میری بہن نہیں ہو سکتیں۔ تم میری بہن نہیں ہو سکتیں۔

ایک اور راز عیاں کرتے ہوئے

لڑکی :ٹھیک کہا آپ نے......میں آپ کی بہن نہیں ہوں۔

یقین نہ کرتے ہوئے

کشور :کیا مطلب؟ کیا کہا آپ نے؟

صاف صاف لفظوں میں زور دے کر

لڑکی :میں آپ کی بہن نہیں ہوں۔

کچھ سمجھ نہ پاتے ہوئے

کشور :تو۔تو وہ سب باتیں......؟

لڑکی :میں گردھاری لال کی بیٹی ہوں

کشور :کیا......؟......لالہ جی کی بیٹی......؟

لڑکی :آپ شاید بھول گئے ہیں

کشور :کیا مطلب؟

لڑکی :بہت عرصہ گذر چکا ہے نا

کشور :یہ سب کیا ہے؟

لڑکی :یاد کیجئے بہت عرصہ پہلے..........آپ امریکہ میں منی آرڈر اور پھر بنک ڈرافٹ بھیجا کرتے تھے

کشور :تم..........؟

لڑکی :ہاں۔میں پنکی ہوں۔لالہ جی نے تو کبھی اپنی اکلوتی بیٹی کو خط نہیں لکھا۔لیکن آپ، آپ ہر ڈرافٹ کے ساتھ باپ کی شفقتوں سے بھرا خط مجھے لکھا کرتے تھے اور وہ خط میں اپنی فرینڈز کو بڑے فخر سے سنایا کرتی تھی۔

کشور :لیکن تم نے، یہ سب..........

لڑکی :کمار صاحب! میں بیٹی تو لالہ گردھاری لال کی ہوں لیکن میری سوچ۔میری سوچ تو آپ کی شفقتوں اور پیار کے سائے میں جوان ہوئی اور میں اکیلی ہی نہیں ہوں آپ

کے ساتھ میری ممی بھی آپ کے ساتھ ہیں ...... بس تم۔

اسی میں جیلر صاحب داخل ہوتے ہیں

جیلر :ساری میڈم، چلئے کشور صاحب ...... وقت بہت کم ہے۔

التجا بھرے لہجے میں۔

لڑکی :کیا آپ تھوڑی دیر اور نہیں رک سکتے، بس تھوڑی دیر اور۔

حرف آخر کی طرح

جیلر :نہیں نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔

پریشان کن لہجے میں

لڑکی :لیکن وہ ابھی تک آئے کیوں نہیں؟

جو تھوڑی دیر پہلے آچکا ہے۔

جارج :کون ......

لڑکی :ڈی آئی جی صاحب ......

پختہ یقین بھرے لہجے میں

جیلر :وہ بھی نہیں روک سکتے محترمہ

اسی میں فون کی گھنٹی بجتی ہے رسیور اٹھا کر

یس سر ...... جی ...... جی ۔؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ...... یہ کیسے ممکن ہے ...... جی ... جی

یس سر ...... آپ خود تشریف لا رہے ہیں ...... اچھا ...... مسیج بھیج دیا ہے آپ نے ......

ٹھیک ...... جی ...... جی۔

فون رکھتا ہے جیلر کے دل میں خوشگوار ہلچل ہو رہی ہے

جارج :کیا ہوا؟ آپ اس قدر ....

خوشی سے پھولا نہ سماتے ہوئے

جیلر :مبارک ہو مسٹر کشور مبارک ...... آپ نے سچ کہا تھا میڈم

کھڑکی سے شفق کا نور پھوٹتا ہے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ بھلی لگنے لگتی ہے۔

لڑکی :کیا جیلر صاحب

جارج :کیا بات ہے

دونوں ہاتھوں سے کشور کو پکڑ کر جیلر کی خوشیوں کی نمائندگی کرتی، موسیقی سے فضا لمحہ بہ لمحہ خوشگوار ہوتی جاتی ہے۔

جیلر :یو آر فری مسٹر کشور فری......

کشور :کیا——؟ آپ..........

جیلر :یو آر ویری لکی مسٹر کشور ویری لکی

اب بھی یقین نہ کرتے ہوئے

کشور :کچھ بولئے بھی تو

جیلر :ہی از فری......

لڑکی اور جارج——

خوشی سے ناچتے ہوئے

لڑکی :فری——سچ!!!

جیلر :یس! ہی از فری لائیک اے برڈ

کشور :لیکن..........

جیلر :آسمان کی اچھوتی بلندیوں پہ خوشی سے جھومتے پرندے کی طرح۔

لڑکی :بھگوان تیرا لاکھ شکر ہے کہ تم نے..........

شکرانے کے انداز میں

جارج :ایک بے گناہ اور عظیم شخصیت کو بلاوجہ کی سزائے ذلت سے بچا لیا۔

پرندوں کی چہچہاہٹ خوشگوار موسیقی

خوش گوار موسیقی اور پردہ گرتا ہے

ابھی تو رات ہے

• انیس جاوید

کردار

بھیکو	:ایک آدیواسی
شنیواری	:ایک پاگل آدیواسی
سرکاری لال	:ٹھاکر کا منیم
بھیوا	:آدیواسی
منگلیا	:آدیواسی
اچھے کاکا	:آدیواسی بوڑھا
کملیا	:بھیکو کی بیوی
ٹھاکر	:زمیندار

راکا، دارا، سینڈو: ٹھاکر کے غنڈے

کلوا	:	آدیواسی
للو	:	آدیواسی
پھلوا	:	آدیواسی لڑکی

شہنشاہ جہانگیر، دھوبن، چوکیدار، نوعمر طالب علم اور راوی (سوتر دھار)

پردہ اٹھتا ہے

پہلا منظر

(اسٹیج کے بائیں طرف روشنی کے ایک دائرے کے نیچے راوی کھڑا ہے۔ وہ حاضرین سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔)

راوی : آپ مجھے نہیں جانتے ہیں لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ لوگ تو وہ ہیں جو دھرتی کو آکاش بنا دیں اور آکاش کو دھرتی۔ آپ چاہیں تو بادشاہ کو فقیر بنا دیں اور فقیر کو بادشاہ۔ آپ چاہیں تو حکومت بدل ڈالیں، سماج بدل ڈالیں، رسم و رواج بدل ڈالیں، ظلم اور اتیاچار کرنے والوں کو نیست نابود کر ڈالیں، اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ کون ہیں۔۔ نہیں سمجھے۔۔؟ ارے یہی تو آپ کی سب سے بڑی بھول ہے کہ آپ ابھی تک اپنے آپ کو پہچان نہیں سکے۔ یقین مانئے جس دن آپ نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے اس دن نہ ظالم رہے گا اور نہ اس کا ظلم، نہ فرسودہ سماج رہے گا نہ بے ہودہ فرسودہ رسم و رواج۔ آپ کہیں گے کہ میں آپ کے سماج کو بے ہودہ اور فرسودہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ آج میں ان وجوہات کو بتانے کے لئے نہیں بلکہ دو حقیقت نما کہانیاں سنانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ ہوسکتا ہے ان دو کہانیوں میں ہی آپ کو کہیں کچھ وجوہات نظر آ جائیں۔ ایک کہانی پرانی ہے اور ایک نئی۔ تو لیجئے پیش خدمت ہے پرانی کہانی، جو تاریخ کے اوراق میں سنہری حرفوں

میں درج ہے۔ بہت پہلے ۔۔۔اب سے کئی سو سال پہلے کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا جس کا نام نورالدین محمد سلیم جہانگیر تھا۔ جہانگیر کو انصاف پرور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔آیئے ۔۔ میرے ساتھ دیکھئے ۔۔ جہانگیر اوراس کا انصاف!!!

(مکمل اسٹیج روشن ہو جاتا ہےاور روشنی کا وہ دائرہ غایب ہو جاتا ہے جس کے نیچے راوی کھڑا تھا۔)

(منظر جہانگیر کے دربار کا ہے۔)

چوبدار : گوش برآواز ۔۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔ شہنشاہِ ہندستان نورالدین محمد سلیم جہانگیر تختِ شاہی پر رونق افروز ہورہے ہیں۔ (جہانگیر دربار میں آتا ہے)

سب درباری: جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔۔ جہاں پناہ کی آسمان میں کمند ہو۔۔!!

جہانگیر :معزز امراء دربار۔۔ ہم کافی غوروخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہماری رعایا کو صحیح انصاف مل سکے، اس لئے ایسا کچھ کر جائیں جس سے ہمارا نام تاریخ کے اوراق میں رہتی دنیا تک سنہری حرفوں میں رقم کیا جاتا رہے، ہمارا نام ایک انصاف پرور شہنشاہ کے طور پر یاد کیا جاتا رہے۔اس لئے ہم آج یہ اعلان عام کرتے ہیں کہ جس کسی کو بھی انصاف درکار ہو وہ بے خوف وخطر محل کے باہر لگے ہوئے اس گھنٹے کو بجا سکتا ہے جسے ہم نے جرسِ جہانگیری کا نام دیا ہے۔ گھنٹے کی آواز سنتے ہی ہم اپنی ساری مصروفتیں چھوڑ کر حاضر ہوں گے،فریادی کی فریاد سنیں گے اوراسے انصاف دلا کر عدلِ جہانگیر کو جلا بخشیں گی۔

سب درباری: جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔۔ جہاں پناہ کی آسمانوں میں کمند ہو۔۔!!!

(روشنی ختم ہوتی ہے اور جب دوبارہ روشنی ہوتی ہے ایک عورت جو کہ کالی ساڑی میں ملبوس ہے گھنٹہ بجارہی ہے۔گھنٹہ کی آواز سن کر جہانگیر آتا ہے۔عورت گھنٹہ بجانا بند کردیتی ہے۔)

جہانگیر :معزز خاتون۔ہم تمھاری فریاد پر گوش برآواز ہیں۔ جو کہنا ہے بے خوف وخطر کہو۔

عورت :دہائی ہے جہاں پناہ۔۔دہائی ہے۔۔ میں لٹ گئی۔۔تباہ ہوگئی۔۔ برباد ہوگئی۔

جہانگیر : خاتون۔۔ہمیں تفصیل سے آگاہ کرو تا کہ ہم تمھارے ساتھ انصاف کر سکیں۔

عورت : جہاں پناہ ایک قتالہ نے میرا سہاگ لوٹ لیا۔ مجھے ودھوا کر دیا۔۔اپنے قاتل تیر سے میرے شوہر کو ہلاک کر دیا۔

جہانگیر : ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کس نے تمہارے شوہر کو قتل کر کے تمہیں اس حال کو پہنچایا ہے۔اگر تمہارا الزام ثابت ہو گیا تو مجرم کو اس کے کئے کی سزا ملے گی۔

عورت : جہاں پناہ۔۔کہیں ایسا نہ ہو کہ نام سنتے ہی آپ کا انصاف ڈگمگا جائے، جذبات آپ کے انصاف پر غالب آ جائیں۔

جہانگیر : خاتون۔۔تم ہمیں ہی نہیں ہمارے انصاف کو بھی للکار رہی ہو۔

عورت : ایک اندیشہ تھا جسے آپ کے سامنے ظاہر کیا ہے۔

جہانگیر : تمھارا اندیشہ بے بنیاد ہے۔۔ہمیں اپنا قول یاد ہے۔

عورت : تو پھر سنئے جہاں پناہ۔۔میرے معصوم شوہر کی قاتلہ ملکۂ ہندوستان نور جہاں ہے۔

جہانگیر : خاتون۔۔۔!!!

تم ہوش میں تو ہو۔۔جانتی ہو تم کسے خطاوار کہہ رہی ہو؟

عورت : جانتی ہوں جہاں پناہ۔۔اچھی طرح جانتی ہوں۔۔پھر بھی یہاں آ گئی۔۔صرف اس لئے کہ مجھ سے اپنے شوہر کا خون دیکھا نہ گیا۔گستاخی معاف جہاں پناہ۔۔آپ یہ گھنٹہ یہاں سے ہٹا لیجئے۔آپ اسے یہاں لگانے کے حقدار نہیں ہیں۔

جہانگیر : خاتون۔۔تم نے ابھی ہمارا انصاف نہیں دیکھا۔صرف تم نے ہی نہیں ساری دنیا نے نہیں دیکھا ہے۔آج تمہارے ساتھ ساری دنیا ہمارا انصاف دیکھے گی۔

ہم شہنشاہِ ہندوستان۔۔نورالدین محمد سلیم جہانگیر فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ جس طرح ملکۂ ہندوستان نور جہاں نے اس خاتون کے شوہر کا سینہ تیر سے چھید کر اسے جاں بحق کر دیا، اسی طرح یہ خاتون مجرمہ نور جہاں کے شوہر نورالدین محمد سلیم جہانگیر کا سینہ تیر سے چھید کر اسے جاں بحق کر دے۔یہی انصاف کی مانگ ہے۔۔یہی انصاف کا تقاضہ ہے۔

سب درباری: دہائی ہے جہاں پناہ۔۔دہائی ہے۔

عورت : (جہانگیر کے پیروں پر گرتے ہوئے) مجھے انصاف مل گیا جہاں پناہ۔ مجھے انصاف مل گیا۔آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہزاروں سال قائم رہے۔ میں نے ملکہ عالیہ پر اپنے شوہر کا خون معاف کیا ہے۔

(روشنی ختم ہوتی ہے اور دائرہ روشن ہوتا ہے جس کے نیچے راوی کھڑا ہے)

دوسرا منظر

راوی : **یہ تو تھی پرانی کہانی**۔ صدیوں پرانی کہانی۔۔ آیئے۔۔ آپ کو ایک نئی کہانی سناؤں۔ آپ کے اپنوں کی کہانی۔۔ ان اپنوں کی جو ان شہروں سے دور دیہات کے کونوں میں بستے ہیں۔۔ ہم انہیں آدیواسی کہتے ہیں۔ آیئے انھیں آدیواسیوں میں آپ کو لئے چلوں۔ دیکھئے۔۔ وہ دیکھئے!!!

(پورا اسٹیج روشن ہو جاتا ہے۔ منظر ایک بستی کی چوپال کا ہے۔ ایک درخت ہے۔ درخت کے نیچے بیٹھنے کا ایک چبوترہ ہے۔ اسٹیج کے دوسرے کنارے پر ایک آدیواسی بھیکو کی جھونپڑی ہے۔)

(شام سورج ڈھلنے کے بعد کا وقت ہے۔ سرکاری لال جوٹھا کر ہری ونش رائے کا منیم ہے چبوترے پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ان آدیواسیوں کو آواز دیتا ہے جو مزدوری کر رہے ہیں)

منیم : چلو بے۔۔ سب لوگ لائن میں لگ کے اپنی اپنی مجوری لے لو۔

(مزدوری کرنے والے آدیواسی اسٹیج پر آتے ہیں اور لائن میں لگ جاتے ہیں)

منیم : یہ لے بھیوا۔ تیری مجوری۔ (بھیوا مزدوری لے کر ایک کنارے کھڑا ہو جاتا ہے۔)

منیم : یہ لے منگلیا۔۔ تیری مجوری۔ یہ تو لے کلوا۔۔ اور یہ تو للو۔۔ اور یہ تو لے بھیکو۔

(پھر سب سے کہتا ہے) کل سویرے پھر ٹرک آئیگا، اس لئے تڑکے ہی حاضر رہنا۔

(منیم اور کچھ آدیواسی اسٹیج سے چلے جاتے ہیں۔ اسٹیج پر صرف تین آدیواسی رہ جاتے ہیں)

(تینوں چبوترے کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے ہیں)

بھیوا :اے منگلیا۔ لا بیڑی تو پلا۔

منگلیا :بیڑی کہاں ہے کاکا۔۔ وہ تو کب کی ختم ہو چکی ہے۔

بھیوا :ختم ہو چکی تو دوبارہ نہیں خریدنا تھا کیا؟

بھیکو :پیسہ ہوتا تو خریدتا نا کاکا۔

بھیوا : کیوں رے منگلیا۔۔ تیری مجوری جاتی کہاں ہے۔۔ کہیں کسی لڑکی کے پھیر میں تو نہیں ہے۔

منگلیا :کیا بات کرتے ہو کاکا۔۔ بھلا ہم کسی لڑکی کے پھیر میں کاہے کو پڑیں۔

بھیکو : اور پھر کاکا۔ لڑکی کے پھیر میں وہ پڑے جس کی جیب میں دھن ہو۔ ہمارے پاس دھن تو دور۔۔ جیب ہی نہیں ۔(سب ہنستے ہیں) ہنسنے کی بات نہیں ہے کاکا۔ ذرا سوچو۔۔ ہم کتنا پسینہ بہاتے ہیں، تب کہیں جاکے ایک وقت کی روٹی ملتی ہے۔۔ اور۔۔۔!!!

بھیوا :اور کا رے بھیکو۔۔۔؟

بھیکو : جانے دے کاکا۔ جانے دے۔۔ تم لوگ نہیں سمجھو گے۔

منگلیا : سمجھیں گے کاہے نا ہی رے بھیکو۔۔ تو کہہ تو اپنی بات۔

بھیکو :اور ہمارے بل پر او ٹھاکر عیش کرتا ہے عیش۔

بھیوا :بھیکو۔۔!!! عجب ہے نام لے ٹھاکر صاحب کا۔۔ او ہمارے ان داتا ہیں۔

بھیکو :ہاں۔۔ او ہمارے ان داتا ہیں۔۔ لیکن وہ کیسا ان داتا ہے کاکا۔۔ جو صرف ایک وقت کا ہی ان دان کرتا ہے۔

منگلیا :اے ماٹھا کر صاحب کا کا دوش۔ ای سب تو ہم لوگوں کی قسمت کا پھیر ہے۔

بھیکو :تو سچ کہتا ہے منگلیا۔۔ جب کسی بات کے آگے ہمارے سوچ اَٹ جائے تو ہم اسے

قسمت کا پھیر کہہ کے اپنے من کو تسلی دے دیتے ہیں۔ کیسی انوکھی ریت ہے اس سنسار کی۔ (سرد آہ بھرتا ہے) (اسی وقت آدیواسی کلوا ہانپتے کانپتے اسٹیج پر داخل ہوتا ہے)

کلوا :ارے بھیوا کاکا۔۔ ہمارے تو بھاگ کھل گئے۔۔ ہماری قسمت جاگ اٹھی۔

بھیکو :لو۔۔ایک اور آگیا قسمت کا دھنی۔

کلوا :سچ کہتا رے بھیکو۔۔ آج ہمارے بھاگ کھل گئے ہیں۔

بھیوا :بات ہی جانا چنے کی ہے کاکا۔

منگلیا :اب یہ ناچنا بند کر کے کام کی بات کر۔

کلوا :کام کی بات اہی ہے کاکا کہ ٹھاکر صاحب آرہے ہیں۔

بھیوا :ٹھاکر صاحب۔۔۔!

منگلیا :یہاں۔۔۔!!

بھیکو :اور اس وقت۔۔!!!

کلوا :ہاں اور نہیں تو کیا۔ (سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پس منظر سے شور سنائی دیتا ہے)

پس منظر :ٹھاکر صاحب۔۔۔ جے!!! ہمارے ان داتا کی۔۔۔ جے!!!

(کئی آدیواسیوں کے بیچ گھرا ہوا ٹھاکر اسٹیج پر آتا ہے۔ منیم بھی ساتھ ہے۔ چاروں آدیواسی اٹھ کر کو فرشی سلام کرتے ہیں۔ ٹھاکر چبوترے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد آدیواسی بھی فرش پر بیٹھ جاتے ہیں۔ منیم ٹھاکر کی بغل میں کھڑا رہتا ہے۔ جھونپڑی میں سے بھیکو کی جوان بیوی کملیا بھی آکر بھیکو کے بازو میں بیٹھ جاتی ہے۔ ٹھاکر نظر بھر کے اسے دیکھتا ہے، پھر منیم سے کہتا ہے۔)

ٹھاکر :سرکاری لال۔۔!

منیم :جی سرکار۔۔؟

ٹھاکر :شروع ہو جاؤ۔

منیم :ابھی شروع ہوتا ہوں سرکار۔ (آدیوسیوں سے) ہاں تو یہ تمھارے لئے بڑے گورو کی بات ہے کہ ٹھاکر صاحب تم لوگوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ تمھارے بچوں کو اپنا بچہ سمجھتے

ہیں۔(ٹھاکر کھنکارتا ہے۔منیم گھبرا کر بات بدل دیتا ہے) میرا مطلب ہے کہ تمہارے بچوں کو تمہارا ہی بچہ سمجھتے ہیں۔آج وہ تمھارے بچوں کو اپنی اور سے مفت میں ایک چڈی دینے آئے ہیں۔

(سب تالیاں بجاتے ہیں) تالی مت بجاؤ۔تالی مت بجاؤ۔

بھیوا : کاہے ہجور۔۔؟

منیم : یہ تالی بجانے کا موقعہ نہیں ہے۔ (ٹھاکر پھر کھنکارتا ہے) کھنکھاریئے مت سرکار۔۔میں سچ کہتا ہوں، یہ تالی بجانے کا موقعہ نہیں ہے۔کیونکہ آپ کے یہ نیک کام دیکھ کر مجھے آپ کے سورگباشی پتا جی کی یاد آ گئی۔ہائے کتنے دیالو تھے وہ۔۔آج بھی سارا گاؤں ان کی دیالوتا کے گن گاتا ہے۔۔پرماتما ان کی آتما کو شانتی دے۔

(اچانک زور سے زور سے قہقہہ لگانے کی آواز اُبھرتی ہے۔سب چونک پڑتے ہیں۔چبوترے کے پیچھے سے ایک پاگل آدیواسی شنیواری ہنستے ہوئے سامنے آتا ہے۔)

شنیواری : ہاہاہا۔۔پرماتما۔۔ہاہاہا۔۔آتما۔۔ہاہاہا۔۔ٹھاکر! تمھاری آتما کب پرماتما سے ملنے جارہی ہے۔

منیم : ارے یہ پاگل یہاں کیا کررہا ہے۔لے جاؤ اسے یہاں سے۔

شنیواری : یہاں سے کہاں لے جاؤ گے ٹھاکر کے چمچو۔۔یہ میرا دیش ہے۔۔یہ میری دھرتی ہے۔میں اس دھرتی سے تم لوگوں کو ہٹا کر ہی دم لوں گا۔۔ٹھاکر۔میں تمھارا ناش کر کے ہی دم لوں گا۔۔سمجھے تم۔۔ناش۔۔سرو ناش۔۔ہاہاہا۔۔!!!

ٹھاکر : (غصہ سے) ہٹا لے جاؤ اس پاگل کو میرے سامنے سے۔۔ورنہ تم میں سے کسی کے بچے کو بھی چڈی نہیں ملے گی۔

شنیواری : چڈی کا دان کر رہے ہو ٹھاکر۔۔کرو۔۔کرو کرو۔۔بولو۔۔چڈی والے ٹھاکر۔۔! (سب چپ رہتے ہیں) ارے بولو جے۔۔چڈی والے ٹھاکر کی جے۔۔چڈی والے ٹھاکر کی جے۔۔!!!

(نعرہ لگاتے ہوئے اسٹیج سے چلا جاتا ہے۔)

منیم : چلا گیا سالا۔۔ پاگل کہیں کا۔

ٹھاکر : (دکھ کی ایکٹنگ کرتے ہوئے) بے چارہ شنیواری! (آدیواسیوں سے) ہاں تو میرے سیوکو! آج تمہیں بہت خوشی ہونی چاہیے کہ ہم نے تمھاری بچوں کے لئے چڑیوں کا بندوبست کیا ہے۔ ہم ہمیشہ اسی طرح تم لوگوں کے لئے کسی نہ کسی چیز کا بندوبست کرتے رہیں گے۔۔ لیکن ۔۔ ایک شرط ہے۔ (سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں) ۔تم لوگ اسی طرح دل لگا کر محنت کرتے رہو گے، کیونکہ محنت ہمارا جیون۔۔ محنت ہمارا نعرہ۔۔ محنت سے جو بھی ہارا۔۔ وہ زندگی سے ہارا۔۔ ہارا۔

منیم : ارے تالی بجاؤ۔۔!! (سب تالی بجاتے ہیں)

ٹھاکر : اچھا تو اب ہم چلتے ہیں۔ کل تم سب کوٹھی پر سلامی دینے آنا اور اپنے بچوں کے لئے چڑی لیتے جانا

(جانے کے لئے قدم بڑھاتا ہے پھر کچھ سوچ کر رک جاتا ہے) لیکن ایک بات دھیان میں رکھنا۔ ہمارے خلاف بھڑکانے والوں سے ہوشیار رہنا۔ اگر ذرا بھی غفلت برتی تو بھگوان کا قہر تم پر ایسے ٹوٹ گا کہ تم سب تباہ و برباد ہو جاؤ گے کیونکہ بھگوان نے ہمیں تمھارا بھگوان بنا کر بھیجا ہے۔

(چلتے چلتے پھر رک جاتا ہے۔) سرکاری لال۔۔!

منیم : جی سرکار۔۔!

ٹھاکر : ان سب میں دارو بانٹ دو۔

منیم : جو آ گیا سرکار۔ (منیم بستہ میں سے شراب کی بوتلیں نکال کر آدیواسیوں کو دیتا ہے)

منگلیا : ٹھاکر صاحب کی۔۔۔۔!!

سب : جے۔۔!!!

منگلیا : ہمارے ان داتا کی۔۔۔۔!!!!

سب : جے۔۔۔۔!!!!! (ٹھاکر اور منیم جاتے ہیں۔ جاتے جاتے ٹھاکر پھر کملیا کو نظر بھر دیکھتا ہے کملیا جھونپڑی کے اندر چلی جاتی ہے۔ بھیکو۔ بھیوا اور منگلیا کے علاوہ

دوسرے آدیواسی بھی چلے جاتے ہیں۔منگلیا نعرہ لگاتا ہے۔)

منگلیا :ٹھاکر صاحب کی۔۔۔!

تینوں :جے۔۔!!

منگلیا :ہمارے ان داتا کی۔۔۔!!

تینوں :جے۔۔۔!!!!(شنیواری آتا ہے۔)

شنیواری :ان داتا نہیں۔۔جل داتا کہو۔۔جل داتا۔۔ہاہاہا۔۔!!!

منگلیا :یہ ابھاگا شنیواری کہاں سے آٹپک پڑتا ہے۔

شنیواری :آکاش سے۔۔اس آکاش سے جہاں تمھارا ہمارا بھگوان سورہا ہے۔۔سونے دو اسے سونے دو۔۔جب تک وہ سوتا رہے گا۔ ٹھاکر کے اتیا چار جاگتے رہیں گے۔۔جس دن وہ جاگ گیا۔۔تمھارا یہ دھرتی کا بھگوان سوجائے گا۔۔ ہاہاہا۔۔ بھگوان۔۔ہاہاہا۔۔غلاموں کا عیش۔۔ہاہاہا۔

کلوا :خبردار شنیواری جوتو نے ہمیں غلام کہا۔

منگلیا :تیرے دانت توڑ دوں گا۔۔ہاں۔

بھیکو :ارے تم لوگ خواہ مخواہ اس پاگل کے منہ لگ رہے ہو۔یہ تو پاگل ہے۔تم کیوں پاگل بنتے ہو۔

شنیواری :پاگل بن کر ہی ہوش میں آؤ گے۔۔ہاں۔۔نامرد کہیں کے۔۔غلام کہیں کے۔ (چلا جاتا ہے)

کلوا :سالا پاگل کہیں کا۔جیبھ کھینچنے کو جی ہورہا تھا۔

بھیکو :ایسا مت کہو کلوا۔تو اس کا درد نہیں جانتا۔شاید اس بستی میں ایسا کوئی نہیں جو اس کا درد جان سکے۔

بھیوا :ارے بھاڑ میں جائے وہ اور اس کا درد۔۔۔لا۔۔۔بوتل ادھر کولا۔۔(بوتل لے کر گھونٹ بھرتا ہے۔)

سالی پہلی دھار کی معلوم ہوتی ہے۔

کلوا :(بھیوا سے بوتل لے کر ایک گھونٹ پیتے ہوئے) سچ۔ بڑی جاندار ہے۔

منگلیا :(کلوا سے بوتل لے کر گھونٹ بھرتے ہوئے) سالی بڑی کڑوی ہے۔

بھیکو :(منگلیا سے بوتل لے کر ایک ہی گھونٹ میں آدھی بوتل ختم کرتے ہوئے) ہمارے جیون سے زیادہ کڑوی نہیں ہے منگلیا۔۔ ہمارے جیون سے زیادہ کڑوی نہیں ہے۔

بھیوا :آج بڑا دکھی لاگے ہے رے بھیکو؟

بھیکو : ارے کاکا۔۔ سکھ تو ہم نے دیکھا ہی نہیں کہ کیسا ہوتا ہے۔تو نے دیکھا ہے کاکا۔نہیں۔کلوا۔۔تو نے دیکھا ہے۔نہیں۔۔منگلیا تو نے دیکھا ہے۔۔نہیں۔ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا ہے، کیونکہ ہم سکھ بھوگنے کے لئے نہیں دکھ اٹھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔اٹھائیں گے۔اٹھاتے رہیں گے۔مگر کب تک۔۔؟ ارے اُو اوپر بسنے والے۔۔تیری چوپڑی میں کہیں ہمارے نام کا بھی سکھ لکھا ہے کہ نہیں۔۔ نہیں لکھا ہے نا۔۔معلوم ہے۔۔تو ہمارے نام کا سکھ کیوں لکھے گا۔تو تو محل والوں کا بھگوان ہے۔۔تو تو کوٹھی والوں کا بھگوان ہے۔۔ہمارا بھگوان تھوڑی ہے۔

بھیوا :اے بھیکو۔۔زیادہ چڑھ گئی ہے کیا۔۔کیا اناپ شناپ بک رہا ہے۔

کلوا :لگتا ہے بھیجے پہ چڑھ گئی ہے سالے کے۔

بھیکو :خبردار جو سالا کہا تو۔۔۔سالا ہوگا تو۔۔تیرا باپ۔

کلوا :باپ تک مت جانا بھیکو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔

بھیکو :جاؤں گا۔۔باپ تو کیا دادا تک بھی جاؤں گا۔۔کیا کرلے گا تو؟ (کملیا آتی ہے)

بھیوا :اے کملیا۔۔سنبھال اپنے گھر والے کو۔۔کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔

منگلیا :چلو بے۔۔سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔(تینوں جاتے ہیں)

بھیکو : چلے گئے۔سالے سب چلے گئے۔۔نامرد کہیں کے۔۔غلام کہیں کے۔۔مریں گے۔۔سالے سب مریں گے۔ٹھاکر کے پیر دھوتے دھوتے سب مریں گے۔

کملیا :چل جھونپڑی میں چل بھیکو۔

بھیکو :جھونپڑی۔۔؟ کدھر ہے۔۔اوہ۔۔وہ ہے۔۔ہاہاہا۔۔سالا میں تو بھول ہی گیا تھا

کہ میری جھونپڑی ہے۔۔محل نہیں۔۔اے کملیا۔ایک بات پوچھوں؟

کملیا : پوچھ۔۔!

بھیکو : کیا اس جھونپڑی تیرادم نہیں گھٹتا۔اس چوہے کی بل میں طبیعت نہیں گھبراتی؟

کملیا : گھبراتی تو ہے پر کیا کیا جائے۔۔اپنی تقدیر میں جھونپڑی ہی لکھی ہے۔

بھیکو : (جھنجھلا کر) تقدیر تقدیر تقدیر۔جسے دیکھو تقدیر کا رونا روتا ہے۔۔ارے سالی تقدیر ہے کیا چیز؟ رہتی کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ۔۔بتاؤ پیٹ بھرا اناج نہ ملے تو تقدیر، تن ڈھانپنے کو کپڑا نہ ملے تو تقدیر رہنے کو ڈھنگ کا گھر نہ ملے تو تقدیر۔۔وہ سالے کیا دس بارہ ہاتھ پیر والے ہوتے ہیں جو بھر پیٹ کھاتے ہیں، ریشمی کپڑا پہنتے ہیں، بڑی سی کھوٹی میں رہتے ہیں، ہم ان سے زیادہ محنت کرتے ہیں، پھر بھی سالی وہی گھٹیا سی زندگی، ارے اس زندگی سے موت اچھی۔کملیا مجھے مار ڈال۔میں تیرا گنہگار ہوں۔نہ تجھے اچھا کھلا سکتا نہ پہنا سکتا ہوں۔مجھے مار ڈال کملیا مجھے مار ڈال!

کملیا : جھونپڑے میں چل بھیکو۔۔تیرے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

بھیکو : طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو کیا کر لے گی تو، میرا علاج کروائے گی، وید کو بلوائے گی، ہے پیسہ تیرے پاس، بول ہے پیسہ تیرے پاس۔طبیعت خراب ہے تو تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔اچھا ہے مر جاؤں سالا غلامی سے تو چھٹکارا ملے گا۔

کملیا : ایسا نہ کہو بھیکو، تیرے بغیر میں بھی جی نہ سکوں گی، مر جاؤں گی تجھے پکار پکار کے، مر جاؤں گی تجھے پکار پکار کے مر جاؤں گی تجھے پکار پکار کے۔ (روتی ہے۔)

بھیکو : رو کملیا رو۔ہم رونے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، ہم بلکنے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ہنسی تو کسی اور کے حصے میں، وہ۔۔ان محل والوں کے حصے میں، ارے سالو! چوسو، جی بھر کے ہمارا لہو چوسو۔لیکن یاد رکھنا، کل ہمارا ہوگا، کل پر ہمارا ادھیکار ہوگا، تب دیکھیں گے تمہیں۔

کملیا : کل کی سوچیں گے بھیکو، ابھی تو چل کے سو جا۔دیکھ کتنی رات ہو رہی ہے۔

بھیکو : ارے یہ رات تو کب سے اپنی جگہ پر ہے۔نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے۔اس رات کو

بڑھانے اور گھٹانے والا تو سویا ہے۔۔وہ اوپر۔۔آرام سے سویا ہے۔سوتے رہ بھگون۔۔سوتے رہ۔جب جاگے گا تب دیکھوں گا۔

کملیا : چل بھیکو چل۔۔تجھے میری سوگندھ۔

بھیکو : چل، تیری سوگندھ کی لاج تو رکھنی ہی ہوگی۔(دونوں جھونپڑی میں جاتے ہیں)

(فیڈ آؤٹ)

تیسرا منظر

(روشنی ہوتی ہے۔منظر وہی ہے۔وقت صبح تڑکے کا ہے۔)

(شنیواری ایک لڑکی پھلوا کی لاش کندھوں پر اٹھا کر اسٹیج پر آتا ہے۔)

شنیواری : جاگو۔۔ارے ٹھاکر کے غلاموں جاگو۔۔آؤ اور دیکھو۔۔میں تمہاری آتما کی لاش اٹھا کر لایا ہوں۔(لاش کو زمین پر رکھتا ہے۔) ارے دیکھو۔۔دیکھو اس لاش کو اور شرم سے ڈوب مرو۔ارے او سونے والو اب تو جاگ اٹھو تمہیں جگانے کے لئے ابھی اور کتنی لاشیں چاہیے۔چمپا، چمیلی، گلابو۔۔اور اب پھلوا۔ایک۔۔دو تین چار۔۔بھیا بنو ہوشیار۔۔ایک دو تین چار۔۔بھیا بنو ہوشیار!!!(بھیکو اور کملیا جھونپڑی سے نکلتے ہیں۔)

بھیکو : کیا ہے رے شنیواری۔۔یہ سویرے سویرے کیوں چلا رہا ہے؟(پھلوا کی لاش کو دیکھ کر) ارے یہاں یہ کون سو رہی ہے؟

شنیواری : شش۔۔۔!!!۔۔دھیرے بولو۔۔یہ تمہاری آتما ہے۔۔جاگ جائے گی۔

کملیا : (لاش کے پاس جا کر) ارے یہ تو پھلوا ہے۔۔!

شنواری : جھوٹ مت بولو۔یہ پھول نہیں ہے۔پھول تو صبح سویرے کھلتے ہیں۔مرجھاتے نہیں۔یہ تو مرجھا گئی ہے۔

کملیا :ارے بھیکو یہ تو مرگئی ہے۔(چلاتی ہے۔)اچھے کا کا تیری پھلوا مرگئی۔(چلاتی ہوئی اسٹیج سے باہر جاتی ہے۔)اچھے کا کا۔۔تیری پھلوا مرگئی۔۔۔!!!

بھیکو :شنیواری۔۔یہ سب کیسے ہوا۔۔پھلوا کیسے مرگئی؟

شنیواری :پھلوا کیسے مرگئی۔۔جیسے پہلے تین مری تھیں۔۔آتم ہتیا کر کے۔۔آتم ہتیا کا مطلب جانتے ہو۔۔خود کو مارنا۔۔تم بھی مارو گے ایک دن تم بھی خود کو مارو گے ۔۔چمپا کیطرح۔۔چمیلی کی طرح گلابو کی طرح پھلوا کی طرح۔۔ہاہاہا۔۔(کملیا کے ساتھ اچھے کا کا اور کئی آدیواسی آتے ہیں۔)

کملیا :وہ رہی کا کا۔۔وہ رہی تیری پھلوا۔(اچھے کا کا ایک بوڑھا لاغر آدیواسی ہے۔وہ چیخ پڑتا ہے۔)

اچھے کا کا :پھلوا میری بچی، یہ کیا ہوگیا؟ تجھے یہ کیا ہوگیا؟ میری بچی۔۔تو تو ٹھاکر صاحب کی حویلی گئی تھی۔

شنیواری :جانتے ہوئے ٹھاکر ہمارے کون ہیں۔۔بھگوان ہیں۔۔پھلوا اپنے بھگوان کے پاس گئی تھی۔۔بھلا بھگوان کے پاس جا کر کوئی واپس آتا ہے۔۔روؤ مت۔۔بھگوان کو رونا اچھا نہیں لگتا۔

اچھے کا کا :بیٹی۔۔اتنی جلدی ہم سے روٹھ کر کیوں چلی گئی۔ابھی تو نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا ۔۔ابھی تو دنیا میں بہت کچھ دیکھنا تھا۔۔تیرا لگن ہونا تھا۔

شنیواری :لگن تو ہوگیا۔۔کل رات لگن ہوگیا۔تم خوش نصیب ہو کا کا جو تمہیں اتنا اچھا جنوائی ملا ۔۔مبارک ہو کا کا۔۔مبارک ہو۔

بھیکو :کیا بک بک کر رہا ہے شنیواری۔۔سیدھی طرح بتا تا کیوں نہیں کہ پھلوا کیسے مری

شنیواری :(زور سے) پھلوا تم سب کے بھگوان کی بھینٹ چڑھ گئی۔۔تمہارے ٹھاکر کی بھینٹ چڑھ گئی۔

منگلیا :ارے شنیواری، ذرا سوچ سمجھ کر بول۔ٹھاکر صاحب پر الزام لگانے سے پہلے اپنا انجام سوچ لے۔

شنیواری :انجام۔۔ہاہاہا۔۔!!!

بھیکو :منگلیا شنیواری پاگل ہے تو کیا ہوا۔۔یہ جھوٹ نہیں بولتا ہے

کلوا :اس کا مطلب ہے پھلوا کی ہتیا ٹھاکر صاحب نے کی ہے۔

بھیکو :ہاں!

بھیوا :بھلا ٹھاکر صاحب کو پھلوا سے کیا بیر ہو سکتا ہے؟

بھیکو :یہی بیر کیا کم ہے کہ پھلوا جوان تھی ۔۔خوب صورت تھی ۔۔مسل کر پھینک دیا ہوگا ٹھاکر نے۔

اچھے کاکا :پھلوا مر گئی ۔۔کون کہتا ہے کہ پھلوا مر گئی ۔۔تم سب جھوٹ بولتے ہو ۔۔میری پھلوا مری نہیں ۔۔دیکھو۔۔وہ دیکھو۔۔شہنائی بج رہی ہے۔۔میری پھلوا کی بارات آ رہی ہے۔۔میری پھلوا دلہن بنی بیٹھی ہے۔۔اس کی ڈولی جا رہی ہے۔۔دیکھو۔۔وہ دیکھو۔۔ڈولی جا رہی ہے۔۔ہاہاہا۔۔!ڈولی ۔۔ہاہاہا۔۔!۔۔ڈولی ۔۔ہاہاہا۔۔!!
(پاگلوں کی طرح ہنسنے لگتا ہے)

کملیا :ہوش میں آ۔۔کاکا۔۔ہوش میں آ۔۔!!(جھنجھوڑتی ہے۔)

اچھے کاکا :(چونک کر) آں۔۔!!(بلک بلک کر رونے لگتا ہے۔للو دوڑتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے۔)

للو :ٹھاکر صاحب آ رہے ہیں۔۔!!

بھیکو :بھیکو آنے دو۔۔آج حساب صاف ہو جائے گا۔(ٹھاکر منیم اور تین غنڈوں کے ساتھ آتا ہے۔)

مجمع پر سناٹا طاری ہو جاتا ہے۔ٹھاکر پھلوا کی لاش کے پاس آتا ہے اور اداسی سے کہتا ہے۔)

ٹھاکر :ہمیں بہت دکھ ہے کہ پھلوا مر گئی۔بھگوان کی مرضی کے آگے کسی کا کیا زور۔

منیم :ٹھاکر صاحب نے فیصلہ کیا ہے کہ پھلوا کے انتم سنسکار کا سارا خرچ خود اٹھائیں گے۔

شنیواری :خوب ۔۔۔بہت خوب۔۔۔مارنے والا انتم سنسکار بھی خود کرے گا۔۔بہت خوب۔۔ہاہاہا!!ٹھاکر کیا بکتا ہے شنیواری۔۔!!!

بھیکو :شنیواری ٹھیک کہہ رہا ہے ٹھاکر صاحب۔

منیم :ہری اوم ہری اوم، گھور کلجگ۔ اپنے پالنہار کو لوگ ہتیارا کہنے لگے۔۔ ہری اوم!

بھیکو :کیا یہ جھوٹ ہے کہ پھلوا کو آپ نے مارا ہے؟

ٹھاکر :کیا یہ سچ ہے کہ پھلوا کو ہم نے مارا ہے؟

بھیکو :ہاں۔۔۔!!

ٹھاکر :کیا ثبوت ہے اس کا؟

بھیکو :یہ شنیواری۔۔!!

منیم :ارے تم لوگ اس پاگل کی باتوں میں آ گئے، یہ تو ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔ پھلوا نے تو آتم ہتیا کی ہے۔

بھیکو :آتم ہتیا کا بھی تو کوئی کارن ہوتا ہے۔

ٹھاکر :ضرور ہوتا ہے۔

بھیکو :پھلوا کے آتم ہتیا کرنے کا کارن آپ ہیں۔۔آپ!

ٹھاکر :بھیکو۔۔کیا بکواس کر رہا ہے۔۔ بھلا پھلوا کو ہماری وجہ سے تم آتم ہتیا کیوں کرتی پڑی؟

بھیکو :آپ نے پھلوا کے ساتھ بلاتکار کیا تھا۔

ٹھاکر :بھیکو۔۔۔ہم پر تہمت دھرنے سے پہلے انجام سوچ لو۔ بھلا بتاؤ تو پھلوا کی لاش کسے ملی تھی؟

بھیکو :شنیواری کو سرکار۔۔۔!

ٹھاکر :کہاں سے۔۔؟

بھیکو :بھگوان جانے۔۔۔ پر پھلوا گئی تو آپ کی ہی حویلی تھی۔

ٹھاکر :پھلوا ہماری کوٹھی پہنچی ہی نہیں تھی۔

منیم :سرکار۔۔۔مجھے تو لگتا ہے شنیواری نے ہی پھلوا کے ساتھ منہ کالا کر کے اسے آتم ہتیا پر مجبور کیا ہوگا۔

ٹھاکر :شنیواری۔۔!!!۔۔یہ تم نے بہت برا کیا۔۔ ہمارے راج میں تم ہماری بستی کی کسی لڑکی سے منہ کالا کرو۔۔ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے۔۔راکا۔۔دارا۔۔سینڈو۔۔ہڈی پسلی ایک کردو اس کی۔۔ بہت سر چڑھ گیا ہے۔(تینوں غنڈے آگے بڑھتے ہیں)

بھیکو :(راستہ روک کر) ٹھاکر صاحب،آپ اپنا دوش ایک پاگل کے سر پر تھوپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

منیم :یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایک پاگل کا دوش تم لوگ بھگوان سمان مالک پر تھوپنے کی کوشش کر رہے ہو۔

شنیواری :بھگوان۔۔۔ ہمارا بھگوان۔۔اس بستی کا بھگوان۔۔ہاہاہا۔۔پائے لاگوں بھگوان۔۔پائے لاگوں، سنا تم لوگوں نے ۔۔بھگوان۔۔بلاتکاری بھگوان۔۔ہاہاہا۔۔ اسے بھگوان کہو جو تمھاری بہو بیٹیوں کے ساتھ بلاتکار کرے۔ اسے بھگوان کہو جو تمہیں کیڑے مکوڑوں سے بھی کیا گذرا سمجھے۔۔پیر پکڑوا اپنے بھگوان کے۔۔پکڑو پیر۔۔ہاہاہا۔۔!!!(ٹھاکر تینوں غنڈوں سے کہتا ہے)

ٹھاکر :تم لوگ دیکھتے کیا ہو؟ ختم کردو اس پاپی کو، تا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ہماری بستی میں بلاتکاری کی کیا سزا ہوتی ہے۔(تینوں غنڈے شنیواری کی پٹائی شروع کر دیتے ہیں)

کملیا :ٹھاکر صاحب۔۔معافی دے دو۔۔وہ مر جائے گا۔۔وہ مر جائے گا۔

ٹھاکر :مر جائے گا تو اچھا ہوگا۔۔پاپ کا سروناش تو ہوگا۔(کملیا روتی ہے۔بھیکو کملیا کو ٹھاکر کے پیروں سے اٹھاتا ہے۔غنڈے شنیواری کو بے حال کر کے ٹھاکر کے پیروں میں ڈال دیتے ہیں۔ٹھاکر اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیتا ہے۔کملیا کی چیخ نکل پڑتی ہے۔شنیواری دم توڑتا ہے۔)

ٹھاکر :جاؤ۔۔لے جاؤ اس پاپی کی لاش کھینچ کے لے جاتے ہیں۔ٹھاکر آدیواسیوں سے کہتا ہے)

ٹھاکر :تم لوگ کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔جاؤ اور پھلوا کی لاش کے انتم سنسکار کا بندوبست کرو(منیم سے) چلو سرکاری لال!(دونوں جاتے ہیں۔کملیا بھیکو کے سینے پر سر رکھ کر روتی ہے)

فیڈ آؤٹ

چوتھا منظر

(صبح کا وقت ہے بھیکو جھونپڑی سے باہر نکلتا ہے۔ اسی وقت کملیا گھبرائی ہوئی اسٹیج پر آتی ہے۔)

کملیا : بھیکو ۔۔ بھیکو ۔۔!!!

بھیکو : کیا ہوا کملیا۔۔ اتنی ڈری ڈری کیوں ہے؟

کملیا : وہ ۔۔ وہ راکھشش ۔۔ مجھے چھیڑ رہا ہے۔

بھیکو : وہ کون ۔۔؟ (ویسے ہی منیم آتا ہے۔ وہ ہانپ رہا ہے۔)

منیم : (بھیکو کو دیکھ کر) بھیکو ۔۔ مجوری پر نہیں گیا رے؟

بھیکو : مجوری گئی بھاڑ میں ۔۔ پہلے یہ بتاؤ ۔۔ یہ سب کیا ہے؟

منیم : کیا سب ۔۔؟

بھیکو : اتنے انجان مت بنو۔ (کملیا سے) کملیا ۔۔ بتاؤ اس منیم کے بچے کو۔۔ کیا ہوا تھا؟

منیم : دیکھ بھیکو، زبان سنبھال کر بات کر، میں ایسا ویسا کوئی آدمی نہیں ہوں۔ ٹھاکر صاحب کا منیم ہوں۔

بھیکو : ٹھاکر کے منیم کے یہی کرتوت ہوتے ہیں کہ وہ ہماری بہو بیٹیوں پر بُری نظر رکھے۔ ان کی عزت پر ہاتھ ڈالے۔

کلیا : دیکھ۔۔۔تو ندی پر مجھ سے چھیڑ خانی نہیں کر رہا تھا کیا۔۔؟ بول۔۔!

منیم :تھوڑی ہنسی مذاق کر لی تو کون سی آفت آ گئی۔۔آخر کو ہم ٹھاکر صاحب کے منیم ہیں۔

بھیکو : دیکھو منیم جی۔بستی کی اور عورتوں کے ساتھ جو تم کرتے آئے ہو، وہ میرے گھر والی کے ساتھ نہیں چلے گا۔

منیم : ارے جا جا۔۔زیادہ اکڑ نہ دکھا۔۔اس بار تیری گھر والی کا نمبر ہے۔

بھیکو : کیا بکتا ہے منیم کے بچے۔۔؟

منیم : ٹھاکر صاحب کا سندیسہ لے کر آیا ہوں۔کل ان کا جنم دن ہے۔اس اوسر پر انھوں نے تیری گھر والی کو کوٹھی پر بلایا ہے۔

بھیکو :کوٹھی پر بلانے کا مطلب میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

منیم : مجھے معلوم ہے کہ تو بڑا سمجھدار ہے۔

بھیکو : سمجھدار ہوں اسی لئے کملیا کو کوٹھی پر نہیں بھیجوں گا۔

منیم : انجام جانتا ہے۔۔؟

بھیکو : انجام کی کسے پرواہ ہے۔

منیم : کیوں ناحق ضد کرے ہے۔میری بات مان لے اور بھیج دے کملیا کو۔۔فائدے میں رہے گا۔

کملیا :تو اپنی بیٹی کو بھیج کر فائدہ حاصل کر لے نا منیم۔۔کاکا۔۔!

منیم : (غصہ سے) اپنی اوقات میں رہ کملیا۔۔ورنہ بہت برا ہوگا۔

کملیا :تو میرے سامنے سے چلا جا بوڑھے کھوسٹ۔۔ورنہ اس سے بھی برا ہوگا۔

منیم : اری جا بڑی آئی رستم کہیں کی۔۔ایک ہی رات میں ٹھاکر صاحب نے سارے کس بل ڈھیلے نہ کر دئے تب کہنا۔

بھیکو : (منیم کا گریبان پکڑ کے) منیم کے بچے۔۔آگے کا ایک لفظ بھی کہا تو تیری جیبھ کھینچ لوں گا۔

منیم :ارے۔ارے۔۔گریبان چھوڑ۔(بھیکو جھٹکے سے گریبان چھوڑتا ہے۔منیم زمین پر گرتا ہے۔)

بھیکو : چلے جا کمینے کتے۔۔اس سے پہلے کہ میں یہیں تیری لاش گرادوں۔ بھاگ جا یہاں سے۔

منیم : تو کیا میری لاش گرائے گا۔اپنی فکر کر اپنی۔۔سمجھا رہا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا۔۔ سچ ہے۔لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔

کملیا : ارے جا بوڑھے کھوسٹ۔۔تیری ان دھمکیوں میں ہم نہیں آنے والے۔جا کہہ دینا اپنے ٹھاکر سے۔۔کملیا اپنی جان دے دے گی پر اس کی بات نہیں مانے گی۔

منیم : دیکھتا ہوں نا۔۔کب تک نہیں مانے گی۔

کملیا : جب تک دم میں دم ہے۔ٹھاکر کے چمچے۔۔!

منیم : دیکھ لوں گا۔۔تم دونوں کو دیکھ لوں گا۔

کملیا : ارے جا تا کہ نہیں۔۔(منیم بھاگ نکلتا ہے۔) تیری تو ماں۔۔بڑا آیا ہے مجھے ٹھاکر کے پاس لے جانے والا۔۔!(بھیکو کملیا کو سینے سے لگاتا ہے اور اس کی پیٹھ کو ہلکے ہلکے تھپتھپاتا ہے۔)

(لائٹ آف ہوتی ہے)

پانچواں منظر

(شام کا وقت ہے۔ کملیا جھونپڑی کے باہر درانتی سے لکڑی چیر رہی ہے۔ ٹھاکر منیم کے ساتھ آتا ہے۔ ساتھ میں راکا، دارا اور سیندو بھی ہیں۔ ٹھاکر سیدھا چبوترے پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ غنڈے اس کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کملیا ان سب کو دیکھ کر جھونپڑی میں جانے لگتی ہے۔)

ٹھاکر : (کملیا سے) ٹھہر جا۔۔! (کملیا رک جاتی ہے۔) تیرا گھر والا کہاں ہے؟

کملیا : ندی طرف گیا ہے۔

منیم : ندی طرف گیا ہے یا اس بستی سے ہی بھاگ گیا ہے؟

کملیا : کوئی چوری کی ہے کیا جو بستی سے بھاگے گا۔

منیم : چوری کی ہے تبھی تو پوچھے ہوں۔

کملیا : کوئی نیا ناٹک سوچ کر آئے ہو کیا منیم۔۔؟

ٹھاکر : گستاخ لڑکی۔۔تمیز سے بات کر۔۔ جانتی نہیں سرکاری لال ہمارے خاص آدمی ہیں

کملیا : جانتی ہوں تبھی تو پوچھ رہی ہوں۔

منیم : دیکھا سرکار۔۔دیکھا اس چھوکریا کے تیور۔۔!

ٹھاکر : دیکھ رہا ہوں سرکاری لال۔۔لیکن تیور بدلنا ہم خوب جانتے ہیں۔ پوچھو اس سے کہ

اس کا گھر والا کہاں ہے۔

منیم :سچ سچ بتا کملیا۔۔تیرا گھر والا کہاں ہے۔۔؟

کملیا :اونچا سنائی دیتا ہے تو کانوں کا علاج کراؤ منیم۔۔!

منیم :ابھی تھوڑی دیر میں پتہ چل جائے گا کہ کس کا علاج کیا جائے گا۔۔میرا یا تیرے گھر والے کا۔(ٹھاکر سے) لگتا ہے بھاگ گیا سرکار۔۔!

ٹھاکر :بھاگ کر جائے گا کہاں۔۔ہمارے آدمی چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

کملیا :میں نے کہا نا کہ میرے گھر والے نے کوئی چوری نہیں کی ہے جو بھاگتا پھرے گا۔

منیم :چوری نہیں کی ہے تو کیا ٹھاکر صاحب یہاں تیرا درشن کرنے آئے ہیں۔

کملیا :صاف صاف بتاؤ منیم بات کیا ہے؟

منیم :صاف ہی تو بتا رہا ہوں کہ تیرا گھر والا ٹھاکر صاحب کے یہاں چوری کرتا ہوا دیکھا گیا ہے۔چلانے پر بھاگ کھڑا ہوا۔

کملیا :نہیں۔۔ایسا نہیں ہوسکتا۔۔میرا بھیکو چور نہیں ہوسکتا۔

منیم :ہاں ہاں۔۔تیرا بھیکو چور نہیں ہوسکتا۔چور تو ہم سب ہیں۔

کملیا :ہاں۔۔چور تم سب ہو۔تم لوگ ہم غریبوں کا چین چراتے ہو۔۔ہم غریبوں کا سکون چراتے ہو۔یہاں تک کہ ہماری عزت بھی چراتے ہو۔

ٹھاکر :(غصہ سے) کملیا۔۔!۔۔بند کر اپنی بکواس۔۔ورنہ ہم تیری زبان کھینچوالیں گے۔

کملیا :زبان کھینچوانے،کوڑے برسوانے اور جان لینے کے علاوہ تمھیں آتا ہی کیا ہے ٹھاکر

ٹھاکر :کملیا۔تو ہماری رحم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔

کملیا :یہ کہو کہ تم ہماری غریبی کا ناجائز فایدہ اٹھا رہے ہو۔

ٹھاکر :تیری یہ مجال کہ تو ہم سے زبان لڑائے۔

منیم :یہ ایسے نہیں مانے گی سرکار۔۔اسے بتانا ہی پڑے گا کہ آپ کتنے بلوان ہیں۔

ٹھاکر :ٹھیک ہے۔(غنڈوں سے) راکا،دارا،سینڈو۔گھسیٹ لے چلو اسے کوٹھی۔۔!!

کملیا :خبردار۔۔جو کسی نے مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔

(پاس پڑی درانتی اٹھالیتی ہے) کاٹ کے رکھ دوں گی ایک ایک کو۔

ٹھاکر : خوب ۔۔ بہت خوب ۔۔ہم تمھاری بہادری سے خوش ہوئے ۔لا۔۔اب یہ کھلونا ہمیں دیدے۔یہ تیرے کام کا نہیں۔

کملیا : یہ کھلونا نہیں ہنسیا ہے ہنسیا۔ہم مجوروں کی ساتھی۔جب تک یہ ہمارے ساتھ ہے،کوئی ہمارا بال بھی بانکا نہیں کرسکتا۔

ٹھاکر : شاید تجھے معلوم نہیں کہ ابھی ہنسیا والوں کا راج نہیں ہے۔ہم ٹھاکروں کا راج ہے۔

کملیا : وہ وقت دور نہیں جب ہم ہنسیا والوں کا راج ہوگا۔

ٹھاکر : وہ وقت قریب بھی نہیں جب تم ہنسیا والوں کا راج ہوگا۔اس لئے پھینک دے یہ ہنسیا۔۔اور۔۔چلی چل ہمارے ساتھ۔

کملیا : جب تک یہ ہنسیا میرے ساتھ ہے تم مجھے نہیں لے جاسکتے ٹھاکر۔

ٹھاکر : ٹھیک ہے۔تو پھر ہم تیرا اور اس ہنسیا کا ساتھ ہی ختم کردیتے ہیں۔(ٹھاکر آگے بڑھتا ہے)

کملیا : آگے مت بڑھ ٹھاکر ورنہ یہ ہنسیا تیرے ٹکڑے ٹکڑے کردے گی۔

ٹھاکر : ابھی تیری ہنسیا میں اتنی دھار نہیں پیدا ہوئی ہے جو میرے ٹکڑے ٹکڑے کردیگی۔

کملیا : (چیخ کر) جے ہنسیا۔۔۔!!!!!!!!!!!!!!!!(ٹھاکر پر وار کرتی ہے۔ٹھاکر جھکائی دے کر اس کا وار خالی جانے دیتا ہے اور اس کی کلائی پکڑ لیتا ہے۔اور اسے مروڑ کر درانتی زمین پر گرادیتا ہے۔تینوں غنڈے کملیا کو پکڑ لیتے ہیں۔ٹھاکر زمین پر گری ہوئی درانتی اٹھاتا ہے اور پوری طاقت سے اسٹیج کے دائیں کونے پر پھینکتا ہے۔ویسے ہی بھیکو آتا ہے۔درانتی اس کے پیروں کے پاس گرتی ہے۔بھیکو درانتی کو دیکھتا ہے، ٹھاکر کو دیکھتا ہے،غنڈوں کے چنگل میں پھنسی کملیا کو دیکھتا ہے۔پھر درانتی اٹھا کر وار کرنے کے لئے ٹھاکر کی طرف لپکتا ہے۔)

بھیکو : کمینے کتے۔!(دارا اور راکا کملیا کو چھوڑ کر بھیکو پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اسے قابو میں کرلیتے ہیں۔)

ٹھاکر : اوہ تو نامرد بھی اب مرد بننے لگے ہیں۔

بھیکو : کمینے۔۔نامرد تو تو ہے جو اپنے غنڈوں کے بل پر اتراتا ہے۔نامرد تو تو ہے جو اپنی دولت کے بل پر ہم غریبوں پر راج کرتا پھرتا ہے۔

ٹھاکر : اوہو۔۔تو تو بھاشن دینا بھی سیکھ گیا رے بھیکو۔۔نیتا بننا ہے کیا؟

بھیکو : تیری موت کا ہرکارہ بننا ہے حرامزادے۔۔!

ٹھاکر : چھی چھی۔۔تیرے منہ سے گالی اچھی نہیں لگتی۔۔اور وہ بھی ہمارے لئے۔۔بری بات۔۔بہت بری بات۔۔(دانت پیس کر) یہ ہمیں پسند نہیں۔(منیم سے) سرکاری لال۔۔!

منیم : جی سرکار؟

ٹھاکر : سہلا دی جائے اس حرامخور کی پیٹھ۔۔؟

منیم : نیکی اور پوچھ پوچھ سرکار۔(ٹھاکر ہنٹر سے بھیکو کی پٹائی شروع کر دیتا ہے۔کملیا چلاتی ہے۔مچلتی ہے،ٹھاکر بھیکو کی اتنی پٹائی کرتا ہے کہ وہ بےہوش ہو جاتا ہے۔)

ٹھاکر : پڑا رہنے دو اس حرامزادے کو۔۔چلو۔۔لونڈیا کو اٹھا لے چلو۔!

(سب کملیا کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔) بھیکو دھیرے دھیرے ہوش میں آتا ہے۔ادھر ادھر دیکھتا ہے۔کملیا کو نہ پا کر وہ اسٹیج کے چاروں طرف دیوانہ وار لپکتا ہے۔پھر اپنی بے بسی ارو بے کسی پر اسے جھنجلاہٹ ہوتی ہے اور وہ اپنے بال نوچنے لگتا ہے۔پھر اپنی بے بسی کا درد مٹانے کے لئے ہوا میں ہی اس طرح مکے چلانے لگتا ہے جیسے وہ ٹھاکر اور اس کے غنڈوں کی پٹائی کر رہا ہے۔پھر درد سے کراہتے ہوئے دوبارہ بےہوش ہو جاتا ہے۔

(لائٹ آف ہوتی ہے)

چھٹا منظر

(لائٹ آن ہوتی ہے۔رات کا وقت ہے۔بھیکو گھٹنوں میں سر دبائے اداس بیٹھا ہے۔اس کے پاس بھیوا،کلوا،منگلیا اور للو بیٹھے ہوئے ہیں۔)

بھیوا :کاہے رے بھیکو۔۔کاہے تونے ہجور سے لڑائی کی؟

منگلیا :اپنا نہیں تو ہمارا ہی خیال کیا ہوتا۔

کلوا :سالا۔۔پھوکٹ میں ہماری بھی جان آفت میں ڈالے ہے۔

بھیکو :(جھنجلا کر) چپ رہو۔۔میں کہتا ہوں چپ رہو۔تم سب بزدل ہو۔۔ڈرپوک ہو۔کائر ہو۔ظلم سہتے ہو اور چپ رہتے ہو۔۔اتیاچار سہتے ہو اور چپ رہتے ہو۔۔مار کھاتے ہو اور اف تک نہیں کرتے۔۔مگر یاد رکھو۔۔ظلم کرنے سے بڑا پاپ ظلم سہنا ہوتا ہے۔

منگلیا :دھیرے بول بھیکو۔۔دھیرے بول۔ٹھاکر کے آدمیوں نے سن لیا نا تو تیرے ساتھ ہماری بھی شامت آجائے گی۔

بھیوا :ہماری بھی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔

للو :وہ ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔

کلوا :ہمیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کے پھینک دیں گے۔(بھیکو ہنستا ہے)

بھیوا :کاہے رے بھیکو ۔۔ ہنسے کا ہے ہے؟

بھیکو :تم اپنے آپ کو زندہ سمجھتے ہو ۔۔ اپنے آپ کو جیوت سمجھتے ہو ۔۔ ارے تم سب مردہ ہو مردہ۔تمھارا دل ۔۔تمھارا دماغ ۔۔ تمھاری آتما ۔۔ سب مردہ ہیں ۔تم سب مرے ہوئے ہو، ورنہ اس طرح ظلم سہہ کر چپ نہیں رہتے ۔

بھیوا :پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں کرتے بھیکو ۔

بھیکو :تو مگر مچھ کو ختم کیوں نہیں کر دیتے ؟

منگلیا :مگر ہم سے زیادہ بلوان ہے ۔

بھیکو :تو پانی میں رہتے ہی کیوں ہو؟

للو :مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ۔

بھیکو :(جھنجھلا کر) تم اپنے آپ کو مچھلی کیوں سمجھتے ہو ۔ارے تم منش ہو منش ۔۔ منش کی طرح رہو ۔منش کی طرح جیو ۔

کلوا :منش کی طرح جینے کے لئے ہمارے پاس دھن کہاں ہے؟

بھیکو :تمھارے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں ۔ یہ کسی دھن سے کم ہیں ۔اپنے ہاتھ پاؤں چلاؤ ۔ تمھاری مدد کے لئے سرکار ۔

بھیوا :کون سرکار ۔۔؟

منگلیا :ٹھاکر صاحب ۔۔!

بھیکو :تم ٹھاکر کو سرکار کیوں سمجھتے ہو ۔۔؟ ۔۔ ارے سرکار تو ٹھاکر سے کہیں زیادہ بلوان ہے ۔

للو :بھلا ٹھاکر سے بھی بلوان کوئی ہو سکتا ہے کیا؟

بھیکو :ارے تم لوگ ہو کس دنیا میں ۔۔؟ اس چھوٹی سی بستی کو تم اپنی دنیا سمجھتے ہو؟ ارے اس بستی کے باہر ایک وشال دنیا ہے ۔۔ پولس ہے ۔۔ نیم ہے ۔ قانون ہے سرکار ہے ۔

کلوا :اے بھیکو ۔۔ آج کہیں زیادہ بھنگ تو نہیں پی گیا رے ۔۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے؟

بھیوا :نیم ۔۔!

منگلیا : قانون۔۔!!

للو : سرکار۔۔!!!

کلوا : یہ سب نئے نئے شبد کہاں سے سن آیا رے؟

بھیکو : اس دن جو آدمی پولس کی گولی سے مارا گیا تھا اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس بستی سے تھوڑی دور ایک شہر ہے۔ اس شہر میں وشال بھون ہے۔ اس میں سرکار رہتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں سرکار نے ایک اعلان کیا تھا۔

بھیوا : اعلان۔۔؟

منگلیا : کیسا اعلان۔۔؟ (بیک گراؤنڈ سے سرکار کی آواز گونجتی ہے۔)

بیک گراؤنڈ : ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے بڑی پرسنتا ہو رہی ہے۔ کہ اب ہماری رعایا کو جلد اور صحیح انصاف مل سکے گا۔ اس کے لئے ہم نے اپنے بھون کے دروازے پر ایک بڑا سا گھنٹہ لٹکا دیا ہے۔ جس کسی کو بھی انصاف چاہئے، وہ اس گھنٹہ کو بجا کر ہمیں بلا سکتا ہے۔ ہم گھنٹہ بجانے والے کی فریاد سنیں گے اور اسے انصاف دلائیں گے۔

بھیوا : اس کا مطلب اب ہم ٹھاکر کے اتیا چاروں سے بچ سکتے ہیں؟

بھیکو : ہاں۔۔ یہی تو میں تم لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہوں۔

منگلیا : لیکن انصاف پانے کے لئے ہمیں بستی کے باہر نکلنا پڑیگا۔

للو : بھلا ہم بستی کے باہر کیسے نکل سکیں گے؟

کلوا : ٹھاکر کے آدمی چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

بھیکو : اگر انصاف پانا چاہتے ہو تو ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

بھیوا : بھلا ہم چار پانچ لوگ ان کا مقابلہ کیسے کر پائیں گے؟

بھیکو : ابھی ہم چار پانچ ہیں، لیکن اگر تم لوگ میرا ساتھ دو تو ساری بستی ہمارے ساتھ ہو سکتی ہے۔

للو : بھلا وہ کیسے۔۔؟

بھیکو : ہم سب مل کر بستی کے لوگوں کو سمجھائیں گے کہ ٹھاکر سے بھی بلوان کوئی ہے جو ہمیں اس کے اتیا چاروں سے چھٹکارا دلا سکتا ہے، جیتے جی مرنے سے روک سکتا ہے۔ اگر

ہم نے ایسا نہیں تو آج میری کملیا کی آبرو خطرے میں ہے۔کل تمھاری بہو بیٹیوں کی بھی باری آسکتی ہے۔

بھیوا :نہیں نہیں۔ہم اب ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

منگلیا :ہم ٹھاکر کو دکھا دیں گے کہ اس کے اتیاچار اب ہم اور نہیں سہہ سکتے۔

للو :اسے جتا دیں گے کہ دو وقت کی روٹی کے لئے ہم اپنی بہو بیٹیوں کی آبرو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔

کلوا :اسے سمجھا دیں گے کہ اس کے رحم و کرم پر جینے کے دن اب ختم ہوئے۔

بھیکو :تو آؤ۔۔میری آواز میں آواز ملاؤ۔۔بولو۔۔کرانتی ہے۔۔!!

چاروں :زندہ باد۔۔!!!

بھیکو :اتیاچاری ٹھاکر۔۔!!!

چاروں :مردہ باد۔۔!!!!

بھیکو :ٹھاکر کی غنڈہ گردی۔۔!!!!!

چاروں :نہیں چلے گی۔۔نہیں چلے گی۔۔!!!!!!!

(اسی وقت ٹھاکر کے کئی آدمی بھیکو کی جھونپڑی توڑتے ہوئے آتے ہیں اور ان سب کو گھیر کر زندہ جلانا شروع کر دیتے ہیں۔وہ سب چیختے چلانے لگتے ہیں۔بھیکو کسی طرح ان کے گھیرے سے نکل کر بھاگتا ہے۔اس کے ساری ساتھی دم توڑتے ہیں۔اسٹیج کے ایک کونے پر ہم دکھاتے ہیں کہ بھیکو دوڑ رہا ہے،اور دوسرے کونے پر دکھائیں گے کہ ٹھاکر کملیا کی عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا ہے بھیکو بھاگتے بھاگتے اس بھون کے پاس پہنچتا ہے جہاں سرکار رہتی ہے۔وہ زور زور سے گھنٹہ بجانے لگتا ہے۔گھنٹہ کی آواز سن کر چوکیدار جماہی لیتے ہوئے اس کے پاس آتا ہے۔)

چوکیدار :کیا ہے بے۔۔کیوں اتنی زور زور سے گھنٹہ بجا کر نیند حرام کر رہا ہے؟

بھیکو :مجھے انصاف چاہئے۔۔مجھے نیائے چاہیے۔

چوکیدار :انصاف۔۔؟۔۔نیائے۔۔؟

بھیکو : ہاں ہاں ۔۔انصاف چاہیے۔ نیائے چاہیے۔

چوکیدار : ابے ابھی تجھے انصاف کہاں سے ملے گا؟ ابھی تجھے نیائے کہاں سے ملے گا؟

بھیکو : کیا کہا۔۔ابھی انصاف نہیں ملے گا۔۔ابھی نیائے تجھے نیائے کہاں سے ملے گا۔۔ مگر کیوں۔؟

چوکیدار : پاگل۔۔۔اتنا بھی نہیں جانتا کہ ابھی تو رات ہے۔

(بھیکو کے ہاتھوں سے گھنٹہ کی رسی چھوٹ جاتی ہے۔)

(دوسری طرف ٹھا کر کملیا پر چھا جاتا ہے۔ کملیا کی چیخ نکل پڑتی ہے۔)

بھیکو : کیا کہا۔۔ابھی تو رات ہے۔ابھی انصاف نہیں ملے گا۔۔میں بھی کتنا پاگل ہوں جو ایک پڑھے لکھے کی باتوں میں آ کر بھاگتا ہوا یہاں چلا آیا ہے۔ابھی انصاف کہاں سے ملے گا۔۔ابھی تو رات ہے۔(چلا کر) لیکن کیوں ہے یہ رات۔۔؟۔۔سویرا کیوں نہیں ہوتا؟ سویرا کیوں نہیں ہوتا؟

چوکیدار : ابے ابھی سویرا کہاں سے ہوگا۔۔سویرا ہونے میں ابھی تو بہت دیر ہے۔ بھاگ یہاں سے۔۔!!(زمین پر بیٹھے ہوئے) پاگل کہیں کا۔۔انصاف مانگنے آیا ہے۔۔یہ بھی نہیں معلوم کہ ابھی انصاف کہاں سے ملے گا۔۔ابھی تو رات ہے۔۔!!(جماہی لیتا ہے۔بھیکو مایوس کھڑا رہ جاتا ہے۔)

(پورا اسٹیج اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ دائرہ روشن ہو اٹھتا ہے جس کے نیچے راوی کھڑا ہے)

راوی : (ناظرین سے) سویرا کیوں نہیں ہوتا؟ یہ سوال آج ہم سب کے دماغوں میں صدائے بازگشت کی طرح سنسناتا پھر رہا ہے۔۔پھر بھی ہم اس کا جواب تلاش نہیں کر پا رہے ہیں۔آپ میں سے ہے کوئی ایسا جو اس کا جواب دے سکے۔کوئی ایسا جو رات کو ختم کر کے سویرا لا سکے۔

(ناظرین میں سے ایک نوعمر لڑکا کھڑا ہوتا ہے۔وہ اسکول کے یونیفارم میں ہے۔)

لڑکا : میں ہوں۔۔۔!!

(ہال کی بتیاں جل اٹھتی ہیں۔ناظرین میں سے کئی آوازیں ابھرتی ہیں۔)

ایک : چل بے بیٹھ۔۔یہ تیرے بس کی بات نہیں ہے۔

دو : چل چل بیٹھ جا۔۔بڑا آیا سویرا لانے والا۔

تین : بڑے بڑے بہے جائیں، گدھا بولے کتنا پانی۔

چار : یہ تیرا کام نہیں۔۔چپ چاپ بیٹھ جا۔

لڑکا : کیوں چپ بیٹھوں۔۔؟ آپ لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے اس لئے چپ بیٹھوں۔ارے آپ لوگوں کے بس کی بات اس لئے نہیں ہے کہ آپ لوگ بزدل ہیں۔ ڈرپوک ہیں۔آپ لوگ اندھیرے کے عادی ہو گئے ہیں۔لیکن میں اس اندھیرے کو برداشت نہیں کر سکتا۔میں سویرا لاؤں گا۔۔ضرور لاؤں گا۔آج نہیں تو کل ضرور لاؤں گا، کیوں کہ آج آپ کا ہے۔۔کل میرا ہوگا، مجھ جیسے نڈر لوگوں کا ہوگا۔

راوی : آؤ بچے۔۔میرے پاس آؤ۔تم ضرور سویرا لاؤ گے کیوں کہ تمھارا بچپن بڑا جیالا ہے۔ اور جس دیش کا بچپن جیالا ہو پھر اس کی جوانی کیا ہوگی۔آؤ میرے ساتھ سویرے کی طرف بڑھو۔

(راوی اور لڑکا ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور دونوں ناظرین کے درمیان سے گذرنے لگتے ہیں۔بیک گراؤنڈ سے ٹیپ بجتے لگتا ہے۔)

گیت : ابھی تو رات ہے، لیکن سویرا دور نہیں
وہ کل جو ہوگا ترا اور میرا دور نہیں

ستم کا ظلم کا کب تک چلے گا دور یہاں
مٹے گا مٹ کے رہے گا ستم گری کا جہاں
ستم گروں سے یہ کہہ دو اندھیرا دور نہیں
وہ کل جو ہوگا ترا اور میرا دور نہیں

(جیسے جیسے راوی لڑکے کے ساتھ ہال کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔)

(اسٹیج کا پردہ گرتا جاتا ہے۔)

ہے اور کوئی راستہ

• نورالعین علی

کردار

پہلا آدمی

دوسرا آدمی

چپراسی

چنی

اماں

ابا

خرم

فرحان

طاہر

دونوں جوان

پہلا منظر

(پردہ اٹھتا ہے)

(**ایک آفس کا منظر**۔ایک میز پر کچھ فائل اور دوسرا سامان جو،عموماً آفس میں ہوتا ہے۔
میز کے ایک طرف دو کرسیاں ان پر دو آدمی بیٹھے ہیں۔تیسری خالی کرسی میز کی دوسری
طرف ہے۔ایک شیلف پر بہت سی فائلیں رکھی ہوئی ہیں)۔

پردہ اٹھتا ہے تو ایک آدمی اٹھ کر شیلف کی طرف جاتا ہے وہاں سے ایک فائل لا کر میز پر رکھ دیتا
ہے۔دوسرا آدمی فائل اپنی طرف سرکا کر،اسے مسکرا کر کھولتا ہے۔اس میں سے ایک
فارم نکال کر ایک نظر ڈال کر میز پر رکھ دیتا ہے۔پھر لفافے میں سے تصویر نکال کر غور
سے دیکھ کر مسکراتا ہے۔

پہلا آدمی :دیکھیں اب کون ہے۔

دوسرا آدمی :(تصویر اس کی طرف بڑھا کر)صورت شکل تو خاصی ہے۔

پہلا آدمی :(تصویر دیکھ کر مسکراتا ہے)ہاں فیچرس تو فوٹو جنک ہیں۔

دوسرا آدمی :نام کیا ہے؟

پہلا آدمی :تصویر پلٹ کر نام پڑھتا ہے)شریفہ بی!

پہلا آدمی تصویر کو فارم پر stapler سے لگا دیتا ہے)۔

دوسرا آدمی :آخ!(بناوٹی جھرجھری لیکر کندھے اچکا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے)دادی امّاں،نانی

امّاں کے نام ہوا کرتے تھے، ایسے تو تعجب ہے آج کے زمانے میں بھی شریفہ بی نام کی لڑکیاں موجود ہیں۔ گلف کنٹریز اور پڑوسی ملکوں سے کیسے کیسے تعجب خیز اور ترنم ریز نام ایکسپورٹ ہو رہے ہیں۔ نادیہ، مہوش، گلریز، سنیعہ، سبرینا اور آمرینا۔ ہائے ہائے! مدراس کا بیچ یاد آ گیا۔ یار کیا مزہ آیا تھا۔ اب اِس نئے بیچ کو لے کر مدراس جائیں گے۔ ہم ہوں گے، نیا Batch ہوگا، مرینا Beach ہوگا۔

پہلا : بکواس بند کرو اور اسے بلاؤ۔

دوسرا : (گھنٹی بجاتا ہے۔ چپراسی آتا ہے) سیتا پھل کو بلاؤ۔

چپراسی : کس کو ساب؟

دوسرا : سیتا پھل کو۔

پہلا : سیتا پھل؟ کیا مذاق ہے؟

دوسرا : مذاق نہیں بھئی، حقیقت ہے۔ سیتا پھل کو شمالی ہندوستان والے شریفہ کہتے ہیں۔ (فارم اٹھا کر تصویر دیکھتا ہے۔) یہ شریفہ بھی پکے ہوئے سیتا پھل کی طرح میٹھی لگتی ہے۔ (چپراسی مسکرانے لگتا ہے۔)

پہلا : (غصہ سے) بتیسی بند کرو اور جا کر شریفہ بی کو بلا کر لاؤ۔

چپراسی : بتیسی بند کرے گا تو بولے گا کیسے ساب؟ (پہلا آدمی بہت غصہ سے چپراسی کو دیکھتا ہے۔ چپراسی جلدی سے باہر نکل جاتا ہے)

پہلا : نوکروں کے سامنے تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔

دوسرا : ہمارے کاروبار کی غیر سنجیدگی سے نوکر بھی واقف ہیں، ان سے کیا چھپانا! (چنی اندر آتی ہے اپنی فائل میز پر رکھ دیتی ہے)

دوسرا آدمی : بیٹھیے!

چنی : تھینک یو سر!

پہلا آدمی : آپ کامرس کے سیکنڈ ایئر میں ہیں؟

چنی : یس سر!

دوسرا :تعلیم ادھوری چھوڑ کر نوکری کیوں کرنا چاہتی ہیں؟

چنی :مالی مشکلات کی وجہ سے، ویسے میں تعلیم ادھوری نہیں چھوڑوں گی، پرائیویٹ امتحان دیتی رہوں گی۔

پہلا :تو پھر آپ تو ہمارے آفس کے کام کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکیں گی۔

چنی :جی نہیں، سر! ایسا نہیں ہوگا۔ اگر آپ نے یہ جاب مجھے دے دیا تو میں پوری توجہ سے کام کروں گی۔

دوسرا :آپ کے والد؟

چنی :ریٹائرڈ کلرک ہیں۔

پہلا :اور دوسرے فیملی ممبرس؟

چنی :والدہ، چھ بہنیں اور ایک بھائی۔ دو بڑی بہنوں کی شادی ہو چکی ہے۔

دوسرا :بھائی آپ سے بڑا ہے؟

چنی :جی نہیں چھوٹا ہے۔ میرا جڑواں بھائی ہے۔

دوسرا :جڑواں ہے تو پھر چھوٹا کیسے ہوا؟

چنی :جی ......! وہ ......! بات یہ ہے کہ ......! میں پہلے پیدا ہوئی تھی۔ وہ دس منٹ بعد پیدا ہو......! سب اسے مجھ سے چھوٹا کہتے ہیں، اس لئے میں نے بھی کہہ دیا۔

پہلا آدمی :تو وہ کیوں نہیں کرتا کچھ کام؟

چنی :جی وہ ذرا کمزور ہے، بیمار رہتا ہے اور پھر......!

پہلا :ہوں......! پھر کیا؟

چنی :وہ دو دفعہ بارہویں میں فیل ہو چکا ہے۔

دوسرا : گذارا کیسے ہوتا ہے؟

چنی :بڑی مشکل سے!

دوسرا :میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟

چنی :والد کی پنشن آتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک گیراج میں حساب کتاب لکھنے کا کام

کرتے ہیں۔ تھوڑی بہت تنخواہ وہاں سے مل جاتی ہے۔

پہلا :تو مختصر یہ کہ آپ کو اس جاب کی بے حد ضرورت ہے!

چنی :جی سر......اگر آپ مجھے موقع دیں تو۔

پہلا :(اس کی بات کاٹ کر) موقع دینے کے لئے ہی تو ہم نے آپ کو بلایا تھا۔ مگر افسوس یہ کہ آپ گریجویٹ نہیں ہیں۔ یہ پوسٹ صرف گریجویٹس کے لئے ہے (چنی بہت اداس ہو کر دونوں کو دیکھتی ہے، پھر سر جھکا لیتی ہے۔ دوسرا آدمی اٹھ کر اس کی کرسی کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چنی اسی طرح سر جھکائے بیٹھی ہے۔ دوسرا آدمی ذرا جھک کر چنی سے مخاطب ہوتا ہے۔)

دوسرا آدمی :دیکھئے مس شریفہ! (چنی گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کرتی ہے، دوسرا آدمی دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر اور تھوڑا سا جھک جاتا ہے چنی کا چہرہ اور اس شخص کا چہرہ کافی قریب آ جاتا ہے، اسی وقت کیمرے کے فلیش کی روشنی اور کلک کی آواز آتی ہے۔ بیٹھی رہیئے مس شریفہ! چنی بیٹھ جاتی ہے دوسرا آدمی اب کرسی کے پیچھے سے ہٹ کر سامنے آ جاتا ہے۔ میز کے کونے پر ٹک کر چنی سے مخاطب ہوتا ہے۔)

دوسرا آدمی :اسٹینو ٹائپسٹ کی پوسٹ کے لئے تو ہم آپ کو نہیں رکھ سکتے کیونکہ آپ کوالیفائڈ نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے آفس میں اور بھی بہت سے کام ہیں۔

میں آفس کا ہر کام کر سکتی ہوں۔ آپ مجھے پوسٹ کوئی سی بھی دیں میں اس کے لئے تیار ہوں۔

پہلا آدمی :فائلنگ کر سکتی ہیں آپ؟

چنی :جی ہاں!

پہلا :تو اس شیلف سے وہ فائل ذرا اٹھایئے۔ چنی اٹھ کر جانے لگتی ہے۔ دوسرا آدمی پیر اڑا دیتا ہے۔ چنی لڑکھڑائی جاتی ہے تو میز سے کود کر اسے گرنے سے بچانے کے بہانے، اپنی بانہوں میں لے لیتا ہے۔ اسی وقت پہلا آدمی فوراً فوٹو کھینچ لیتا ہے۔ فلیش کی روشنی ہوتی ہے۔ دوسرا آدمی چنی کو چھوڑ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ چنی حیران، پریشان کھڑی، دونوں کو دیکھ رہی ہے۔)

پہلا آدمی :بیٹھ جایئے مس شریفہ۔

چنی :آپ لوگ...... یہ کیا کر رہے ہیں؟

دوسرا آدمی :آپ کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پہلا آدمی :دیکھئے مس شریفہ...... آفس میں فائلنگ ڈرافٹنگ، ٹائپنگ کے علاوہ بھی اور بہت سے کام دنیا میں ہیں، جو آپ جیسی اسمارٹ لڑکی کرسکتی ہے۔

بس ذرا سی ہمت، ذرا سی Daring ضرورت ہے۔

(چنی باری باری دونوں کو دیکھتی ہے، کچھ بول نہیں سکتی)

پہلا آدمی :آپ بیٹھئے تو سہی۔

دوسرا آدمی :آپ کو والدین بھائی بہنوں کی مدد کے لئے نوکری کی تلاش ہے نا؟

پہلا آدمی :آپ اطمینان سے بیٹھیں تو، ہم آپ کو بتائیں کہ ہم نے آپ کے لئے کیا سوچا ہے !(چنی اسی طرح کھڑی ہے۔ دوسرا آدمی مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

پہلا آدمی :ہمارا بزنس بہت پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں ہمارے کاروبار کی شاخیں ہیں۔

دوسرا آدمی :ہمارے بزنس پارٹنرس میٹنگوں میں شریک ہونے کے لئے دوسرے شہروں سے آتے ہیں۔ ایک آدھ دن قیام کرتے ہیں، پھر چلے جاتے ہیں۔

پہلا آدمی :ان کے قیام کے دوران ان کی مدد کے لئے ہمیں کچھ اسمارٹ سیکرٹریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو یہ جاب ہم آپ کو دے سکتے ہیں۔

(چنی ابھی تک پریشانی کے عالم میں انھیں دیکھ رہی ہے کچھ جواب نہیں دیتی)

دوسرا آدمی :جواب دیجئے...... آپ یہ کام کرنے کو راضی ہیں؟

چنی :کون سا کام؟

دوسرا آدمی :ابھی تو بتایا آپ کو......! باہر سے آئے ہوئے ہمارے پارٹنرس کی سکریٹری شپ!

چنی :سکریٹری شپ میں کام کیا کرنا ہوتا ہے؟

پہلا آدمی :جو بھی وہ کرائیں۔

چنی : پھر بھی...! کچھ تو پتہ چلے کہ وہ عموماً کس قسم کا کام کرواتے ہیں، لیٹر ڈکشن ٹائپنگ...؟

پہلا آدمی : ہاں خیر! یہ کام تو ہوتے ہی ہیں۔ پردیس میں ایک اکیلے مرد کو ایک ساتھی کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔

(گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے) جی...؟ (دوسرا آدمی کیمرے میں سے فوٹو نکال کر چنی کے سامنے میز پر ڈال دیتا ہے۔ چنی فوٹو پر نظر ڈالتی ہے پھر دہشت زدہ سی ہو کر دونوں کی طرف دیکھتی ہے۔ فوٹو اٹھا کر دیکھتی ہے)

چنی : آپ نے.....! آپ نے میری فوٹو کھینچ لی.....، اس طرح اس پوز میں؟

دوسرا آدمی : (اس کے ہاتھ سے فوٹو اچک لیتا ہے) کس قدر اچھا اور نیچرل پوز ہے!

(چنی اس کے ہاتھ سے تصویر لینے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسرا آدمی اپنا وہ ہاتھ پہلے اوپر اٹھاتا ہے پھر تصویر کو سینے سے لگا کر کہتا ہے)

دوسرا آدمی : اب تو یہ ہماری ہو گئی......! آپ بھی ہماری ہو جائیے... مس شریفہ!

(چنی کے حلق سے گھٹی ہوئی سی آواز نکلتی ہے۔ پھر وہ اپنا پرس اٹھا کر تیزی سے باہر چلی جاتی ہے۔ دونوں آدمی بے حد گندی، فاحشانہ مسکراہٹ اور نظروں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔

(دھیرے دھیرے اندھیرا ہو جاتا ہے)

دوسرا منظر

(**اسٹیج پر** بائیں طرف ایک چارپائی پر میلی سی چادر بچھی ہے۔ابا لیٹے ہوئے ہیں۔ایک اسٹول پر کتابوں اور دوسرے سامان کے علاوہ چائے کی پیالی، طشتری سے ڈھکی ہوئی رکھی ہے۔فرش پر کتابیں، کپڑے اور دوسرا سامان بکھرا پڑا ہے اماں آتی ہیں۔)

اماں :اے ہے۔ابھی تک چائے نہیں پی تم نے؟ ٹھنڈی ہوگئی ہوگی۔

(ابا جواب نہیں دیتے، اسی طرح چپ چاپ لیٹے ہیں۔اماں بکھری ہوئی کتابیں سمیٹنے لگتی ہیں۔ساتھ ہی بڑبڑاتی ہیں۔)

اماں :ذرا سلیقہ نہیں ہے کم بختوں کو...کبھی جو اپنی چیزیں ٹھکانے سے رکھ دیں؟

(پکارتی ہیں) چنی، ببو، بجو۔بالی کہاں مرگئیں سب کی سب؟ کھانے کے لئے ہر وقت حاضر اور کام کے لئے غائب۔

ابا :(کروٹ بدل کر، بہت تھکی ہوئی آواز میں) مت کہا کرو یہ بات! پیٹ بھر کے دو وقت کی روٹی تک تو نصیب نہیں ہے معصوموں کو! اور تم کہتی ہو کھانے کے لئے ہر وقت حاضر!

اماں :اُفوہ! یونہی ایک بات کہہ دی میں نے، تم تو بال کی کھال نکالنے لگے۔

(چارپائی کے نیچے سے ایک کتاب اٹھا کر چومتی ہیں، آنکھوں سے لگاتی ہیں)

ہئے ہئے! دیکھا؟ اس کتاب کو کہاں ڈال رکھا تھا کم بختوں نے!

ابا : کون سی کتاب ہے؟

اماں : ''رسول اللہ کی بیٹیاں'' (کتاب کھول کر دیکھتی ہیں) چنی کو پہلا انعام ملا تھا، تقریری مقابلے میں!

ابا : کب؟

اماں : 1985ء میں پانچویں میں تھی۔

ابا : ہاں کوئی نہ کوئی انعام تو اسے ہر سال ملتا ہی رہتا ہے، مگر سب سے بڑا انعام ملنے کی صورت نظر نہیں آتی۔

اماں : اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہی کوئی نہ کوئی راستہ نکالے گا۔ ہمارے بس میں تو کچھ نہیں ہے۔ ارے چائے تو پی لو۔

ابا : بڑی دیر کی رکھی ہوئی ہے۔ (اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ طشتری ہٹا کر پیالی اٹھا کر منہ سے لگاتے ہیں مگر گھونٹ سے پہلے ہی واپس اسٹول پر رکھ دیتے ہیں)

دوسری چائے بنا دو۔ یہ تو بدمزہ ہوگئی۔

اماں : اسی کو گرم کر دیتی ہوں۔

ابا : کیوں دودھ نہیں ہے؟

اماں : چائے کی پتی اور شکر بھی نہیں ہے۔!

ابا : (ٹھنڈا سانس بھر کر لیٹ جاتے ہیں) اچھا اسی کو گرم کر لاؤ۔

اماں : (پکارتی ہیں) چنی......! اے چنی......! چنی......ای......ای!

(خرم داخل ہوتا ہے۔ موجودہ دور کے نوعمر لڑکوں کے پسندیدہ طرز کے بال اور اسی فیشن کے کپڑے پہنے ہوئے، چھوٹے قد کا دبلا پتلا)

خرم : کیوں چلا رہی ہیں اماں؟ سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔

ابا : (اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں) خرم بیٹے تمیز سے بات کرو۔ اماں سے ایسے بات کی جاتی ہے؟

خرم : اور کس طرح کی جاتی ہے۔ اماں تو روز بروز سٹھیاتی جا رہی ہیں۔ صبح خود ہی تو بھیجا چنی

کو انٹرویو دینے۔ کہہ رہی تھیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور اب پکار پکار کے خود ہی سارے محلے کو اطلاع دے دی رہی ہیں۔

(اسٹول پہ سے آئینہ اٹھا کر اس میں اپنا چہرہ دیکھتا ہے، جیب سے کنگھا نکال کر بالوں میں پھیرنے لگتا ہے۔ نئی فلمی دھن پر گنگناتا ہوا، تھرک تھرک کر آئینہ میں ہر زاویے سے اپنا چہرہ دیکھتا ہے۔)

ابا : کیوں جی! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم نے پھر چنی کو کہیں بھیجا ہے؟

(اماں جواب نہیں دیتیں۔ جھاڑو اٹھا کر فرش جھاڑنے لگتی ہیں۔)

ابا : بند کرو...... بند کرو...... تمہیں پتہ ہے گرد سے مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اب دن بھر سانس سینے میں نہیں سمائے گا۔ گیراج میں کام کیسے کروں گا؟

اماں : معاف کر دو۔ (جھاڑو پٹخ دیتی ہیں) آج کل مجھ کمبخت کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا کام کر رہی ہوں اور کیوں کر رہی ہوں؟ لاؤ تمہارے سینے پر تھوڑی سی وکس مل دوں۔ (باہر جانے لگتی ہیں)

ابا : وِکس رہنے دو۔ پہلے میری بات کا جواب دو۔ چنی کو کہاں بھیجا ہے تم نے؟

اماں : میں نے کہیں نہیں بھیجا، خود گئی ہے۔

ابا : اکیلی؟

اماں : نہیں! فرحان کے ساتھ ہے۔

ابا : تم سے کتنی بار کہا کہ چنی کا فرحان سے ملنا جلنا مجھے پسند نہیں ہے۔!

اماں : میری سنتا کون ہے؟ صاحبزادی اپنی مرضی کی مختار ہے۔ صاحبزادے کو تو تم نے دیکھ ہی لیا، ابھی کس طرح بول رہے تھے۔ لوگ گھر کی نوکرانی سے اس سے زیادہ تمیز سے بات کرتے ہیں۔

ابا : خرم! (خرم جواب نہیں دیتا۔ ابا ڈانٹ کر پکارتے ہیں) خرم!

خرم : جی ابا! (ذرا سہما ہوا، باپ کی طرف مڑتا ہے۔)

ابا : معافی مانگو اپنی ماں سے!

خرم :(کنگھا زور سے زمین پر پھینکتا ہے۔)O Shit bloody hell!

(اندر جاتے جاتے مڑ کر اماں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے)Sorry

ابا :ٹھہر جاؤ! ادھر آؤ......! اردو میں معافی مانگو

خرم :(بے حد گستاخانہ لہجے میں)معاف کردو اماں!

ابا :ذرا ہوش میں رہو میاں! اپنی اصل مت بھولو! بارہویں میں دوبار فیل ہونے کے بعد انگریزی کا یہ ایک لفظ اور گالیاں ہی یاد رہ گئی ہیں تمہیں؟ جن سے سیکھ کر آئے ہو، انہیں کو دو یہ گالیاں! یہ شریفوں کا گھر ہے۔ یہاں شریفانہ زبان بولی جاتی ہے۔

(خرم بے حد باغیانہ اور گستاخانہ انداز میں باپ کو دیکھ رہا ہے)

اماں :(ابا سے)اچھا اچھا! بس کافی ہے اتنا۔ (خرم سے) جا بیٹے تو اندر جا۔

ابا :اندر کہاں بھیج رہی ہو؟ کب تک لاڈلے کو آنچل میں چھپاتی رہو گی، صاحبزادے خود کچھ کریں گے یا نہیں۔ (خرم سے مخاطب ہو کر) چنی تمہاری جڑواں بہن ہے وہ بی کام کے سیکنڈ ایر میں ہے اور تم بارہویں میں دو، دو بار فیل ہو رہے ہو۔

خرم :تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ چنی مجھ سے پہلے پیدا ہو گئی تھی۔ میں دس منٹ بعد پیدا ہوا۔ میرا دماغ کمزور رہ گیا۔ مجھ سے پڑھائی نہیں ہوتی!

با :یہ......! یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟

اماں :جو سب کہتے ہیں وہی یہ بھی کہہ رہا ہے۔ جا بیٹے تو اندر جا۔

ابا :اندر نہیں باہر جاؤ پڑھائی نہیں ہوتی تو کوئی کام تلاش کرو۔ مزدوری کرو، پتھر پھوڑ دو حمالی کرو جاؤ......دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔

(ابا چار پائی پر لیٹ جاتے ہیں۔ خرم باہر جانے لگتا ہے۔)

اماں :ارے کہاں چلا بیٹے......؟

خرم :جا رہا ہوں مزدوری کرنے، پتھر پھوڑنے، حمالی کرنے!

(خرم چلا جاتا ہے۔ اماں بے بسی سے اسے جاتا ہوا دیکھتی ہیں پھر بے حد تھکے ہوئے انداز میں چار پائی پر بیٹھ جاتی ہیں۔ کچھ وقفے کے بعد ابا سے مخاطب ہوتی ہیں)

اماں : تم بھی بعض اوقات غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے ہو۔ بھلا اس وقت بچے پر اتنا ناراض ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

ابا : بچہ......؟ اسے زندگی بھر بچہ ہی بنائے رکھنا......! انیس، بیس برس کا جوان لڑکا، نہ اپنی ذمہ داری کا احساس اور نہ اس بات کی غیرت کہ بہن کام کی تلاش میں ماری پھر رہی ہے۔ (اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

اماں : کہاں چلے اب؟

ابا : اب رات کے لئے بھی کوئی کام تلاش کروں گا۔ ہاں تم نے بتایا نہیں، کہاں گئی ہے۔ چنی؟

اماں : مجھے پتہ نہیں؟

ابا : تم نے پوچھا نہیں؟

اماں : پوچھا تھا اسے بھی پتہ نہیں تھا۔ فرحان کسی نوکری کی خبر لایا تھا، بس اسی کے کہنے پر اس کے ساتھ انٹرویو دینے چلی گئی۔

ابا : فرحان! فرحان! تم واقعی سٹھیا گئی ہو۔ اس طرح آزادی سے ہر وقت ملنے جلنے کا نتیجہ کیا ہوگا......! نہیں سوچ سکتیں تم؟

اماں : میری چنی بہت معصوم بچی ہے۔ فرحان بھی بہت نیک لڑکا ہے۔ بری باتیں سوچئے بھی مت، اور پھر......؟

ابا : اور پھر کیا......؟

اماں : میل جول کا نتیجہ اچھا بھی تو ہو سکتا ہے، فرحان کو ہماری چنی کا بہت خیال ہے۔ فرحان کی اماں بھی جب آتی ہیں چنی کی تعریف کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے چنی کو فرحان کے لئے مانگ لیں! (ابا کوئی جواب نہیں دیتے۔ اٹھ کر جانے لگتے ہیں)

اماں : مگر ایسا نہ ہوگا! (ابا باہر جانے لگتے ہیں۔)

اماں : ہمیشہ بری بات سوچتے ہو اور بری فال زبان سے نکالتے ہو۔ (ابا باہر چلے جاتے ہیں، اماں جھاڑو اٹھا کر جھاڑنے لگتی ہیں، آگے آگے چنی اور پیچھے فرحان داخل ہوتے

ہیں۔ چنی آخر چارپائی پر گر جاتی ہے، ہاتھوں میں منہ چھپا کر اوندھی لیٹ جاتی ہے)

فرحان : لیجئے خالہ جان سنبھالیے اپنی صاحبزادی کو!

اماں : (جھاڑو پھینک کر پلنگ کے پاس گئی ہیں) ارے کیا ہوا؟ کیا ہوا چنی......!

(چارپائی پر بیٹھ جاتی ہیں، چنی کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتی ہیں)

چنی!......اسے کیا ہوا فرحان؟

فرحان : ہوتا کیا؟ اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی اس نے۔ اتنا سمجھا بجھا کر لے گیا تھا کہ جس کام کے لیے پوچھیں کہ یہ کرسکو گی تو فوراً کہہ دینا No problem انگلش بولنے کی مشق کرائی تھی۔ تیس چالیس لڑکیاں تھیں، پانچ پانچ منٹ کا انٹرویو تھا۔ اب ان پانچ منٹوں میں اسے کتنی انگریزی بولنی تھی......! بس پانچ چھ جملے......آٹھ دس الفاظ۔ سب یاد کرائے تھے۔ آپ نے تو دیکھا تھا۔ چھ چھ گھنٹے مغز مارا تھا اس کے ساتھ......!

اماں : تو ہوا کیا پھر؟

فرحان : عین وقت پر سب بھول گئی۔ خالہ جان اسے یہاں شہر میں بلایا ہی کیوں آپ نے! وہیں گاؤں میں پھپھیوں کے پاس اچھی رہتی! پچھلے دو سال سے یہاں کالج میں پڑھ رہی ہے۔ کچھ تو بولنا سیکھتی! سوالوں کے جواب میں گنوار دیہاتن کی طرح گردن ہلاتی رہی۔ کبھی دیدے پھاڑے انھیں دیکھتی رہی......کبھی پٹ پٹ پلکیں جھپکاتی رہی...... کیا سمجھ رہی تھی تو؟ وہ ایڈورٹائزمنٹ کی پلکیں جھپکا کر ''میرا والا پنک'' کہنے والی کی طرح تو بھی خوبصورت لگنے لگی ہوگی اس وقت۔ احمق کہیں کی!

(چنی اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہتھیلیوں سے آنسو پونچھتی ہے۔)

چنی : ہاں میں احمق ہوں، گنوار ہوں، دیہاتن ہوں، وہ سب کچھ ہوں جو تم کہہ رہے ہو اور سمجھ رہے ہو۔ بس جاؤ یہاں سے۔ مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اور آئندہ کبھی اس طرح کہیں انٹرویو کے لیے لے گئے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا!

فرحان : آہا، ہا، ہا، ہا......! کیا دماغ ہے، سبحان اللہ! آخر آپ ہیں کون! آسمان سے فرشتے اتر

کے آئیں گے آپ کے لئے خوان میں نوکریاں سجانے !ادب سے آپ کی خدمت میں پیش کریں گے اور آپ ناز فرمائیں (نقل اتارتا ہے) یہ والی نہیں۔ وہ والی دیدو! ہنہہ ...... آئینہ میں صورت دیکھی ہے کبھی؟

(چنی اپنا پرس اٹھا کر پھینک کر اسے مارتی ہے۔ فرحان کرکٹ کے بال کی طرح کیچ کر لیتا ہے)

فرحان : اچھا خالہ جان! جاتا ہوں میں۔ آپ کی اس ناشکری لڑکی کے ساتھ صبح سے مارا مارا پھر رہا ہوں، اور اس نے یہ صلہ دیا...... ! پھینک کے مارا بھی تو خالی پرس ......! (پرس چارپائی پر پھینک دیتا ہے)

اماں : بیٹھو بیٹے۔ چائے تو پی کر جاؤ۔

فرحان : (چارپائی پر چنی کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ چنی اٹھ کر تھوڑی دور جا کھڑی ہو جاتی ہے۔ فرحان کے طرف پشت کئے) جی ہاں خالہ جان! چائے تو ضرور پیوں گا۔ (اماں اٹھ کر اندر چلی جاتی ہیں۔ چنی پیٹھ موڑے کھڑی ہے)

فرحان : چنی ......! اے چنی! (اٹھ کر اس کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے) واقعی احمق ہے تو ......! ذرا سوچ تو اگر اس وقت میں یہ ناٹک نہ کرتا تو کیا تو خالہ جان کی ڈانٹ سے بچ سکتی تھی؟ خالو جان تو پہلے ہی تیرے نوکری کرنے کے خلاف ہیں۔ خالہ جان بھی یہ سوچ کر تجھے نوکری کی تلاش میں جانے دیتیں ہیں کہ ملنی ملانی تو ہے نہیں نوکری، خود ہی تھک کر بیٹھ جائے گی۔ کیوں ہے نا یہی بات؟

(چنی اقرار میں سر ہلاتی ہے)

فرحان : تو چل آنسو پوچھ لے، ہمت مت ہار، میں ہوں نا تیرے ساتھ۔ کچھ نہ کچھ صورت نکالیں گے۔ کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈیں گے...... آ بیٹھ!

چنی : نہیں میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔

فرحان : اپنے لئے بھی لانا۔ تو نے بھی تو صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں۔

(چنی چند لمحے اسے دیکھتی ہے پھر اندر چلی جاتی ہے، فرحان چارپائی پر بیٹھا ادھر ادھر

دیکھ رہا ہے۔ انگلیاں چٹخاتا ہے، گنگناتا ہے، اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

فرحان : چائے بننے میں اتنی دیر! کیا ماں بیٹیاں دونوں آسام چلی گئیں؟ آسام کی تازہ چائے لانے۔ ''واہ استاد نہیں! واہ تاج کہو''۔ ڈپ ڈپ لانے گئی ہیں۔

(چائے کے اور ایک دو اشتہارات دہراتا ہے کہ چنی آتی ہے)

چنی :سوری فرحان! چائے تم اپنے گھر جا کر پی لو۔

فرحان : کیوں، تیرا غصہ ابھی تک نہیں اترا؟ اکیلی اکیلی چائے پی کر آ گئی۔

چنی :(نظریں جھکا کر آہستہ سے) یہ بات نہیں ہے فرحان!

فرحان :پھر کیا بات ہے؟

(چنی جواب نہیں دیتی۔ فرحان کندھے اچکا کر بے بسی کے انداز میں ہاتھ پھیلاتا ہے پھر چارپائی پر سے اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر چلنے کو مڑتا ہے......ایک قدم بڑھتا ہے تو چنی اسے پکارتی ہے۔)

چنی :فرحان! (فرحان رک کر اسے دیکھتا ہے۔ چنی سر جھکائے پیر کے انگوٹھے سے زمین پر لکیریں سی بنا رہی ہے)

فرحان : مجھے دنیا میں اور بہت سے کام ہیں محترمہ شریفہ بی، عرف چنی!

چنی : (نظریں اٹھاتی ہے، خاموش! فرحان جانے کو مڑتا ہے) فرحان اماں نے اخلاقاً چائے کو پوچھا تھا تم سچ مچ راضی ہو گئے۔

فرحان : (بے حد حیرت زدہ! اور شرمندہ ہوسا ہو کر ایک قدم چنی کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر رک کر) ارے......!!

چنی :گھر میں نہ چائے کہ پتی ہے نہ شکر نہ دودھ۔ اماں نے تم سے کہہ تو دیا کہ چائے پی لو۔ پھر اندر جا کر غیرت کے مارے رو رہی ہے!

فرحان : ارے......چنی! (جیب سے پرس نکال کر ہاتھ میں کچھ روپے لئے چنی کی طرف بڑھتا ہے۔ چنی ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتی ہے۔)

چنی :نہیں فرحان نہیں! اتنی ذلت میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔ تمہیں کیا پتہ دل کتنا

کڑا کر کے اپنے گھر کا پردہ کھولا ہے میں نے!

فرحان : (چنی کی طرف بڑھ کر) ''ذلت ......'' ''دل کڑا کر کے'' ''پردہ کھولا ہے'' یہ کیسے الفاظ ہیں چنی میرے اور تیرے بیچ میں یہ ناگوار الفاظ کہاں سے آ گئے......! مجھ سے اپنے گھر کا حال کہنے میں تجھے دل کڑا کرنا پڑا......! تو مجھے اب تک غیر سمجھتی ہے۔ ذلت تیری نہیں، میری ہوئی۔ میں تو سمجھتا تھا...... خیر جانے دو۔ (تیزی سے مڑ کر جانے لگتا ہے)

چنی : ناراض ہو کر مت جاؤ فرحان! سنو تو...... تمہیں قسم ہے میری...... رک جاؤ۔ (فرحان رک جاتا ہے) چنی ٹھنڈا سانس بھرتی ہے) تمہیں کیا خبر فرحان...... جس گھر میں غربت اور غیرت دونوں جمع ہو جائیں اس گھر کے رہنے والے نہ جی سکتے ہیں نہ مر سکتے ہیں۔ آج کے واقعہ کی یاد نہ جانے کب تک اماں کو دہلاتی رہے گی۔ وہ بہت شرمندہ ہیں۔ اور میں۔ اور میں! (رونے لگتی ہے)

فرحان : (گھبرا کر) اچھا اچھا رو مت۔ میں جا رہا ہوں۔ (چنی دھپ سے چارپائی پر گر جاتی ہے۔) دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے گھٹی گھٹی آواز میں رو رہی ہے۔ اماں آ کر اسکے پاس بیٹھی اسے دیکھتی رہتی ہیں۔ پھر اٹھ کر الگنی پر سے کپڑے اتار کر تہ کرنے لگتی ہیں۔ چنی سر اٹھا کر اماں کو دیکھتی ہے، اماں کام میں مصروف ہیں)

چنی : اماں......! (سسکیاں لے رہی ہے۔ اماں آ کر اس کے پاس بیٹھ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتی ہیں، پھر اس کا سر اپنے شانے پر ٹکا اس کے گالوں پر سے آنسوں پونچھتی ہیں۔ چنی کی سسکیاں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ اماں اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھاتی ہیں اور بہت نرمی سے پوچھتی ہیں)

اماں : کچھ بتا تو...... کیا ہوا؟

چنی : اماں! فرحان جو کہہ رہا تھا ایسا کچھ نہیں ہوا۔

اماں : پھر ہوا کیا......؟

(چنی کے چہرے پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔ اماں اٹھ کر اندر جاتی ہیں۔ گلاس میں پانی لے

کر آتی ہیں۔ گلاس میں سے تھوڑا سا پانی چلو میں لے کر چنی کے منہ پر چھینٹے مارتی ہیں، پھر اپنے دوپٹے سے اس کا منہ پونچھ کر گلاس اس کے ہاتھ میں دے دیتی ہیں۔ چنی پانی پی لیتی ہے۔ اماں چارپائی پر بیٹھ کر ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر اس کو اپنے قریب کر لیتی ہیں۔)

اماں : تیرے ساتھ جو بھی ہوا...... چاہے کیسا ہی برا ہوا بتا دے...... مجھے بتا دے بیٹی کیا ہوا؟

چنی : اماں! وہ اچھے لوگ نہیں تھے۔

اماں : کیوں؟ کیا کیا انہوں نے؟ کوئی بدتمیزی کی تیرے ساتھ؟

چنی : (دوسری طرف منہ پھیر کر) ہاں اماں!

اماں : (دہشت زدہ سی ہو کر اپنا ہاتھ چنی کے شانے پر سے ہٹا لیتی ہیں۔ اس کا چہرہ اپنی طرف موڑتی ہیں) کیا کیا انہوں نے؟

چنی : میری تصویریں کھینچ لیں۔

اماں : (اسی دہشت زدہ انداز میں) اور تو نے کھینچنے دیں؟

چنی : میں تو سمجھ ہی نہیں سکی کہ کیا ہو رہا ہے!

اماں : شروع سے بتا کہ تو وہاں گئی تو کیا کیا ہوا؟

چنی : وہ دو آدمی تھے۔ پہلے تو دونوں مجھ سے سوال پوچھتے رہے پھر نہ جانے کب ان میں ایک اٹھ کر میری کرسی کے پاس ذرا پیچھے کو آ کر کھڑا ہو گیا ہے اور مجھ سے کچھ کہا۔ میں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ میری طرف جھک گیا، میں گھبرا کر اٹھنے لگی تو اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب آ گیا تو دوسرے آدمی نے تصویر کھینچ لی۔

اماں : تصویر کھینچ لی! اور تو وہیں بیٹھی رہی؟ اٹھ کر آ کیوں نہیں گئی؟

چنی : اماں...... کہہ تو رہی ہوں کہ میں سمجھ ہی نہیں سکی کہ اچانک جو روشنی ہوئی وہ کیمرے کی فلیش کی روشنی تھی اور کلک کی آواز تو میں نے گھبراہٹ کے مارے سنی ہی نہیں۔

اماں : پھر......؟ پھر کیا ہوا......؟

چنی : پھر وہ آدمی میری کرسی کے پیچھے سے ہٹ کر سامنے کی میز کے کونے پر ٹک گیا پھر دونوں نے باری باری ایک دو سوال کر کے مجھ سے کہا کہ شیلف پر سے فائل اٹھا لاؤ۔ میں فائل لانے کے لئے جانے لگی تو لڑکھڑا کر گرنے کو ہوئی۔

اماں : کیوں ...... ؟ لڑکھڑا کیوں گئی تو؟

چنی : پتہ نہیں اماں ...... اب خیال ہو رہا ہے کہ شاید جو آدمی میز کے کنارے پر ٹکا ہوا تھا اس نے جان بوجھ کر پیر اڑا کر مجھے گرانے کی کوشش کی تھی۔

اماں : تو گر گئی تھی؟

چنی : نہیں اماں، میں گرنے کو ہوئی تو اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ (سسکی لے کر) اور پھر ...... اور پھر دوسرے آدمی نے فوراً تصویر کھینچ لی۔

اماں : (سر پر ہتھوڑ مار کر) ہائے چنی یہ تو نے کیا کیا!

چنی : (اور درد سے رو کر) میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا! میرا کیا قصور؟

(دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھیں ہیں)

چنی : ...... ! ہاں ...... !

اماں : اور کچھ باقی ہے؟ (چنی اثبات میں سر ہلاتی ہے)

اماں : کہہ ڈال ...... جو باقی ہے کہہ ڈال ...... میں نے اپنا کلیجہ پتھر کر لیا ہے۔ سب سہہ لوں گی کہہ ڈال!

چنی : پھر وہ دونوں مجھ سے بیہودہ باتیں کرنے لگے۔ میں انکار کرتی رہی تو انہوں نے وہ دونوں تصویریں نکال کر مجھے دکھائیں ......

اماں : پھر ...... ؟

چنی : بس اماں۔ میں بے تحاشہ بھاگتی ہوئی وہاں سے نکلی۔ گھبراہٹ میں یہ بھی بھول گئی کہ سڑک کی دوسری طرف سامنے والے ریستوران میں فرحان بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ تو اچھا ہی ہوا کہ خود اس نے مجھے دیکھ لیا۔ لپک کر میرے پیچھے آیا۔ پھر ہم دونوں ساتھ آ گئے۔

اماں :فرحان تمھیں وہاں کیوں لے گیا تھا۔ کیا اسے پتہ نہیں تھا کہ وہ کیسے لوگ ہیں؟

چنی :اسے کیا معلوم اماں! اشتہار تو اسٹینیو ٹائپسٹ کا تھا۔

اماں :پھر وہ یہ کیوں کہہ رہا تھا کہ تو انگریزی نہیں بول سکی۔ گنواروں کی طرح سر ہلاتی رہی اس لئے تجھے نوکری نہیں ملی!

چنی :یہ تو میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے انگریزی میں جواب دینا نہیں آیا۔ اس پر غصے میں آکر باقی باتیں اس نے اپنی طرف سے لگا دیں۔

اماں :کیوں؟ تو نے ایسا کیوں کہا؟ اسے بتایا کیوں نہیں کہ وہ کتنے گندے اور ذلیل لوگ ہیں۔

چنی :اسے بتا دیتی کہ کس طرح انہوں نے مجبور کر کے زبردستی میری تصویریں کھینچ لیں تو فوراً جا کر مار پٹائی شروع کر دیتا۔ وہ دو آدمی تھے ان کا چپراسی اور اندر خدا جانے کتنے ہوں گے، فرحان اکیلا! مار پٹائی ہوتی تو بات جانے کتنی بڑھ جاتی۔

اماں ؛ہاں......تو نے اچھا ہی کیا۔ بدنامی تو تیری ہی ہوتی۔ سننے والے یقین تھوڑی کرتے کہ تو انجانے میں وہاں گئی تھی۔ لیکن اب تصویروں کا کیا ہوگا؟

چنی :(رونے لگتی ہے) اماں......میں تو اپنے گھر کی مصیبتوں کا خاتمہ کرنے کے لئے نوکری کی تلاش میں گئی تھی کیا پتہ تھا کہ ایک نئی مصیبت میں پھنس جاؤں گی!

اماں :ہمارے پاس غیرت اور شرافت کے سوا اب بچا ہی کیا ہے بیٹی۔ اسے بھی تو داؤ پر لگا آئی۔

چنی :(اور تڑپ کر روتی ہے) اماں میرا کیا قصور ہے؟

اماں :(رونے لگتی ہیں) ہماری قسمت کا قصور ہے بیٹی (چنی کو گلے لگا کر) چپ ہو جا۔ میں طاہر میاں کو بلواتی ہوں۔ وہ کچھ نا کچھ کریں گے......! تیرے ابا تو تیرے نوکری کرنے کے پہلے ہی سی خلاف ہیں۔ اب تو بھی نوکری کا خیال دل سے نکال دے۔

چنی :(آنسو پونچھتی ہوئی کھڑی ہو جاتی ہے) نوکری کا خیال تو دل سے نکال دوں گی اماں، لیکن بھوک کا احساس پیٹ سے کیسے نکالوں؟ ابا بھی بھوکے گئے ہوں گے آج کام

پر۔ ببو، بٹو، بالی اسکول گئیں ہیں۔ اپنی اپنی کلاس میں پتھر کے بتوں کی طرح خاموش بیٹھی ہوں گی۔ ٹیچر سوال کر رہی ہوں گی......اور میری معصوم بھوکی بہنیں حیران ہوکر انہیں دیکھ رہی ہوں گی اور سوچ رہی ہوں گی کہ یہ کونسی زبان بول رہی ہیں جس میں روٹی کا لفظ ایک بار بھی نہیں آتا۔

اماں :بس کر چنی......چپ ہوجا!

چنی :آپ نے تو رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ اپنے حصہ کی روٹی ولی عہد بہادر شہزادہ خرم کو کھلا دی تھی۔ بھوک کی جھنجھلاہٹ میں صبح ابا سے بلاوجہ ضرور لڑی ہوں گی آپ۔ کیوں اماں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں......؟ (اماں جواب نہیں دیتیں، آنسو پونچھ رہی ہیں۔

(دھیرے دھیرے اندھیرا ہوجاتا ہے۔)

تیسرا منظر

(اماں چارپائی پر چادر بچھا رہی ہیں۔ چنی باہر جانے کے لئے تیار ہوکر آتی ہے۔)

اماں : کہاں جا رہی ہے چنی؟

چنی : انیتا کے ساتھ جا رہی ہوں اماں۔ اگلے مہینے جو ہنڈلوم اور کاٹیج انڈسٹریز کی نمائش لگنے والی ہے، اس میں کام کرنے کے لئے سیلز گرلس کی ضرورت ہے۔ آج ان کا انٹرویو ہونے والا ہے۔ دعا کیجئے کہ میرا سلیکشن ہو جائے۔ کم سے کم دو مہینے کا سہارا تو ہو جائے گا۔

اماں : لیکن آج تو طاہر میاں کے کسی دوست کے گھر والے تجھے دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں۔

چنی : بس کیجئے ماں۔ خدا کے لئے بس کیجئے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے آپ اور ماموں مل کر میری نمائش کرتے ہیں۔ جس طرح قصائی بھیڑ بکری خریدتے وقت اس کی بوٹی بوٹی کی جانچ کرتے ہیں اسی طرح آنے والے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے ہیں۔ مجھے تو ناپسند کر دیتے ہیں مگر ہمارے پندرہ دن کے راشن کے پیسوں سے خریدے ہوئے کباب، سموسے، گلاب جامن خوب ٹھونس ٹھونس کر کھاتے ہیں۔ ہر نوالے کے ساتھ ایک ایک چیز کا نام لیتے جاتے ہیں کہ یہ تو آج کل ہر ایک دیتا

ہے۔کوئی فہرست پیش کر دیتا ہے کہ یہ سب تو آپ اپنی لڑکی کو دیں گے ہی۔ ہمارے لڑکے کو بس پچاس ہزار کیش دے دیجئے۔ کیوں اماں؟ کیوں ہوتا ہے یہ سب بار بار؟ آخر شادی اتنی ضروری کیوں ہے کہ اس کے لئے میں ہر دوسرے تیسرے مہینے یہ ذلت سہوں...لگتا ہے میں بازار میں بکنے والی ایک چیز ہوں جو دکان کے شوکیس میں سجی گاہک کا انتظار کر رہی ہے۔ ایک گاہک آتا ہے۔ آپ مجھے جھاڑ پونچھ کر سجا بنا کر اسے دکھاتی ہیں، وہ ناپسند کر کے چلا جاتا ہے۔ تو پھر مجھے شوکیس میں رکھ دیا جاتا ہے اور میں کسی دوسرے گاہک کا انتظار کرنے لگتی ہوں۔

اماں : (چارپائی پر بیٹھ کر کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہیں) بس کر چنی ......خدا کے لئے چپ ہو جا۔ کیوں تو ایسی باتیں کرتی ہے؟ (چنی پرس چارپائی پر پھینک کر دوزانو بیٹھ جاتی ہے۔ اماں کے کمرے کے گرد ہاتھ بندھ کر ان کی گود میں سر رکھ دیتی ہے۔)

چنی :اماں آپ فکر مت کیجئے۔ بس دو سال کی بات ہے۔ میں بی کام ہو جاؤں گی۔ مجھے کوئی نہ کوئی اچھی سی نوکری مل جائے گی پھر میں زندگی بھر ابا کی، آپ کی اور بھائی بہنوں کی خدمت کرتی رہوں گی۔

اماں : (چنی کا سر اٹھا کر اس کی پیشانی چومتی ہیں) مجھے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ تیری شادی کی عمر نکلی چلی جا رہی ہے۔ کہیں تو بھی اپنی پھپھیوں کی طرح بن بیاہی بوڑھی نہ ہو جائے۔

چنی :بن بیاہی رہ گئی تو کیا ہوا اماں! میری بیچاری پھپھیاں آج سے ستر سال پہلے پیدا ہوئی تھیں۔ جاہل اور غریب تھیں۔ زندگی بھر سب پر بوجھ بنی رہیں۔ جب تک زندہ رہیں گی بوجھ رہیں گی...... میں نئے زمانے کی لڑکی ہوں۔ پڑھ لکھ کر اپنا بوجھ خود اٹھاؤں گی، میں بغیر شادی کے بھی خوش رہوں گی، آپ دیکھ لیجئے گا اماں......!

اماں :نہیں بیٹی۔ نہیں! فطرت کے کچھ قانون ہیں۔ عمر کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ وقت پر ہو جائے تو انسان بڑی خرابی سے بچ جاتا ہے۔ جوانی میں گناہ کی راہ پر قدم اٹھتے دیر نہیں لگتی۔

چنی :اماں گناہ کے لئے بھی پیٹ بھرا ہونا چاہیئے ۔ بھوکے ننگے کیا کریں گے!

اماں نادانی کی باتیں مت کر چنی ۔ طاہر میاں کہہ رہے تھے کہ لوگ بہت نیک اور شریف ہیں ۔ ان کی کوئی مانگ نہیں ہے ۔لڑکے کی عمر ذرا زیادہ ہے ۔ پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے ۔بغیر لین دین کے سادگی سے شادی کرنے کو تیار ہیں ۔

چنی : کیوں اماں...... کیوں آپ مجھے ناگوار بوجھ سمجھتی ہیں ۔

اماں :غریب ماں باپ کے لئے تو یہ بوجھ نا قابل برداشت ہوتا ہے ۔ جیسے بھی ہو ،جتنی جلدی ہو یہ بوجھ اتر جائے تو اچھا ہے ۔

(چنی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے) جیسے بھی ہو ،جتنی جلدی ہو !دو بڑی بہنوں کا بوجھ ......بس اتار دیا اب میں ۔ پھر میرے بعد بتو ...... پھر بتو ...... پھر بالی ......ایک کے بعد ایک ابھی تو آپ کو اور ابا کو چار بوجھ اتارنے ہیں !اچھا اماں ...... میں آجاؤں گی جلدی خدا کرے کہ میرا بوجھ تو آپ کے سر سے اتر جائے (چنی جانے لگتی ہے)اور دیکھ اس ایگزی بیشن کی نوکری میں اگر تجھے رات کی ڈیوٹی ملے گی تو تیرے ابا بالکل اجازت نہیں دیں گے ۔

چنی :نہیں اماں میں رات کی شفٹ نہیں لوں گی ۔

(چنی چلی جاتی ہے)

چوتھا منظر

(اسٹیج کے دوسرے حصہ میں روشنی ہے۔ چنی آتی ہے رک کر پرس میں سے ڈائری نکال کر کچھ پڑھتی ہے، اس کے پیچھے کے ونگ سے دو آدمی باتیں کرتے ہوئے آتے ہیں)

پہلا آدمی : یار کیا ہاتھ مارا ہے سالے نے!

دوسرا آدمی : ہاں میاں، میں بھی دنگ رہ گیا۔ (چنی مڑکر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ دونوں رک جاتے ہیں۔)

چنی : سنئے۔

پہلا آدمی : فرمایئے!

چنی : یہ سوداگر مینشن کہاں ہے؟

پہلا آدمی : سوداگر مینشن......؟

دوسرا آدمی : سوداگر مینشن......وہ تو پیچھے کی طرف ہے۔

چنی : مگر پتے میں تو یہی سڑک لکھی ہے۔

دوسرا آدمی : سڑک تو یہی ہے پر یہ پتہ پرانا ہے۔ ابھی یہ سامنے نئی بلڈنگ بنی ہے۔ سوداگر مینشن اس کے پیچھے آگیا۔ آپ ایسا کریئے......یہ سامنے والی گلی میں سے نکل کر بائیں ہاتھ

کو مڑ جائیے۔ سامنے ایک پان کی دکان......

پہلا آدمی :ابے یار تو خود ساتھ جا کے دکھا دے نا!

چنی :نہیں۔ نہیں میں چلی جاؤں گی۔ آپ تکلیف مت کیجئے۔

دوسرا آدمی : تکلیف کی اس میں کیا بات ہے۔...... آیئے ......!(چنی ذرا ہچکچا رہی ہے) آیئے آیئے دو منٹ کا راستہ ہے۔

پہلا آدمی :ذرا جلدی آنا۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔

(چنی دوسرے آدمی کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ پہلا آدمی سگریٹ سلگا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ ایک دو کش لگا کر سگریٹ پھینک دیتا ہے۔ پھر وہ بھی اس طرف چلا جاتا ہے، جدھر چنی اور دوسرا آدمی گئے تھے۔

چند لمحوں کا وقفہ......

(چنی کے چیخنے کی آواز ''ارے کیا کر رہے ہیں آپ؟ چھوڑیئے مجھے چھوڑیئے......'' ایک لمبی زور کی چیخ ......چنی بے حال بھاگتی ہوئی اسٹیج پر آتی ہے۔ پرس اور دوپٹہ غائب ہے۔ ذرا دیر کو اسٹیج کے بیچوں بیچ کھڑی ہانپتی ہے۔ پھر بھاگتی ہوئی اسٹیج سے باہر چلی جاتی ہے۔

(اسٹیج پر دھیرے دھیرے اندھیرا ہو جاتا ہے۔)

پانچواں منظر

(**گھر والا حصہ روشن** ۔ابا پلنگ پر لیٹے ہیں ۔پھر اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔سانس کی تکلیف کی وجہ سے بے چین ہیں سینے پر ہاتھ پھیر رہے ہیں اماں آتی ہیں۔)

اماں :لو ذرا سا وکس مل لو...... آرام آجائے گا۔

ابا :کہاں سے آئی وکس کی شیشی؟

اماں :چنی لائی کہیں سے!

ابا : میں نے کتنی بار سمجھایا ہے، کہیں سے کچھ نہ مانگو۔ مانگنے والے کی عزت دو کوڑی کی ہو جاتی ہے۔ جو چیز تمہارے پاس نہیں ہے، اس کے بغیر کام چلانا سیکھو!

اماں :ارے دوا ہے ذرا سی۔ بیماری لاچاری میں مانگ لی تو کون سی بے عزتی ہو گئی۔تمہاری بھی عجیب منطق ہے۔

ابا :ایک بار ہاتھ پھیل گیا تو زندگی بھر پھیلا ہی رہے گا۔ عادت پڑ جائے گی مانگنے کی، بے حیائی کی، ہماری عزت، شرافت سب خاک میں مل جائے گی۔(طاہر آتا ہے)

طاہر : آداب آپا۔ آداب دولہا بھائی۔کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ میں نے تو جیسے ہی سنا دوڑا چلا آیا۔

ابا :تم نے کہاں سے سن لیا؟

طاہر : چنی آئی تھی کہنے۔

ابا : (اماں سے مخاطب ہوکر) دوا مانگ کر لائی چنی! طاہر میاں کو بلا کر لائی چنی! ہر کام کے لئے لڑکی کیوں بھاگی پھرتی ہے۔ آپ کے شہزادہ خرم کہاں ہیں؟

اماں : اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

ابا : اس کی طبیعت تو ہمارے ملک کا بجٹ ہو گیا...... کبھی ٹھیک ہی نہیں ہوتا۔

طاہر : یہ خرم...... سچ مچ دائم المریض ہے یا بنتا ہے؟ میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ وہ اچھا ہے، تندرست ہے۔ اسکول کالج جا رہا ہے۔

اماں : اے میاں، اب تمہاری بدگمانی کا تو کوئی علاج نہیں۔ خرم پیدا ہی کمزور ہوا تھا۔ راتوں رات گاؤں سے شہر لا کر Incubator میں رکھا تو جی گیا ورنہ......!

طاہر : ہاں ہاں، سن چکا ہوں یہ قصہ ہزاروں بار۔ چنی پہلے پیدا ہوئی اس لئے ہٹی کٹی ہے خرم دس منٹ بعد پیدا ہوا اس لئے کمزور رہ گیا۔ کب تک اس بات کی آڑ لے کر اپنی ذمہ داریوں سے بھاگتا رہے گا؟

اماں : چنی لاکھ تمھاری لاڈلی سہی مگر خرم بھی سگا بھانجا تمہارا، دشمن نہیں۔ ذرا جا کے دیکھو بخار سے بدن تپ رہا ہے۔

طاہر : اچھا دیکھتا ہوں۔ (اندر جانے لگتا ہے کہ باہر سے آواز آتی ہے" مکرم صاحب...... مکرم صاحب ہیں گھر میں؟'')

ابا : ذرا دیکھنا طاہر میاں کون صاحب ہیں۔ (اماں سے) تم اندر جاؤ۔ (اماں اندر چلی جاتی ہیں۔ طاہر باہر سے دو آدمیوں کو ساتھ لئے آتا ہے۔ ان میں سے ایک آدمی ابا کو سلام کرتا ہے۔ ابا ایک طرف سرک کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔)

ابا : وعلیکم السلام۔ تشریف رکھئے۔ (دوسرے آدمی سے مخاطب ہوکر) تشریف رکھئے صاحب۔

دوسرا آدمی : ہم اِدَر ہیچ ٹھیک ہے!

(پہلا آدمی ابا کے پاس چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر ان کی طرف سرک کر ابا سے

دھیرے دھیرے کچھ کہتا ہے۔ طاہر اندر چلا جاتا ہے۔ ابا پہلے آدمی کی بات غور سے سن رہے ہیں۔ پھر پیچھے کی طرف سرک کر حیرت سے اسے دیکھتے ہیں اور اونچی، غصے بھری آواز میں بولتے ہیں۔)

ابا :آپ کی ہمت کیسے ہوئی مجھ سے ایسی بات کرنے کی!...... چلے جایئے یہاں سے...... ابھی......فوراً......! آپ میرے مہمان ہیں ورنہ آپ کی اچھی طرح خبر لیتا!! خبردار! آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش بھی مت کیجئے۔!!

پہلا آدمی :مکرم صاحب۔ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیے۔ اپنی حالت پر غور کیجئے......!

ابا :کیا ہوا میری حالت......؟ بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لائق اب بھی کمار ہا ہوں۔ بوڑھا ہوں۔ بیمار ہوں مگر بے غیرت نہیں ہوں۔ آپ کیا سمجھ کر میرے پاس آئے۔ فاقوں سے تنگ آ گیا تو اپنی بیوی اور بچوں کو اپنے ہاتھ سے زہر دے دونگا لیکن اپنی بیٹی بیچوں گا نہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے آپ! آئندہ اگر آپ یا اس دلال نے میری دہلیز پر قدم رکھا تو اچھا نہیں ہوگا......!

دوسرا آدمی : چل یار چل۔ کائے کو ان کے لفڑے میں پڑ رئیلا ہے۔ بہت چھوکری ملتی ہے۔ چھوکری لوگ کا باپ ہماری داڑھی میں ہاتھ ڈال کر، خوشامد کر کے چھوکری دیتا ہے۔

(ابا کانپتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسے مارنے کے لئے دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔ پہلا آدمی ایک ہاتھ سے ابا کو روکتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے دوسرے آدمی کو باہر کی طرف دھکیلتا ہے)

دوسرا آدمی :جار ہا ہے۔ جار ہا ہے۔ بڈھا بیمار سمجھ کے چھوڑ دیا نئی تو سمجھ لیتا!

(وہ دونوں آدمی چلے جاتے ہیں۔ ابا کھڑے ہوئے ہیں سارے بدن پر رعشہ طاری ہے۔ اماں آ کر انہیں پکڑ کر چارپائی پر بٹھاتی ہیں۔ ابا سر پکڑے بیٹھتے ہیں۔)

ابا :یا اللہ! میری مجبوری کی داستان اتنی عام ہوگئی۔ کیا تجھے خبر نہیں ہوئی؟

اماں :توبہ کرو، توبہ! خدا کے غضب سے ڈرو۔

ابا :(چارپائی پر لیٹ جاتے ہیں) اب تو میرا پردہ ڈھک لے میرے مالک......!

اماں :......طاہر......اے طاہر میاں!

(طاہر آتا ہے)

طاہر :کیا ہوا آپا؟

اماں :کون لوگ آئے تھے وہ، کیا بات ہوئی جو یہ ایسے کفر کے کلمے زبان سے نکالنے لگے؟

طاہر :پتہ نہیں آپا۔

اماں :(ابا کا کندھا جھنجھوڑ کر) بتاؤ تو کون لوگ تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟

ابا :میرے پرانے واقف کار ہیں۔ محسن نام ہے۔ کچھ دن پہلے ملاقات ہوئی تھی......چنی کے لئے میں نے کہا تھا کہ کوئی مناسب لڑکا ہو تو خیال رکھیں۔

اماں :تو اس میں برائی کیا ہے، اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے ہی کہا جاتا ہے۔

طاہر :تو آج وہ اسی سلسلے میں آئے تھے؟

ابا :ہاں۔

اماں :کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟

ابا :بہت بڑا بزنس مین ہے۔ باہر سے آیا ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔

اماں :اے اللہ تیرا شکر ہے۔ میری چنی کے نصیب تو نے کھول دئے!

ابا :(طنز سے ہنس کر) ہونہہ۔ نصیب کھول دئے!

طاہر :کچھ تفصیل تو بتائیے۔ دولہا بھائی۔

ابا :عرب کا شیخ ہے۔

اماں :عرب کا شیخ......؟

ابا :ہاں۔ جلد سے جلد نکاح کرنا چاہتا ہے۔ بیوی کے لئے ویزا ساتھ لایا ہے۔ نکاح ہوتے ہی مہر کے ایک لاکھ نقد روپے دے دے گا۔

اماں :تو اس میں اتنا بگڑنے کی کیا بات ہے؟

ابا :محسن سے میں نے پوچھا کہ فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرنے والے شیخ تک ان کی پہنچ کیسے ہوئی......وہ دوسرا آدمی جوان کے ساتھ تھا اسی طرح کے کام کرتا ہے۔ کسی اور بڑے

ایجنٹ نے اسے روزانہ اجرت پر اسی کام کے لئے رکھا ہے محسن سے اس کی ملاقات ہوئی تو وہ اسے یہاں لے آئے۔

طاہر :تو اس رشتے پر غور تو کر لیتے۔انکار کرنے کا حق تو ہمارا ہے ہی

اماں :عمر کیا ہے لڑکے کی......؟

ابا :لڑکا......!ساٹھ برس کا ہے!(تھوڑی دیر سب خاموش رہتے ہیں)

طاہر :بیوی کا انتقال ہو گیا کیا؟

ابا :(حقارت سے اسے دیکھتے ہیں) تین بیویاں موجود ہیں!

طاہر :ہوں......!تو چنی شیخ کی چوتھی بیوی ہوتی......!اچھا کیا دولہا بھائی جو آپ نے انکار کر دیا......!

ابا :میاں بیماری نے کمزور اور مجبور کر دیا ہے ورنہ محسن کو اور اس دلال کو دھکے مار مار کے گھر سے نکالتا۔ان کی ایسی حالت بناتا کہ وہ دوبارہ محلے میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکتے!

طاہر :غریبوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے آتے ہیں کمبخت!

ابا :اور وہ لفنگا محسن کہنے لگا چنی نہیں تو بو سہی!

اماں :بوّا ابھی سولہ سال کی بھی نہیں ہوئی!

ابا :(ٹھنڈا سانس بھر کر کھڑے ہو جاتے ہیں) اچھا میاں طاہر چلو۔مجھے ذرا گیراج تک چھوڑ آؤ۔

اماں :تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔آج آرام کر لو!

ابا :چار کنواری بیٹیوں اور ایک بیمار بیٹے کے باپ کو آرام کرنے کا حق نہیں ہے! چلو میاں طاہر۔

طاہر :آپا میں ابھی آرہا ہوں۔

(دونوں چلے جاتے ہیں۔اماں پریشان سی انھیں جاتے دیکھتی ہیں۔پھر سر جھٹکا کر چارپائی پر بیٹھ جاتی ہیں۔چنی آتی ہے۔کھڑی اماں کو دیکھ رہی ہے،اماں کا سر اٹھا کر

اسے دیکھتی ہیں۔)

اماں :کیا بات ہے چنی؟ (چنی جواب نہیں دیتی اماں کو دیکھے جا رہی ہے) تو نے تو سن لیا ہوگا۔ ابھی جو تیرے ابا طاہر میاں کو عرب شیخ کے بارے میں بتا رہے تھے۔

چنی :(گردن ہلا کر ''ہاں'' کا اشارہ کرتی ہے تھوڑی دیر خاموش کھڑی ہے پھر کہتی ہے) اماں......وہ عرب شیخ!

اماں :(اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں گلے سے لگا لیتی ہیں) تو کیوں فکر مند ہوتی ہے بیٹی، تیرے ابا نے انکار کر دیا ہے۔

چنی :(اماں کے کندھے سے الگ ہو کر) مگر اماں......آپ ابا سے کہہ دیجئے میں شیخ کی چوتھی بیوی بنوں گی۔

اماں :چنی......!!

چنی :ہاں اماں......میں شیخ کی چوتھی بیوی بنوں گی۔

اماں :(اسے جھنجھوڑ کر) پاگل ہوگئی ہے تو......تجھے خبر ہے تو کیا کہہ رہی ہے؟

چنی :ہاں اماں......اچھی طرح خبر ہے کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ صرف کہہ نہیں رہی ہوں کر کے بھی دکھاؤں گی......میں شیخ کی چوتھی بیوی بنوں گی۔

(طاہر آتا ہے)

اماں :تو پاگل ہوگئی ہے تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ سوچ تو کیا کہہ رہی ہے۔ ہوش میں آ......!

چنی :ہوش میں ہی تو آ گئی ہوں اماں! ابھی تو آیا ہے ہوش!!

طاہر :کیا بات ہے بھئی کچھ پتہ تو چلے......؟

اماں :تم ہی پوچھو اس سے......تمہاری ہی شہ پر یہ اتنی آزاد خودسَر ہوگئی ہے کہ بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔

طاہر :(تھوڑی دیر چپ چاپ اسے دیکھتا ہے پھر اس کے پاس آ کر دھیرے سے پکارتا ہے) چنی!

چنی :جی ماموں!

طاہر :کیا بدتمیزی کی تو نے اب آپا سے؟ معافی مانگ۔

چنی :بدتمیزی تو کوئی نہیں کی۔ پھر بھی آپ کہتے ہیں تو معاف مانگ لیتی ہوں۔ (ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر) معاف کر دو اماں! (اندر سے خرم کے پکارنے کی آواز آتی ہے۔ اماں......)

اماں :آ رہی ہوں بیٹے......! ادھر خرم کو تیز بخار چڑھا ہوا ہے ادھر اس نے یہ شوشہ چھوڑا طاہر میاں تم ہی سے سمجھاؤ اور کسی کی بات تو یہ مانے گی نہیں......!

طاہر :مگر کیا کیا اس نے؟ یہ بتائیے......!

اماں :کہہ رہی ہے شیخ سے شادی کرے گی۔ شیخ کی چوتھی بیوی بنے گی......!

طاہر :(بے حد حیرت سے) چنی......!

چنی :جی ہاں ماموں۔ میں شیخ کی چوتھی بیوی بنوں گی۔ آپ جا کر محسن صاحب سے کہہ دیجئے کہ وہ اس ایجنٹ سے اور شیخ سے کہہ دے کہ میں راضی ہوں۔

اماں :سن لو طاہر میاں۔ خود سن لیا نا تم نے......!

(خرم کی آواز......''اماں'') آ رہی ہوں بچے! طاہر میاں سمجھاؤ اس بے عقل کو......!

طاہر :چنی تو جانتی ہے کیا کہہ رہی ہے؟

چنی :اچھی طرح جانتی ہوں ماموں! پورے ہوش وحواس میں ہوں۔ میں برضا ورغبت شیخ کی چوتھی بیوی بننا قبول کر رہی ہوں۔ آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ آپ اس کام میں میری مدد کیجئے۔

طاہر :میں تیرا ماموں ہوں چنی......! دشمن نہیں کہ قربانی کا بکرا بنا کر اس قصائی کے حوالے کر دوں!

چنی :قربانی کا بکرا......! آہا (چٹکی بجا کر) اس سے اچھا مصرف اور کیا ہوگا میری زندگی کا......!

طاہر :کیسی پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہے چنی!

چنی : ماموں آپ کو پتہ ہے، آج آپ نے میرے ایک ایسے سوال کا جواب دے دیا جو ہمیشہ سے مجھے الجھن میں ڈالے ہوئے تھے۔

طاہر : کیسا سوال؟

چنی : میں ہمیشہ سے سوچتی تھی کہ آخر اللہ میاں نے مجھے کیوں پیدا کیا؟ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ میرے وجود کا مصرف کیا ہے؟ آج آپ نے بتا دیا۔

طاہر : بیٹھ جا چنی...... اس وقت تیرے دماغ پر بہت تناؤ ہے، بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔

چنی : نہیں ماموں...... اچانک بہت سے جالے جو دماغ میں تنے ہوئے تھے وہ صاف ہو گئے۔ بالکل تناؤ نہیں ہے...... !اچھا یہ بتایئے آپ کو پتہ ہے میرا نام چنی کس نے رکھا؟

طاہر : چنی تیرا پیار کا نام ہے، عرف ہے! آپا یا دولہا بھائی نے رکھا ہو گا اور کون رکھتا۔

چنی : آپا اور دولھا بھائی !ہنہہ...... (طنز سے ہنستی ہے) میری پیدائش کے چند گھنٹے بعد ہی مجھے گاؤں میں چھوڑ کر شہزادہ خرم کو لے کر شہر آ گئے تھے ابا تو...... تین دن بعد اماں بھی شہر پہنچ گئیں...... جس ہاسپٹل کے incubator میں خرم تھے وہیں اماں کو بھی داخل کیا گیا۔

طاہر : اور تو...... خیر یہ قصہ تو میں ہزار بار سن چکا ہوں۔ تو تو مجھے اپنے نام کے بارے میں بتا رہی تھی۔

چنی : ہاں...... !میری اور خرم کے پیدائش کے وقت جو دائی آئی تھی۔ اس کی بیٹی کا نام منی تھا۔ اس نے مجھے چنی کہنا شروع کر دیا۔ بس میں چنی ہو گئی۔

طاہر : مگر تیرا نام ''شریفہ'' تو شاید دولہا بھائی نے اپنے خاندان کی کسی بزرگ خاتون کے نام پر رکھا ہے۔

چنی : (ہنس کر) نہیں ماموں...... چھ برس کی عمر تک چنی تھی صرف !پھر بڑی پھپھو نے پڑوس کے ایک شخص کے ساتھ گاؤں کے اسکول میں داخلے کے لئے بھیجا۔ بڑی استانی جی نے نام پوچھا۔ انہوں نے چنی بتایا۔ تو اس رحم دل استانی نے اپنی اماں کا نام مجھے

دے دیا۔اس طرح میں شریفہ بی عرف چنی بن گئی۔

طاہر :ارے یہ تو آج تک کسی نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا!

چنی :بتاتا کون؟ ماں باپ کے لئے میرا وجود اتنا اہم کہاں ہے؟ ماموں اگر آپ مجھے گاؤں سے یہاں لاکر میری پڑھائی کا انتظام نہ کرتے ،میرا خرچ نہ اٹھاتے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ابا اماں مجھے یہاں بلاتے ؟

طاہر : کیوں نہ بلاتے ؟......آخر تو ان کی اولاد ہے۔

چنی :اولاد......! ماموں لوگ تو اپنے کتے بلیوں تک کے اچھے اچھے نام رکھتے ہیں۔میرے ماں باپ نے میرا نام کیوں نہیں رکھا؟

طاہر : کیوں پرانی باتیں یاد کر کے اپنے کو اذیت دے رہی ہے۔بھول جا یہ سب باتیں۔

چنی : میں خرم کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئی اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں خرم سے پہلے پیدا ہوئی ،اس کی ذمہ دار میں کیسے ہوئی ؟ میں تندرست ہوں خرم بیمار رہتا ہے، اس کے لئے مجھے مجرم کیوں سمجھا جاتا ہے ماموں؟

طاہر :ان سب باتوں کا تیری شیخ سے شادی کا کیا تعلق ہے چنی؟

چنی : بہت زیادہ تعلق ہے ماموں......! میرا ناکارہ وجود اور کسی کام کا نہیں ،قربانی کا بکرا تو بن سکتا ہے......!

طاہر :پتہ بھی اس کی عمر ساٹھ برس کی ہے؟

چنی : اور آپ کے دوست کا بھائی جو اس دن آیا تھا......! ارے وہی جو ایک بیوی کو طلاق دے چکا ہے، اس کی عمر پچاس برس ہے اور پچاس ہزار روپے کیش مانگ رہا ہے۔

چنی :تو کیا ہوا......؟ میں شیخ کی چوتھی بیوی بن جاؤں گی......!

طاہر :شیخ ایک دو سال بعد تجھے طلاق دیدے گا۔

چنی :تو کیا ہوا......! شیخ کے ملک میں مطلقہ کو حقارت سے نہیں دیکھا جاتا......میں وہیں کسی دوسرے شیخ سے شادی کرلوں گی (ذرا آہستہ سے) اور ہوسکتا ہے وہ ساٹھ برس کا نہ ہو۔ ینگ ہو......!

طاہر : تجھے ماموں کے سامنے ایسی بات کہتے شرم نہیں آتی چنی؟

چنی : آتی تو ہے ماموں ......مگر کیا کروں ......کوئی سہیلی بھی تو نہیں ۔کس سے کہوں ......ایک فرحان تھا......!

طاہر : ہاں ایک فرحان تھا......میں تو سمجھتا تھا کہ......!

چنی : ہاں......میں بھی سمجھتی تھی کہ......مگر......!

(چنی اور ماموں فریز freeze اس جگہ روشنی کم۔ پھر بالکل اندھیرا......اسٹیج کے دوسرے حصہ میں روشنی......وہاں سے ایک ونگ سے فرحان اسٹیج پر آتا ہے اس طرف سے چنی بڑھتی ہے)

فرحان : دیکھ چنی تو مجھے غلط مت سمجھ۔ میں بالکل مجبور ہوں ......اماں کسی طرح راضی نہیں ہوتیں......!

چنی : اماں کو راضی کر سکتے ہو فرحان......! کیا میں جانتی نہیں ......تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتیں......یہ کہو کہ تم خود جہیز کی لمبی چوڑی فہرست اور ایک لاکھ کیش کا وعدہ سن کر پھسل گئے۔

فرحان : دیکھ چنی......فضول باتیں مت کر......تو تو میرے خیالات سے واقف ہے۔ بیوی کے جہیز اور سسرال سے ملے ہوئے پیسوں پر عیش کرنے والوں کو میں نامرد سمجھتا ہوں۔

چنی : تو آج تمہاری مردانگی کو کیا ہوا......؟

فرحان : اماں کو دکھی نہیں کر سکتا میں......!

چنی : تو رومانس کرنے سے پہلے بھی اماں سے پوچھ لیا ہوتا بچے......!

فرحان : رومانس ......!اور تجھ سے ......! کوئی اندھا ہی کر سکتا ہے، معمولی شکل وصورت، پرانے فیشن کے جھاڑ جھلا کپڑے......کوئی تجھے منہ نہیں لگاتا تھا، اکیلی ادھر ادھر ڈولتی پھرتی تھی، مجھے تجھ پر ترس آ گیا اس لئے ملنے جلنے لگا تھا......! (چنی آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیتی ہے اور اسے زور سے جھنجھوڑتی ہے)

چنی : نیچ.....ذلیل، کتے.....ترس آیا.....تجھے مجھ پر ترس آیا.....!

فرحان : (گریبان چھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹتا ہے) پاگل کتیا کی طرح کاٹنے کو دوڑ رہی ہے۔ (الٹے پیروں پیچھے ہٹتا ہے) اچھا ہوا اماں راضی نہیں ہوئیں ورنہ میں تو پھنس جاتا.....! (فرحان چلا جاتا ہے۔ چنی کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلتی ہیں پھر وہ نیچے اکڑوں بیٹھ کر گھٹنوں پر سر ٹکا کر سسکیاں لیتی ہے۔ روشنی ہلکی ہو جاتی ہے۔ ایک ونگ سے اماں نکل کر آتی ہیں۔ چنی کو پکڑ کر کھڑا کرتی ہیں۔ اپنے آنچل سے چنی کے آنسو پونچھتی ہیں۔ ہاتھ سے اس کے بال سنوارتی ہیں۔ دوسرے ونگ سے ابا نکل کر آتے ہیں۔ چنی کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ تیسرے ونگ سے ایک نوجوان نکل کر آتا ہے۔ اماں چنی کے سر پر آنچل ڈال کر چنی کا منہ اس نوجوان کی طرف موڑ دیتی ہیں۔ نوجوان چنی پر نظر تک نہیں ڈالتا، جیب سے ایک فہرست نکال کر ابا کی طرف بڑھاتا ہے)

نوجوان : مجھے یہ سب سامان جہیز میں چاہیے۔ کیش کتنا دیں گے آپ؟ ابا، دونوں خالی ہاتھ اٹھا کر دکھاتے ہیں۔ نوجوان چلا جاتا ہے۔ دوسرا نوجوان آتا ہے۔ اماں پھر چنی کے بال اپنی انگلیوں سے سنوار کر اس کی طرف چنی کا رخ کرتی ہیں۔)

دوسرا نوجوان: مجھے جہیز نہیں چاہیئے۔ بس گریجویٹ اسٹڈیز کے لئے میرے امریکہ جانے اور وہاں رہنے کا خرچ آپ اٹھا لیجئے۔ تو میں آپ کی لڑکی سے شادی کر لوں گا۔ پھر آپ اسے بھی میرے پاس امریکہ بھجوا دیجئے گا۔ سمپل.....! ہیں.....؟؟؟ (ابا پھر خالی ہاتھ اٹھا کر دکھاتے ہیں۔ یہ نوجوان بھی چلا جاتا ہے۔ تیسرا نوجوان آتا ہے۔ اماں پھر چنی کا آنچل درست کر کے اسے پیش کرتی ہیں)

تیسرا نوجوان: میں ان لالچی لوگوں میں سے نہیں ہوں، جو جہیز کا سامان یا کیش مانگتے ہیں۔ آپ مجھے کچھ مت دیجئے۔ بس اپنی بیٹی کو ایک فلیٹ دے دیجئے۔ آخر آپ کی بیٹی ہی تو رہے گی اس میں.....! (ابا ہاتھ اٹھا کر دکھاتے ہیں)

نوجوان : نہیں تو جانے دیجئے (چلا جاتا ہے)

(چنی فریز freeze اماں، ابا واپس......اندھیرا......پھر اسٹیج کے، گھر والے حصے میں روشنی......)

طاہر : (آگے بڑھ کر چنی کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں) ہماری قوم کے نوجوان بے غیرت، بے حیا ہو گئے ہیں۔ اپنی روزی اپنی محنت سے کمانے کی بجائے امیر گھر کی لڑکی سے شادی کر کے Easy Money چاہتے ہیں

چنی : تو پھر غریب گھر کی بیٹیوں کے لیے شیخ کی چوتھی بیوی بننے کے علاوہ اور راستہ ہی کیا ہے......؟ ہیں ماموں......! ہے اور کوئی راستہ......؟

طاہر : تو غریب گھر کی بیٹی ضرور ہے چنی......! مگر پڑھی لکھی، سمجھدار، ذہین اور مضبوط کردار کی لڑکی ہے۔ تو گریجویٹ ہو جائے گی تو تجھے اچھی سی نوکری مل جائے گی ......ہزاروں راستے تیرے لئے کھل جائیں گے۔

چنی : نوکری ڈھونڈھنے کے لئے مجھے گھر سے باہر نکلنا ہوگا ماموں! یہ مردوں کی دنیا ہے۔ اکیلی لڑکی کو زندگی سے لڑتے دیکھ کر مرد اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ پتہ ہے ماموں، آج کل میں گھر سے باہر قدم رکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ ایک گھنے جنگل میں پہنچ گئی ہوں۔ ہر طرف سے بھیڑیے نکل نکل کر آ رہے ہیں......!

(چنی اور طاہر دونوں فریز ہو جاتے ہیں۔ روشنی ہلکی ہو جاتی ہے۔ چنی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اسٹیج کے بیچوں بیچ آ جاتی ہے۔ ایک ونگ سے وہ دونوں آدمی نکل کر آتے ہیں جن کے پاس چنی انٹرویو دینے گئی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں کیمرہ ہے۔۔ دونوں چنی کے اردگرد چکر لگا رہے ہیں۔ ایک تصویر کھینچتا ہے، دوسرا بار بار کہتا ہے ''کس قدر اچھا اور نیچرل پوز ہے''۔ ''آپ جیسی اسمارٹ لڑکی بہت کچھ کر سکتی ہے'' یہ دونوں آدمی واپس چلے جاتے ہیں۔ پھر وہ آدمی آتے ہیں، جن سے چنی نے راستہ پوچھا تھا۔ وہ دونوں بھی چنی کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے ''یہ سامنے والی گلی میں سے نکل کر بائیں کو مڑ جائیے۔'' چنی زور سے چلاتی ہے! مجھے جانے دو......! مجھے چھوڑ دو...... جانے دو......دونوں آدمی چلے جاتے ہیں۔ اچانک روشنی تیز ہو جاتی ہے۔ آوازیں

بند۔ (طاہر، اپنی جگہ سے چل کر اسٹیج کے بیچ میں چنی کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

طاہر : چنی گھبرا مت! ہمت سے کام لے!

چنی : بڑی ہمت سے کام لے کر ہی تو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں شیخ کی چوتھی بیوی بنوں گی ...... ماموں پتہ ہے ابا کو ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میرے قدم گناہ کی راہ پر نہ اٹھ جائیں ۔اماں کو ڈر لگا رہتا ہے کہ میں اپنی دونوں پھپھیوں کی طرح بن بیاہی بوڑھی نہ ہو جاؤں ...... اور ماموں مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ میری تینوں چھوٹی بہنوں کو بھی وہی نہ سہنا پڑے جو میں سہہ رہی ہوں ...... میں آج شیخ کی چوتھی بیوی بننے پر مجبور ہوں ...... میری بہن ہو چودہ برس کی ہے، ایسا نہ ہو کہ چار برس بعد کوئی شیخ اسے بھی چوتھی بیوی بنانے آ جائے اور پھر ... اور پھر ایسا نہ ہو ماموں کہ بٹو اور بالی کا بھی یہی مقدر ہو ...... مجھے ڈر لگتا ہے ماموں ...... مجھے لگتا ہے کہ میں ایک جنگل میں ہوں۔ اس جنگل کے شیر، بھیڑیے، تیندوے لکڑ بگھے، بھیس بدل بدل کر مفلسی، بیکاری، بیماری اور لاچاری کے روپ میں مجھے نوچنے پھاڑنے اور نگلنے کو آ رہے ہیں۔ اس جنگل سے نکلنے کا بس یہی ایک راستہ مجھے سجھائی دے رہا ہے ...... آپ کو اور کوئی راستہ دکھائی دے رہا ہو تو بتایئے ...... ماموں بتایئے ... ہے اور کوئی راستہ ......؟ ہے اور کوئی راستہ ...؟ (چنی اسٹیج پر ایک دائرے میں چکر لگا رہی ہے اور کہتی جا رہی ہے ''ہے اور کوئی راستہ'' بیک گراؤنڈ میں سے جنگلی جانوروں کے غرانے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ روشنی دھیرے دھیرے کم ہوتی جا رہی ہے) ......

پردہ گرتا ہے...........!!!!

●●

لنگڑا گھوڑا

• قدیر زماں

کردار

ڈائرکٹر

اس کی بیوی

لیڈی اسٹنوگرافر

ڈرائیور

ڈائرکٹر کے دو بچے،

پروفیسر

کمشنر

جج

ڈاکٹر

لفٹیننٹ کرنل

کلب کا منیجر

اور تین آفس بوائز

پہلا منظر

(ڈائریکٹر کے گھر کا ایک کمرہ)

ڈائریکٹر : **بیگم**،بیگم ذرا سنو تو۔آج صبح سے میرا سر کہیں غائب ہے، ملتا ہی نہیں جانے کہاں رکھ دیا ہے۔

بیگم : (فاصلے سے) ہاں ہاں میں دیکھ رہی ہوں بہت دیر سے آپ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔سمجھی جہاں رکھا ہے وہیں سے آپ اسے تلاش کرلیں گے۔

ڈائریکٹر : ذرا تم میری مدد تو کرو، ورنہ میں آفس کے لیے تیار کیسے ہوؤں گا۔اور اگر سر نہ ملا تو اسکے بغیر آفس کیسے جاؤں گا؟

بیگم : جی ہاں بڑی مشکل ہو جائے گی (ذرا رک کر) نیز آفس کے کام اس کے بغیر چل سکتے ہیں لیکن گھر کا کام کیسے چلے گا۔(اپنے بچوں کو آواز دیتی ہوں) اے بچو تم دونوں یہاں آنا۔ذرا اپنے ڈیڈی کے کمرے میں جا کر دیکھو ڈیڈی نے اپنا سر کہیں رکھ دیا ہے۔ذرا تم دونوں بھی تلاش کرنا۔

پہلا لڑکا : (فاصلے سے آواز آتی ہے) نہیں ممی ہمارے اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔

دوسرا لڑکا : (اسی فاصلے سے) ہم جا رہے ہیں ممی، کبھی کبھی ہمارے ماسٹر صاحب بھی اپنا سر کہیں

بھول جاتے ہیں۔وہ بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔

پہلا لڑکا : ہاں ممی! ڈیڈی سے کہنا کہ وہ آج سر کے بغیر ہی آفس چلے جائیں۔

بیگم : (اپنے آپ سے) مجھے کیا پتہ کون اپنا سر کہاں بھول جاتا ہے؟

ڈائریکٹر : بچوں کو اسکول جانے دو انھیں دیر ہو جائے گی۔

بیگم : میں آئی۔(تیزی سے زینے چڑھنے کی آواز) (پھر قریب پہنچ کر) آپ تیار ہو جائیے۔تب تک میں تلاش کرتی ہوں۔

ڈائریکٹر : ذرا جلدی کرو بیگم۔آفس کی کار لینے کے لیے آتی ہی ہوگی (بیگم کمرے کی ساری چیزوں کو ادھر ادھر کرتی ہے شوہر کا سر تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس عرصے میں دروازے پر آ کر رکنے والی کار کے ہارن کی آواز آتی ہے)
(کسی دراز اور الماری کے کھلنے بند کرنے کی آوازیں)

بیگم : بہت تلاش کیا، ملتا ہی نہیں۔اب دیر ہو رہی ہے آپ چلے جائیے۔واپس آنے تک کسی بھی طرح ڈھونڈ نکالوں گی۔

ڈائریکٹر : تم چاہتی ہو کہ میں اپنے سر کے بغیر آفس چلا جاؤں!

بیگم : اس میں ہرج ہی کیا ہے ایسا کئی بار ہو بھی چکا ہے۔

ڈائریکٹر : یعنی میں سر کے بغیر کئی بار آفس گیا ہوں۔

بیگم : آپ بہت جلد ہر چیز بھول جاتے ہیں۔کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔اور آپ ہی کا کیا ہے کئی لوگ ایسا کرتے ہیں ورنہ اگر سر کی تلاش ہی کرتے رہیں تو بعض اوقات ساری عمر یہ نہ ملے گا۔اور پھر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

ڈائریکٹر : مجھے تم سے اختلاف ہے۔

بیگم : مجھے بھی آپ سے ہے۔

ڈائریکٹر : وہ تو ہوگا ہی!

بیگم : اور ہمیشہ رہے گا۔

ڈائریکٹر : ہاں ٹھیک ہے بیگم رہنے دو۔لیکن اب کام کو آگے بڑھانا ہے ہم لوگ صرف اختلاف ہی

کرتے رہیں گے تو سر کی تلاش کون کرے گا۔

بیگم : (ٹھنک کر) اختلاف کی بات تو آپ نے کی ہے۔

ڈائریکٹر : ہاں میں نے کی ہے۔

بیگم : اور ہمیشہ آپ ہی کرتے رہتے ہیں۔

ڈائریکٹر : چلو بھئی تمھاری یہ بات صحیح ہے۔لیکن بات کو پکڑے رہنے کی تمھاری یہ عادت اچھی نہیں ہے۔

بیگم : جیسے آپ کی ساری عادتیں اچھی ہیں۔کوئی ایک اچھی عادت تو بتلایئے۔

ڈائریکٹر : درست۔میں سرتاپا بُرا ہوں۔

بیگم : کیا میں نے کہا کہ آپ سرتاپا بُرے ہیں۔

ڈائریکٹر : تو پھر ایک بھی عادت کے اچھے نہ ہونے کا کیا مطلب ہوا؟

بیگم : میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔لیکن میں آپ کو اصل بات بتاتی ہوں جو میں شروع ہی سے جانتی ہوں۔میں کہوں تو آپ اس کی تاب نہ لائیں گے۔لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ آپ بڑے غمگین آدمی ہیں۔

ڈائریکٹر : اور کہو۔

بیگم : اور مجھے غمگین آدمی ہرگز پسند نہیں۔

ڈائریکٹر : اور کچھ۔

بیگم : میرا بچپن جس ماحول میں گذرا ہے، وہ بھی بڑا غمگین ہے، اسی لیے غم سے مجھے نفرت ہے۔

ڈائریکٹر : اس کا کیا ثبوت ہے کہ میں غمگین آدمی ہوں۔

بیگم : آپ غمگین نہ ہوتے تو اپنے سر کو کہیں رکھ کر اس طرح بھول نہ جاتے۔غمگین آدمی ہی ایسا کرتا ہے صبح سے اس کی تلاش میں خود بھی پریشان ہیں اور مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ کہتی ہوں آج سر کے بغیر ہی آفس چلے جایئے اور کئی بار آپ جاتے ہی رہتے ہیں، بس اتنی سی بات ہے۔اور آپ مسلسل بحث کیے جا رہے ہیں۔

ڈائریکٹر : بحث میں کر رہا ہوں؟ خیر چھوڑو اس بات کو، تم نے کسی بھلے آدمی کو سر کے بغیر گھر سے

باہر نکلتے دیکھا ہے؟

بیگم : دیکھا ہے، جی ہاں! روز ہی دیکھتی رہتی ہوں۔ کتنے ایسے لوگ ہیں۔ ڈاکٹر، انجینئر، جج، وکیل، سب کو دیکھا ہے۔

ڈائریکٹر : اچھا اب میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔ چلو اب تم ہی چل کر کار میں بٹھا دینا، اور ڈرائیور سے کہنا کہ وہ گاڑی آہستہ چلائے میرا مزاج ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لئے مجھے اپنے اجلاس تک چھوڑے اور آفس کا وقت ہونے پر مجھے واپس لے آئے۔ اور ہاں میرے واپس ہونے تک مہربانی فرما کر میرا سر تلاش کر و ورنہ گھر کے کام بھی چوپٹ ہو جائیں گے۔

بیگم : اچھا، اچھا، اب چلیے تو (دروازہ کھول کر کار تک پہنچنے کی آواز)

(پس منظر میں)

ڈرائیور : آداب عرض ہے صاحب کو اور بیگم صاحبہ کو۔

بیگم : آداب، (کار کا پٹ کھولنے کی آواز) دیکھو ڈرائیور، آج صاحب کا مزاج ٹھیک نہیں ہے گاڑی ذرا آہستہ چلانا۔ اور صاحب کو اجلاس تک تم ہی لے جانا اور آفس کا وقت ہونے پر تم خود ہی لے آنا۔

ڈرائیور : اچھا بیگم صاحبہ۔

پس منظر میں کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز اندھیرا۔ پھر آفس کا کمرہ تھوڑا اسٹیج پر اندھیرا پھر آفس میں روشنی

ڈائریکٹر : ڈرائیور تم نے گاڑی تیز چلائی تھی۔

ڈرائیور : ہاں صاحب آج ذرا تیز چلائی تھی۔

ڈائریکٹر : گھر سے نکلتے میں بیگم صاحبہ نے تم کو کچھ ہدایت کی تھی؟

ڈرائیور : جی صاحب۔ گاڑی آہستہ چلانے کے لیے کہا تھا۔

ڈائریکٹر : تو پھر تم نے تیز کیوں چلائی تھی؟

ڈرائیور : صاحب آپ آفس کو لیٹ ہو گئے تھے۔ ٹائم ملانا تھا صاحب۔

ڈائریکٹر :تو پھر ٹائم ملایا تم نے؟

ڈرائیور :پھر بھی پندرہ منٹ دیر ہوگئی صاحب۔

ڈائریکٹر :تو پھر کیا فائدہ ہوا۔ پانچ منٹ اور دیر ہو جاتی ۔گاڑی تیز چلا کر تم کوئی حادثہ کر سکتے تھے اسکول جانے والے کسی لڑکے کی ٹانگ توڑ سکتے تھے یا سڑک پار کرتی ہوئی کسی بڑھیا کی کمر۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی نوجوان کا سر تمھاری گاڑی کی زد میں آکر پاش پاش ہو جاتا! دراصل تم بڑے سفاک ہو۔ میں تمھارے خلاف کاروائی کرتا ہوں۔

ڈرائیور :(سہم کر) حضور مجھے اس وقت معاف کر دیجئے اگر آپ نے راستے ہی میں ٹوک دیا ہوتا تو میں ایسی جرات کبھی نہ کرتا۔ آپ تو مائی باپ ہیں ۔ یہ ایک غلطی معاف کر دیجئے حضور۔

ڈائریکٹر :میں کہتا ہوں ایسی غلطی تم نے کیوں کی؟

ڈرائیور :سب تو بتلا دیا ہے سرکار۔ لیکن سچ پوچھئے تو ایک اور بڑی وجہ ہے۔

ڈائریکٹر :تو پھر وہ وجہ پہلے ہی کیوں نہیں بتائی؟

ڈرائیور :ڈر تھا سرکار کہ آپ ایسی باتیں نہیں سنیں گے۔

ڈائریکٹر :تو کیا اب ڈر نکل گیا۔ تمھیں اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔

ڈرائیور :سرکار۔ سرکار۔ جب آپ وجہ جان جائیں گے تو شاید آپ مجھے معاف کر دیں گے۔

ڈائریکٹر :پھر، کہو وہ کیا بات ہے؟

ڈرائیور :سرکار یہ بات میرے گھر کی ہے۔

ڈائریکٹر :اپنے گھر کی باتیں یہاں دفتر میں کیوں کرتے ہو۔

ڈرائیور :اس لیے سرکار کہ شاید آپ وہ واقعہ سن کر ہی مجھے معاف کر دیں گے۔

ڈائریکٹر :نہیں۔ تم جیسے سفاک لوگوں کو میں کبھی معاف نہیں کروں گا۔

ڈرائیور :سرکار؟

ڈائریکٹر :تو سناؤ وہ واقعہ کیا ہے۔

ڈرائیور :سرکار، آج سویرے ہی سویرے میری ماں اور میری بیوی میں جھگڑا ہو گیا تھا وہ دونوں

ایک دوسرے کو اذیت پرست کہہ رہے تھے۔

ڈائریکٹر :دراصل اذیت پرست تو تم ہو۔

ڈرائیور :سرکار۔ہم کیسے فیصلہ کریں کہ اذیت پرست کون ہے۔اور کون نہیں۔لیکن سرکار ماں اور بیوی کے جھگڑے میں آج چولہا نہیں جلا ہے۔

ڈائریکٹر :تم اپنی ماں کو اپنی بیوی کے ساتھ کیوں رکھتے ہو۔ماں کو اپنے باپ کے پاس بھجوادو۔

ڈرائیور :میرے باپ کو مرے بہت عرصہ ہو چکا حضور۔

ڈائریکٹر :تو پھر تمھاری ماں کے کوئی بھائی،بہن تو ہوں گے۔

ڈرائیور :ہاں ہیں۔لیکن سب اپنی اپنی الجھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

ڈائریکٹر :تو پھر اپنی بیوی ہی کو اس کے اپنے باپ کے پاس بھجوادو (رک کر) لیکن بیوی کو کب تک باہر رکھو گے (سوچتے ہوئے) تم ان لوگوں کو ڈانٹتے کیوں نہیں ہو۔

ڈرائیور :یہ دونوں ہی مل کر مجھے ڈانٹتے ہیں۔

ڈائریکٹر :تو پھر سنتے رہو ان کی ڈانٹیں۔تم ایک بزدل انسان ہو۔اور جانتے ہو جو آدمی بزدل ہوتا ہے وہ مکار بھی ہوتا ہے۔

ڈرائیور :ماں اور بیوی کی ڈانٹ سن کر چپ نہ رہوں تو کیا کروں۔حضور میں نے بھی انھیں ڈانٹ کر دیکھا لیکن انجام ہمیشہ برا نکلا۔

ڈائریکٹر :اور تم خاموش ہو کہ ان لوگوں کے خلاف مکر و فریب کو جنم دیتے رہے۔

ڈرائیور :میں نے یہ نہیں کیا حضور۔

ڈائریکٹر :جھوٹ کہتے ہو چپ رہنے والے کا ذہن شیطان کی پٹاری ہے جس میں چند تباہ کن اور زہریلے اوزار ہیں اور تم ہی جیسے لوگوں نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کیا ہے۔تم لوگ اگر دنیا کو کچھ دے سکتے ہو تو وہ ایک خوفناک تباہی ہے۔اس کے سوا کچھ نہیں۔

ڈرائیور :حضور میں آپ کے دفتر کا ایک ادنی ڈرائیور ہوں۔

ڈائریکٹر :یہاں کوئی آدمی ادنی نہیں ہے اور تم اس دفتر کو کیا سمجھتے ہو شاید تم اسے بھی ادنی سمجھتے ہو اس لیے کہ یہاں چند میز، چند کرسیاں، کچھ کاغذ کے پرزے اور کچھ روشنائی اور قیمص

پتلون میں کام کرتے ہوئے چند بابا لوگ نظر آتے ہیں اس کے سوا تمھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم نہیں جانتے کہ سیاہی کا ایک قطرہ اور بابولوگوں کا پھٹیچر ذہن ساری دنیا کے لیے تباہی کا سامان پیدا کر سکتا ہے۔ تم ایک جاہل اور ان پڑھ ڈرائیور ہو۔ لیکن میں یہ کیسے جان لوں کہ تم سچ مچ ایک جاہل ہو اور سیدھے سادے آدمی جب کہ تم موٹر گاڑی کو تیز چلا کر کسی کی جان لینے کے در پے ہو۔ اور بیوی کی ڈانٹ سن سن کر مکاری برتتے ہو۔ دراصل تم ایک بہت بڑے فسادی ہو۔ ایک بہت ہی بڑے فسادی۔

ڈرائیور :حضور میرے قصور معاف ہوں، میں اپنے کان پکڑتا ہوں۔ آئندہ سے گاڑی کبھی تیز نہیں چلاؤں گا۔

ڈائریکٹر :نہیں۔ اس سے کام نہیں چلے گا۔ تمھیں ناک رگڑنی ہوگی۔ آفس کے تمام لوگوں کے سامنے اس ذلت کے لیے تم اپنے آپ کو تیار کر لو۔ ورنہ میں تمھیں ایسی سزا دوں گا کہ یہ ذلت اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن ٹھہرو۔، سب کے سامنے ناک رگڑو گے اور چپ ہو جاؤ گے تو پھر تم۔۔ تو پھر تم خاموش رہو خاموش رہ کر تم ایک بڑے فسادی بن سکتے ہو۔ موجودہ حالات سے زیادہ خطرناک فسادی۔ میں ابھی کچھ دیر میں فیصلہ کروں گا تم جا سکتے ہو اور ہاں جاتے ہوئے اس لیڈی اسٹینوگرافر کو یہاں بھیج دینا۔

(دروازے کے پٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز)

لیڈی اسٹینو: گڈ مارننگ سر

ڈائریکٹر :گڈ مارننگ مس، مجھے اس ڈرائیور کے خلاف کاروائی کرنی ہے ایک جواب طلب میمو ٹائپ کر دینا۔

اسٹینو :سر۔ آج ڈرائیور کچھ پریشان دکھائی دیتا ہے۔

ڈائریکٹر :کیوں کیا ہوا تھا اس کو؟

اسٹینو :گیارہ بجے سے موٹر نکالنے سے پہلے وہ میرے پاس آیا تھا سر۔ آج اس کے گھر میں کچھ جھگڑا فساد ہو گیا ہے۔ شاید اس کی ماں نے اس کی بیوی کو مارا ہے۔

ڈائریکٹر :مارا ہے؟

اسٹینو :ہاں سر، مارا ہے اور اس کے بدلے اس کی بیوی نے اس کا سر نکال کر رکھ لیا ہے۔

ڈائریکٹر :یہ تم کیا کہہ رہی ہو مس؟

اسٹینو :ہاں سر، یہ بات مجھے ڈرائیور ہی نے بتلائی تھی۔

ڈائریکٹر :تو تم سمجھتی ہو کہ وہ اپنے سر کے بغیر ہی آفس آیا تھا۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

اسٹینو :ہاں سر، اس میں اچھنبے کی کیا بات ہے؟ اکثر ایسا ہوتا رہا ہے۔ ڈرائیور کی بیوی تو یوں بھی اس کا سر نکال کر چھپا لیتی ہے تاکہ وہ آفس سے نکل کر ادھر ادھر جانے کے بجائے سیدھا اپنے گھر چلا جائے۔

ڈائریکٹر :یہاں کتنے ایسے لوگ ہیں جو بغیر سر کے آفس آیا کرتے ہیں؟

اسٹینو :میں ٹھیک سے تو نہیں بتا سکتی سر، لیکن میں نے تو ایسا کبھی نہیں کیا؟ ویسے میرے ڈیڈی کا خیال ہے کہ میں اپنا سر ہمیشہ اپنے دھڑ سے الگ رکھا کرتی ہوں اور خاص طور پر جب میں اپنے گھر میں ہوتی ہوں تو یہ کبھی بھی میرے ساتھ نہیں ہوتا۔

ڈائریکٹر :تمھاری ڈیڈی کیا کام کرتے ہیں؟

اسٹینو :وہ ایک ریٹائرڈ فوجی آفیسر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میری ممی اگر بچپن میں مر نہ گئی ہوتیں تو وہ مجھے ایک بڑی ڈاکٹر بناتے یا ایک آفیسر۔ کتنا اچھا ہوتا سر اگر میرے ڈیڈی کا ایک سر ہوتا۔ ان کو تو پیدائش ہی میں سر نہ ملا ورنہ آج میں بھی ایک بڑی آفیسر ہوتی۔ میں تو ایک ایک وقت میں تین تین اسٹینو گرافر رکھتی۔ تین مختلف زبانوں کے اسٹونو گرافر جس زبان میں خط آتا اسی زبان میں جواب لکھواتی۔ بس فٹافٹ کام ہو جاتا میری میز پر ایک بھی فائل پڑی نہ ہوتی۔ دیکھئے کتنی ڈھیر سی فائلیں آپ کی میز پر پڑی ہیں۔

ڈائریکٹر :(خفا ہوتے ہوئے) مس؟

اسٹینو :یس سار۔ مجھ سے کچھ غلطی ہو گئی سر؟

ڈائریکٹر :میں۔ میں نے سنا ہے تم روزانہ آفس سے نکل کر گھر جانے کے بجائے کہیں اور جاتی ہو۔

اسٹینو :ہاں سر۔ جاتی ہوں۔ لیکن یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ میرا ذاتی۔

ڈائریکٹر : جانتی ہو۔تم یہاں کی مستقل اورفل ٹائم ملازم ہو۔ میں تمھارے خلاف اس واقعہ کی تحقیقات کرواؤں گا۔

اسٹینو : آپ کو اپنے اختیارات کے بارے میں غلط فہمی ہے سر۔میرا کوئی واقعہ ملازمت سے متعلق نہیں ہے کہ آپ اس کی تحقیقات کروائیں۔

ڈائریکٹر : میں اگر چاہوں تو ایک کمیشن بھی بٹھا سکتا ہوں۔کمیشن بٹھانا میرے اختیار میں ہے یا تمھارے؟

اسٹینو : (روبانسی ہوکر) یہ تو کوئی بات ہی نہیں سر۔ میں تو ہر روز اپنے کرن سے ملنے جاتی ہوں۔لیکن اگر سچ مچ آپ کمیشن بٹھائیں گے۔تو میری بدنامی ہو جائے گی۔اس لیے میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔آئندہ آپ سے کسی طرح کی بحث نہ کروں گی۔ مجھے معاف کردیجے نا سر۔

ڈائریکٹر : ٹھیک ہے۔آئندہ سے ایسی غلطی نہ ہونے پائے۔اب ان فائیلز کو یکے بعد دیگرے پڑھتی جاؤ۔

اسٹینو : (فائیلز اٹھاتی ہے) سر یہ فائیل ہے اس کلرک کی جو دفتر سے مسلسل تین دن سے غیر حاضر ہے اس کی کوئی درخواست بھی نہیں ہے۔

ڈائریکٹر : تو اس پر میرے آرڈرس لکھ دو کہ اس کلرک کو مزید تین دن کی اسپیشل رخصت معہ تنخواہ منظور کی جاتی ہے۔

اسٹینو : ہاں۔اوہ (دوسری فائل اٹھاتی ہے) اور یہ فائل ہے ایک چپراسی کا جو دس منٹ سے یعنی دس منٹ دیر سے آفس آیا ہے۔

ڈائریکٹر : اس کو غیر حاضر لکھ دو۔اور اس کی ایک دن کی تنخواہ کٹ۔دیکھا، مجھے کیا کیا اختیارات حاصل ہیں۔قلم میرے ہاتھ میں ہے۔

اسٹینو : قلم تو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے سر!

ڈائریکٹر : ارے ہاں۔لیکن قلم سے کیا ہوتا ہے سر تو میرا ہے اسے بھی آج گھر ہی پر بھول آیا ہوں۔

اسٹینو : تو آپ بھی کبھی کبھی اپنا سر بھول جاتے ہیں سر؟

ڈائریکٹر : ہاں ہاں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔لیکن اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا کیونکہ مجھے بھی تو اپنی نوکری کا ڈر ہے۔اب تم جا سکتی ہو۔

اسٹنو : تھینک یو سر۔(دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز)

ڈائریکٹر : (ٹیلی فون گھماتا ہے) گھبرائی ہوئی آواز میں ہلو بیگم کیا میرا سر ابھی نہیں ملا۔غضب ہو گیا آج آفس میں ہماری اسٹنوگرافر کو معلوم ہو گیا کہ میں اپنا سر گھر پر ہی بھول آیا ہوں

۔

بیگم : تو کیا ہوا اس قدر گھبرانے کی کیا بات ہے۔لیکن اس کا علم کیسے ہوا۔

ڈائریکٹر : باتوں، باتوں میں میری زبان سے نکل گیا بیگم۔

بیگم : اسی لیے آپ کو آفس جانے کی جلدی تھی کہ وہاں پہنچ کر اسٹینوگرافر سے باتیں کریں۔

ڈائریکٹر : میں نے باتیں کہاں کی ہیں بیگم۔وہ تو........

بیگم : یہ وہ کچھ نہیں اب آپ فوراً گھر چلے آیئے۔اگر آپ کے بڑے آفیسروں کو پتہ لگ گیا تو سر بھول کر آنے کی علت میں آپ کے خلاف کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔

بیگم : اور ہاں سنیے ابھی ابھی کمشنر صاحب کا فون آیا تھا انھوں نے آپ کے آفس بھی فون کیا تھا پھر یہاں گھر پر بھی فون کیا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ آپ آتے ہی آپ کو فوراً کلب بھیج دیا جائے کلب میں آپ کے کئی احباب جمع ہیں۔یہ سب اپنا اپنا سر کہیں بھول گئے ہیں اور اسی لیے وہاں کلب پہنچ گئے ہیں آپ کو بھی فوراً بلایا ہے اور اب آپ کلب پہنچ کر دیکھ لیجئے کہ کیسے کیسے ذہین اور بااثر لوگ اپنے سر کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

ڈائریکٹر : ٹھیک۔تم ٹھیک کہتی ہو اچھا کیا فوراً بتا دیا۔میں کلب جاتا ہوں۔

(وقفہ کلب کا منظر)

(ڈائریکٹر کلب کے ایک گوشے میں داخل ہوتا ہے)

ڈائریکٹر : گڈ نون ٹو ایوری بڈی۔ہاں تو آپ سارے کے سارے لوگ یہاں پہلے ہی اکھٹے ہو چکے ہیں۔پروفیسر صاحب، جج صاحب، کمشنر صاحب، ڈاکٹر، لفٹنٹ کرنل۔

کرنل : (ہنستے ہوئے) ایک ڈائرکٹر کی کمی تھی سو وہ آپ نے پوری کردی۔

کمشنر :ارے بھئی ہمارے کلب کی یہی تو خصوصیت ہے کہ بغیر کسی عہدے کے کوئی شخص اس کا ممبر بن ہی نہیں سکتا۔اسی مسئلہ پر تو پروفیسر صاحب بحث کرنا چاہتے ہیں۔

جج :آج ہم سب ہی لوگ اپنا اپنا سر کہیں کھو بیٹھے ہیں۔گیمس کے لئے دماغ کہاں سے لائیں۔بہتر یہی ہے کہ اس مسئلہ پر پروفیسر صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے وہی کہیں۔یوں بھی وہ ہمیشہ کام کی باتیں ہی کیا کرتے ہیں

ڈاکٹر :پروفیسر صاحب،آج آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

پروفیسر :اپنا سر بھول کر آنے کی وجہ سے آج میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔میں نے ہمارے کلب کے دستور کی ترمیم کے لئے ہمیشہ ہی آواز اٹھائی ہے۔اس وقت میں آپ لوگوں سے انسان اور انسان کی بات کر رہا ہوں اور وہ یہ بات ہے کہ ساری زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے اس کا تعلق انسان کی زندگی سے ہی نہیں بلکہ اس کے جذبۂ تخلیق سے ،تاریخ وفلسفہ سے،ادب وآرٹ سے،عمرانیات ہی کیا،روحانیت سے،خدا سے،اس کی ساری مخلوق سے.....اور.....اور.....کائنات میں ہر موجود ومفقود سے ہے.....

کمشنر :بھئی انھیں کوئی ذرا روکے؛

پروفیسر :اس وقت کوئی کیوں روکے گا۔میں اور بھی کہوں گا۔جو بات کہہ رہا ہوں وہ ہے حشرات الارض کی بات،جانوروں کی اور کیڑے مکوڑوں کی بات۔پریوں اور جنوں کی بات، فرشتوں کی بات۔ارض وسما کی بات۔!ہرمن ویزداں کی بات۔زمان ومکان کی بات...آں...جنگلی سوروں کو زمین کھودتے دیکھا ہے تم نے کبھی؟ گیلی مٹی سے تم نے کبھی کیچوے نکالے ہیں۔انھیں کاٹ کر ان کے ٹکڑے کیے ہیں۔ان ٹکڑوں کو تھرکتا پھڑکتا اور اکڑتا ہوا دیکھا ہے؟ کبھی چوہے کا سر کچلا ہے۔اس کے منہ سے خون ٹپکتے اور اسے تڑپتے اور مرتے دیکھا ہے؟ ایک کتیا رات بھر یا دن میں مسلسل کتنے پلے جنتی ہے؟ اسے دیکھا ہے؟؟ ان میں سے تم اگر کسی ایک بھی تجربہ سے محروم ہو تو تم لوگ مجھ سے بات کرنے کے لائق نہیں ہو۔

کرنل :یہ پروفیسر تو اول فول بکنے لگتا ہے۔

پروفیسر :تم مجھے اول فول بکنے والا کہتے ہو۔ دراصل جو شخص مجھ سے اختلاف کرتا ہے وہ خود ہی جاہل ہو جاتا ہے نااہل ہی نہیں بلکہ (ایک ہی سانس میں) وہ ایک پاپی، چغل خور، مکار، دغاباز، لڑاکو، چور، ڈاکو، زانی، ظالم، قاتل، جاسوس، لچا، لفنگا، رذیل، کمینہ وبدمعاش ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ آدمی اس کے علاوہ بھی کچھ ہوسکتا ہے لیکن وہ ہونا نہیں چاہتا۔!!

جج :پروفیسر اب بند بھی کیجئے یہ تقریر!

پروفیسر :تم نہیں چاہتے کہ آدمی بنو۔ بندگی، غلامی، ذلت، حقارت، بزدلی، حماقت، آرام طلبی، خودنمائی، عیاری۔ اسی کو تم نے اپنا شعار بنالیا ہے۔

جج :پروفیسر صاحب۔ اگر آپ حق پرست اور حق گو آدمی ہیں تو آپ کو ایک اور بات ماننی پڑے گی کہ اس کلب کے ہم لوگ بھی ممبر ہیں۔ بولنا، تقریر کرنا آپ کا حق ہے تو یہ حق ہم سب کو بھی ملنا چاہیے۔

ڈاکٹر :ہاں پروفیسر صاحب۔ دیر سے آپ اکیلے ہی بولتے جارہے ہیں اور آپ نے اس وقت ایسی ایسی باتیں کی ہیں کہ یہاں موجود ہر شخص طیش میں آسکتا ہے۔

کرنل :یہ سچ ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے پر بہت جبر کیا ہے۔

کمشنر :(ایک ساتھ)

ڈاکٹر :اب یہ قصہ ختم کرو۔

جج :بھئی بولنا ہی ہے تو ہم میں سے ہر شخص ایک مقررہ وقت تک بولے گا۔

پروفیسر :وقت کا تعین آپ کیسے کریں گے۔ گھڑی دیکھ کر بھی ہم یہ نہ بتاسکیں گے کہ کسی شخص نے اپنی تقریر میں کتنا وقت ضائع کیا ہے کیوں کہ اس وقت ہمارے سر ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔

کرنل :آپ نہ بولیں تو بہتر ہے۔ آپ تو بہت سارا وقت ضائع کر چکے ہیں۔

جج :حضرات! مناسب یہ ہے کہ ہم لوگ جملوں کی تعداد مقرر کردیں۔

ڈاکٹر :اب زیادہ تقریر کا وقت نہیں ہے۔ ہر شخص کو صرف ایک ہی جملہ کہنے کی اجازت ہو تو بہتر

ہے ورنہ جملوں کا حساب کون لگائے!؟

پروفیسر :جملہ اگر ایک ہی کہنا ہے تو الفاظ کی تعداد بھی مقرر کرنی پڑے گی۔

کرنل :یہ پھر ٹپک پڑے!

پروفیسر :تم مجھ سے کیوں خار کھار ہے ہو کرنل۔ اس پر تو غور ہی نہیں کیا کہ میں نے کتنی معقول بات کی ہے اگر الفاظ میں تعداد کی پابندی نہ ہو تو کوئی شخص ایک ہی جملہ اتنا طویل کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک کتاب بن کر بھی نامکمل رہے گا۔ باقی لوگ تکتے رہ جائیں گے۔ کسی اور کی بولنے کی باری ہی نہیں آئے گی۔

جج :بہتر ہوگا کہ ہم اپنے کلب کے منیجر کی خدمات حاصل کریں۔ اس سے کہیں کہ وہ کوئی خیال کم سے کم الفاظ میں پیش کرے۔ اس کے بعد ہم سب اتنے ہی الفاظ میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

ڈائریکٹر :(ایک ساتھ)

کمشنر :منیجر، منیجر

منیجر :جی میں آپ حضرات کے لیے حاضر ہوں۔

جج :منیجر۔ سنو! ہم جتنے بھی ممبر یہاں بیٹھے ہیں وہ سب اپنے اپنے عہدوں پر فائز ہیں لیکن ہم میں کوئی منیجر نہیں ہے۔ اس کمی کو تم پورا کر رہے ہو۔ تمھاری اس وقت اس لیے ضرورت ہے کہ تم کوئی ایک اچھا سا خیال پیش کرو۔ کم سے کم الفاظ میں تاکہ اس کے بعد ہم سب باری باری سے اپنے اپنے خیالات کو ان ہی مقررہ الفاظ میں پیش کرسکیں۔ اس کے بعد تم فیصلہ کرنا کہ ہم میں سے کس شخص نے سب سے بڑھیا اور عمدہ خیال پیش کیا ہے۔

منیجر :آنریبل ممبر صاحبان۔ میں نے آپ کی گفتگو سنی ہے۔ میں اپنا خیال چند مقررہ الفاظ میں ضرور پیش کروں گا لیکن میں تنہا یہ کیسے فیصلہ دے سکتا ہوں کہ کس آنریبل ممبر کا خیال سب سے بڑھیا اور عمدہ ہے۔

جج :تم اس کے لیے کلب کے بوائز کی مدد لے سکتے ہو۔ چاروں بوائز تمھارے مددگار رہوں

گے۔اس جیوری کے صدر تم ہو گے۔

ڈائریکٹر :بوائز۔

کمشنر :اے بوائز۔

کرنل :بوائز ادھر آنا،تم لوگ ان کرسیوں پر بیٹھ جاؤ۔

بوائز :حضور ہم لوگ ان کرسیوں پر کیسے بیٹھیں۔آپ لوگ بیٹھیں رہیں گے تو سروس کرنا ہی ہمارا کام ہے۔

کمشنر :بوائز چپ رہو اور ہم جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کرو۔

بوائز :ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟

ڈائریکٹر :اس لئے کہ ہم لوگ تمھاری تنخواہیں دیتے ہیں اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تم یہ کرو تو تمھیں وہی کرنا ہوگا۔

جج :منیجر،زیادہ بحث کی ضرورت نہیں تم اپنی کرسی صدارت سنبھالو۔

(کرسیوں پر بیٹھتے ہیں)

منیجر :ہاں تو اب میں اپنا خیال پیش کرتا ہوں۔اس کے بعد سارے ممبر۔اپنا اپنا خیال پیش کریں۔اس سے پہلے کیا آپ حضرات میرے لیے الفاظ کی تعداد مقرر کرنا پسند کریں گے۔

جج :نہیں،یہ بھی تم ہی کرو۔لیکن الفاظ کم سے کم ہوں۔

منیجر :بجا..........تو میں اپنا خیال پیش کرتا ہوں۔

جج :کم سے کم الفاظ میں۔

منیجر :جی ہاں۔مجھے سوچنے کا موقع تو دیجئے.....کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ..........

ڈاکٹر :اس تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔

منیجر :جی........!

کرنل :اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

ڈائریکٹر :تم وقت ضائع کر رہے ہو۔

منیجر :(الفاظ پر زور دے کر) ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔

جج :کیا یہی ہے تمھارا خیال جسے تم ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو۔

منیجر :جی نہیں۔ میں نے تو آپ ہی لوگوں کا جملہ دہرایا ہے۔

ڈائریکٹر :تو پھر اپنی بات جلد کیوں نہیں کہتے؟

منیجر :صرف چند ہی لمحات کے لئے ہم سب چپ رہیں تو بہتر ہے۔

ڈاکٹر :کیا یہی خیال تم پیش کر رہے ہو؟

منیجر :نہیں، نہیں۔ خدا کے لیے مجھے سوچنے دو۔

کرنل :تو پھر جلد سوچتے کیوں نہیں؟

ڈاکٹر :(دوسرے ممبروں سے) حضرات، کیا یہی بات اچھی نہیں ہے، خدا کے لیے مجھے سوچنے دو۔

کرنل :منیجر تم نے بہت اچھا خیال پیش کیا ہے۔ صرف چھ لفظ ہیں۔

منیجر :نہیں، نہیں، خدا کے لیے۔

ڈاکٹر :ارے یہی کافی ہے صرف تین ہی لفظ ہیں۔ خدا کے لیے۔

منیجر :نہیں، نہیں مجھے سوچنے دیجیے۔

منیجر :اُف

پروفیسر :ارے۔ یہی ایک لفظ کافی ہے۔ اُف۔

جج :اُف

کرنل :اُف

ڈائریکٹر : اُف۔ اُف۔ اُف

کمشنر :(باری باری سے اور پھر ایک ساتھ اُف اُف کرتے جاتے ہیں)

ڈاکٹر :اُف

پروفیسر :اُف

منیجر :نہیں، نہیں۔ میں اس سے بھی ایک بڑھیا جملہ کہہ سکتا ہوں۔

ڈائریکٹر :تو پھر کہتے کیوں نہیں؟ کیا تم ہمارے صبر کو آزمانا چاہتے ہو؟

منیجر :آپ لوگ یوں ہی دق کرتے رہیں تو میں خاموش ہو جاؤں گا۔

جج :(بھاری آواز میں) خاموش۔

ڈائریکٹر : خاموش، ہاں خاموش۔اپنے خیال کو پیش کرنے کے لئے کیوں نہ یہی ایک لفظ استعمال کرلیا جائے۔

پروفیسر :(لفظ خاموش کی نقل کرتے ہوئے) اوہ۔خاموش، کوئی خاموش کب تک رہ سکتا ہے؟

ڈاکٹر :خاموش رہنے کے لئے تو وقت درکار ہے۔اس کا تعین کون کرے گا اور کیسے کریگا۔

جج :آپ سچ کہتے ہیں۔وقت لامتناہی ہے۔خامشی لامتناہی کیسے ہو سکتی ہے۔

منیجر :اب میں نے سوچ لیا ہے۔

کمشنر :کہو

ڈائریکٹر :کہو، کہو، جلد کہو۔

منیجر :ہم سب۔

پروفیسر :لفظ سب کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔غیر ضروری الفاظ کا استعمال نہ کرو۔

منیجر :ہم۔

ڈاکٹر، کرنل:ہاں، ہاں، ہم

منیجر :ہم سب حماقت کے لنگڑے گھوڑے پر سوار ہیں۔

جج :یہ جملہ بڑا معقول ہے لیکن ذرا طویل ہو گیا ہے۔

کمشنر :ٹھہریئے۔ میں اسے مختصر کرتا ہوں، ہم حماقت کے گھوڑے پر سوار ہیں، دو لفظ کم ہو گئے۔

ڈاکٹر :حماقت سے زیادہ بہتر تو لفظ لنگڑا ہے، جملہ اس طرح ہو تو بہتر ہے، ہم لنگڑے گھوڑے پر سوار ہیں۔تین لفظ کم ہو گئے لوگو۔

کرنل :ہم گھوڑے پر سوار ہیں، ارے اب تو چار لفظ حذف ہو گئے۔

ڈاکٹر :کیا کہتے ہو کرنل، گھوڑے سے بہتر لفظ تو پھر بھی لنگڑا ہے۔یوں کہو ہم لنگڑے گھوڑے

پر سوار ہیں۔

جج :اسے اور بھی چھوٹا کرو۔ ''ہم لنگڑے ہیں''۔

ڈاکٹر :جی نہیں۔ ہم لنگڑے گھوڑے ہیں۔

ڈائریکٹر :جی نہیں۔ ''ہم لنگڑے ہیں۔'' صرف تین ہی لفظ کتنے مکمل ہیں۔

کمشنر :اسے اور بھی چھوٹا کرو۔

ڈائریکٹر :(دونوں الفاظ پر زور دے کر) ''ہم ہیں''

کرنل :(بھاری آواز میں) ''ہم''

منیجر :اگر آپ لوگ میرے جملے میں سے ایک بھی لفظ نکالیں گے تو یہ خیال نامکمل رہ جائے گا۔

پروفیسر :آپ لوگ ذرا رکیں۔ میں بتاتا ہوں۔ خیال ہے۔ ''ہم سب حماقت کے لنگڑے گھوڑے پر سوار ہیں''۔ آں.....ایں....

ہم ایک ۔۔ سب دو ۔۔ حماقت تین ۔۔۔ کے چار ۔۔ لنگڑے پانچ ۔۔ گھوڑے چھ ۔ پر سات ۔۔ سوار آٹھ ۔۔ ہیں نو ۔۔ اس جملے میں نو کی گنتی پوری کی گئی ہے۔ یہ ہر طرح سے مکمل جملہ ہے۔

جج :بالکل ٹھیک ہے۔ اس سے بہتر خیال کوئی پیش نہ کر سکے گا۔ نو کا ہندسہ بھی آخری ہندسہ ہے۔

ڈائریکٹر :بہت ہی موزوں ۔۔ بہت مناسب ۔۔ بہت عمدہ۔

کرنل :ہم لوگ اپنے اپنے سروں کی تلاش میں ہیں۔ اب ہم اس سے بہتر خیال سوچ نہیں سکتے۔ میں تو اس جملے کو دہراؤں گا۔

ڈاکٹر :اور میں بھی۔

کمشنر :اور میں بھی۔

کمشنر :اور میں بھی

جج :اور میں بھی

پروفیسر : اور میں بھی تو ہوں۔

سب ایک زبان ہوکر۔

ہم سب حماقت کے لنگڑے گھوڑے پر سوار ہیں۔

ہم سب حماقت کے لنگڑے گھوڑے پر سوار ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

درد کا پورٹریٹ

• مظہر الزماں خاں

ڈھیروں ملبہ اب تک ہٹایا جا چکا تھا کہ ملبہ ہٹایا جا رہا تھا کہ ملبہ ہٹانے یا اٹھانے کا کام روز ازل سے جاری ہے۔ چنانچہ اب پھر پرانا تھیٹر ٹوٹ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا عصری تھیٹر تعمیر ہو چکا تھا۔ ہدایت کار اور کہانی کار/ افسانہ نگار/ ناول نگار/ ڈرامہ نگار/ اور آخری داستان گو مظہر الزماں خان اس کھیل میں کام کرنے والے تمام فنکاروں کو ہدایت دے چکے تھے کہ یہ کھیل ان سب کے لیے ایک چیلنج تھا اور کھیل کو دیکھنے کے لیے دنیا کے تمام نئے اور پرانے آدمیوں کے علاوہ بڑے بڑے آرٹسٹ ،ادیب ،شاعر ،منسٹرس ،تھیٹر میں جمع ہو چکے تھے اور ان سبھوں کے سامنے ایک ایک پیپر رکھا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا کہ اپنے اپنے دماغ اس کاغذ پر رکھ دو کہ دماغ ہی سب کچھ ہے اور اپنے اپنے دستخط اس کاغذ پر ثبت کر دو کہ یہ کھیل انگوٹھے کے نشان سے لے کر دستخط تک پھیلا ہوا ہے۔ تاہم صدیوں کا یہ فاصلہ بس ایک پل کے برابر ہے اور ہم تم ،سب کے سب اس آخری کھیل میں شریک ہیں کہ اس کے بعد پھر کوئی کھیل نہ ہوگا کہ یہ کھیل کی انتہا ہے اور اس کا اختتام ہے۔

دستخط آخری داستان گو

مظہر الزماں خاں

پردہ گراہوا ہے۔اس کے پیچھے سے تیز ہواؤں اور ریل کی سیٹی سنائی دے رہی ہے۔
پردہ اٹھتا ہے۔ دو آدمی الگ الگ پتھروں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے سر گھٹنوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر وہ یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد، اپنے اپنے گھٹنوں سے سر اٹھا کر ایک دوسرے کے چہروں کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور پھر دونوں ایک ساتھ کہتے ہیں۔

دونوں : لو ہم آ گئے—(خوب ہنستے اور کہتے ہیں) پنجرے کا دروازہ کھلا تھا کہ ہم آ گئے—ہاہاہا۔

پہلا آدمی : پنجرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر وہ چلا گیا تھا کہ ہم نکل آئے۔

دوسرا آدمی : ہم اس زمین پر آ گئے ہیں جہاں ہمارے خواب پھیلے ہوئے ہیں۔

پہلا آدمی : لیکن ہمارے خوابوں پر گرد جم چکی ہے—اب ہمیں اپنے خوابوں پر جمی گرد کو صاف کرنا ہوگا۔

دوسرا آدمی : مٹی کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں ہمارے خواب۔

(پہلا اٹھتا ہے اور پھر زمین پر بیٹھتے ہوئے کہتا ہے)

پہلا آدمی : دیکھو۔ زمین اب کتنی میلی ہوگئی ہے۔

(دوسرا اس کے قریب آ کر اسے چھوتا ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے)

مجھے چھونا مت۔ ہاتھ مت لگانا میں چیخ اٹھوں گا مکمل درد ہوں۔

دوسرا آدمی :تم بھی درد ہو۔ میں بھی درد ہوں ۔ ہاتھ لگانے پر چیخ اٹھتے ہیں کہ کچے زخم ہیں ہم لوگ ۔

پہلا آدمی :اب ایک نئی زمین اور نئی کہانی کی ضرورت ہے۔ پرانی کہانی بہت میلی ہوگئی ہے۔

دوسرا آدمی :زمین کو اب کسی سیارے سے لپٹ کر سو جانا چاہیے۔ بہت تھک چکی ہے کہ سو جانے ہی میں زمین کی سلامتی ہے۔

پہلا آدمی :نہ اب جاگنے میں سلامتی ہے اور نہ سونے میں سلامتی ہے—وہ زمین کریدتے ہوئے کہتا ہے—دیکھو۔ یہاں کی مٹی میں نمی ہے۔

دوسرا آدمی :لگتا ہے سمندر یہاں سے قریب ہے۔ یا پھر اس زمین کے نیچے ہے۔

پہلا آدمی :کیا تم نے کبھی سمندر دیکھا ہے؟

دوسرا آدمی :سمندر—ہاہاہا۔

پہلا آدمی :ہنس کیوں رہے ہو—؟ مجھے ہاتھ مت لگانا۔ چیخ بن جاؤں گا میں۔

دوسرا آدمی :تمام سمندر خشک ہو چکے ہیں۔

پہلا آدمی :کیا بک رہے ہو۔

دوسرا آدمی :بک نہیں رہا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سب سمندر اب خشک ہو چکے ہیں اور ان کی موجودگی میں جو موسیقی کے تمام اسرار موجود تھے۔ اب وہ سیپیوں میں بندریت کے اندر دھنس کر رہ گئے ہیں اور سمندر کی ہڈیاں جل رہی ہیں۔

پہلا آدمی :سمندر زندہ ہے اور اس کی ہر لہر میں ان گنت سر اور ان گنت راگ موجود ہیں کہ وہ عظیم الشان موسیقار ہے لیکن جب برہم ہو جاتا ہے تو زمین سانس لینا بھول جاتی ہے۔

دوسرا آدمی :ٹھیک کہتے ہو کہ سمندر زندہ ہے اور اس کی ہر موج میں ایک درد ہے اور ہر درد میں ایک راگ موجود ہے۔ ایک ایسا راگ جس کے اندر سینکڑوں کہانیاں پوشیدہ ہیں کہ سمندر سب سے بڑا موسیقار ہے مگر جب جذباتی ہو جاتا ہے تو چاند کا دودھ پی جانے کے لیے اپنے ہونٹ چاند کے سینے پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

پہلا آدمی : سمندر زمین کی ایک زندہ داستان ہے جو صدیوں سے بولی جا رہی ہے کہ سمندر سے بڑا کوئی اور داستان گو نہیں ہے۔

دوسرا آدمی : سمندر ایک تارہ ہے جسے آسمان سجا رہا ہے۔

پہلا آدمی : سمندر ایک ایسا راگ ہے جس کی نہروں میں زمین کی دھڑکنیں چھپی ہوئی ہیں۔

دوسرا آدمی : سمندر وائلن ہے یا وائلن کی مسلسل آواز ہے یا پھر زخم کی ٹیس ہے۔

پہلا آدمی : سمندر زمین کا سر ہے۔

دوسرا آدمی : سمندر زمین کے جسم پر بنائی ہوئی ایک لافانی پینٹنگ ہے۔ ایک سانس لیتی ہوئی پینٹنگ جس کا عکس بعض وقت تمہیں بادلوں پر دکھائی دیتا ہے۔

پہلا آدمی : سمندر خود ایک آرٹسٹ ہے۔ سب سے بڑا اور سب سے عظیم آرٹسٹ اور ہر لمحہ اپنے چہرے پر ایک نئی، اچھوتی اور منفرد پینٹنگ بناتا ہے اور پھر خود ہی اسے مٹا بھی دیتا ہے۔

دوسرا آدمی : کیا تم نے کبھی سمندر کو روتے ہوئے دیکھا ہے۔ دیکھو مجھے ہاتھ نہ لگانا چیخ پڑوں گا میں۔

پہلا آدمی : سمندر جب سے پیدا ہوا ہے کبھی رویا نہیں کہ سمندر کبھی روتے نہیں۔ وہ مسلسل ہنستے رہتے ہیں جس طرح زخم کبھی نہیں روتا۔ اسی طرح سمندر بھی کبھی روتا نہیں۔ لیکن!

دوسرا آدمی : لیکن کیا؟

پہلا آدمی : لیکن ہنستے ہنستے جب سمندر کے سینے میں درد ہونے لگتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے اور تب زمین اپنا چہرہ اتار کر ایک نیا چہرہ لگا لیتی ہے۔

(کچھ دیر تک پہلے آدمی کے چہرے کیطرف دیکھتا ہے اور پھر کہتا ہے)

دوسرا آدمی : سنو!

پہلا آدمی : کیا ہے!

دوسرا آدمی : ابھی مجھے یوں لگا کہ میں برف کی طرح پگھلتا جا رہا ہوں اور میرے اندر......

پہلا آدمی : رکو! ٹھہر جاؤ— میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

دوسرا آدمی : کہو!

پہلا آدمی : کیا تم نے مجھے دیکھا ہے!

دوسرا آدمی : دیکھ رہا ہوں۔

پہل آدمی : میں جو دکھائی دے رہا ہوں—وہ نہیں ہوں میں۔

دوسرا آدمی : تو پھر کیا ہو تم۔

پہلا آدمی : دیکھنا چاہتے ہو۔

دوسرا آدمی : ہاں!

پہلا آدمی : لو۔ دیکھو۔

(اور پھر اچانک اسٹیج پر اور ہال میں ایک لمحہ کے لیے اندھیرا پھیل جاتا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحہ روشنی آ جاتی ہے)

دوسرا آدمی : اب تم بھی مجھے دیکھو۔

(اور پھر ایک لمحے کے لیے اندھیرا پھیل جاتا ہے اور دوسرے لمحہ روشنی آ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے)

تم نے بھی مجھے دیکھ لیا— ہم سب کے سب ایسے ہی ہیں۔

پہلا آدمی : دیکھو— سنو— ہواؤں میں وائلن کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ لگتا ہے کہ سمندر پھر وائلن بجا رہا ہے۔

دوسرا آدمی : ہوائیں! (حیرت سے اپنا سر تھامتے ہوئے)

پہلا آدمی : ہاں ہوائیں!

دوسرا آدمی : تمہیں یاد ہے کہ ہوائیں کب چلی تھیں۔

پہلا آدمی : کب چلی تھیں۔ یاد تو نہیں ہے لیکن درختوں پر بیٹھے ہوئے سارے پرندے زمین پر گر کر ڈھیر ہو گئے تھے۔ اتنا یاد ہے۔

دوسرا آدمی : مجھے ہواؤں کا چلنا اور زمین پر پرندوں کا گر کر ڈھیر ہو جانا تو یاد نہیں ہے۔ کیوں کہ اس وقت میں پیدا ہو رہا تھا۔ ماں کہتی تھی۔ اب ماں بھی کتنا سچ کہتی تھی اور کتنا جھوٹ مجھے نہیں معلوم۔ البتہ میرا باپ زیادہ تر ڈارک روم میں رہتا تھا کیونکہ اس کو میری ماں کے

نگیٹو کو پازیٹو بنانے کا بہت شوق تھا۔ مگر کہتے ہیں کہ وہ زندگی بھر اپنی بیوی کے نگیٹو کو پازیٹو نہ بنا سکا۔

پہلا آدمی : ابھی ابھی میرے پیروں کے نیچے کی زمین پھڑکی تھی جس طرح جسم کا کوئی حصہ کبھی کبھی پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ یہ زمین بھی بالکل ویسے ہی پھڑکتی ہے۔

دوسرا آدمی : زمین تو جب سے پیدا ہوئی ہے پھڑکتی ہی رہتی ہے مگر جب شدت سے پھڑکتی ہے تو قوم اور نسل دونوں کی تصویریں بدل ڈالتی ہے۔

پہلا آدمی : ہاں، بڑا عجیب دور آ گیا ہے اب تو بستر، تکیے، لحاف، دیواریں، دروازے، کھڑکیاں، دہلیزیں، مکان، کنوئیں، آنگن، گلاس، رکابیاں سب گونگے ہو گئے ہیں۔ ورنہ پہلے کتنی اچھی اچھی باتیں کرتے تھے۔ کتنا ہنستے تھے اور کتنا ہنساتے تھے۔

دوسرا آدمی : روتے تو بالکل نہیں تھے۔ بس کبھی کبھی کہیں درد ہوتا تو ایک آدھ آنسو البتہ نکل آتا تھا۔

پہلا آدمی : اور آج تو سب کے سب ہمہ اقسام کے دردوں میں مبتلا ہیں۔ سب تصویریں رو رہی ہیں۔ چھونا نہیں۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔ چیخ اٹھوں گا۔

دوسرا آدمی : کیا تم نے کبھی درد کی شکل دیکھی ہے۔ بہت کم بلکہ مٹھی بھر کے لوگ ہی درد کی شکل دیکھتے ہیں۔

پہلا آدمی : کیا تم نے دیکھی ہے؟

دوسرا آدمی : ہاں۔ دیکھی ہے لیکن بتا نہیں سکتا اور اگر بتا بھی دوں تو تم دیکھ نہیں سکتے۔

(وہ جیب سے ایک گڑیا نکالتا ہے اور پھر ایک تار اٹھا کر اس کے نچلے حصہ کو لپیٹتے ہوئے کہتا ہے)

دوسرا آدمی : درد میں مبتلا اس عورت کو دیکھ رہے ہو۔

پہلا آدمی : کہاں کی ہے۔ کس زمین کی ہے؟

دوسرا آدمی : یہ اس جگہ سے تعلق رکھتی ہے جہاں پچھتر ہزار مردوں نے اس کے جسم پر پچھلے موسم میں کیکٹس اگائے تھے۔

پہلا آدمی : مگر اس عورت نے تو کہا تھا کہ ان میں کوئی بھی مرد نہیں تھا۔

دوسرا آدمی : ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے کہ کسی نے بانگ نہیں دی تھی۔

پہلا آدمی : یار آج کل بہت سارے مرد، عورتوں کو رومال کی طرح اپنی جیبوں میں لیے لیے پھرتے ہیں۔

دوسرا آدمی : اور جب جی چاہتا ہے جیب سے رومال نکال کر ناک کے قریب لے جاتے ہیں اور پھر جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ بس

(اور وہ غلطی سے ہاتھ لگاتے ہی چیخ اٹھتا ہے)

کتنی بار کہا کہ مجھے ہاتھ مت لگاؤ— لگتا ہے کہ تم اندھے ہو گئے ہو۔

پہلا آدمی : اندھے تو ہم سب ہی ہیں اور ببول کے درختوں پر چمگادڑوں کی طرح جھول رہے ہیں یا پھر اپنے اپنے پیٹوں پر گیہوں کے کھیتوں کی پینٹنگ بنانے میں مصروف ہیں۔

دوسرا آدمی : ان دنوں اچھے اچھے گھوڑوں کو داغا جا رہا ہے۔

پہلا آدمی : لیکن گھوڑے ہیں کہاں—وہ تو قبرستان کی دیواروں کے ادھر ہنہنا کر، مسلسل لاتیں مار مار کر دیواریں گرانے کی کوششوں میں اپنی عمر کے بہترین لمحے ضائع کر رہے ہیں۔

دوسرا آدمی : اور جوان کنواری کوری لڑکیاں اپنے برف کے گھروں کی دہلیزوں پر بیٹھی ہوئی، سورج کو اپنی پنڈلیاں بتا رہی ہیں۔

پہلا آدمی : اور ہینگروں پر جھولتے ہوئے بوڑھے انہیں دیکھ دیکھ کر کھانس رہے ہیں اور......

دوسرا آدمی : ٹھہرو! (کچھ سوچتے ہوئے اور پھر قہقہہ لگا کر)

پہلی بار وہ پنجرے کا دروازہ لگانا بھول گیا تھا۔ ہاہاہاہا۔ اور ہم باہر آ گئے۔

پہلا آدمی : اپنے اندر سے باہر آئے یا پنجرے سے باہر آئے۔

دوسرا آدمی : اندر سے باہر۔ ذرا دیر سے ہی نکلتے ہیں ہم لوگ۔ البتہ پنجرے سے ضرور باہر آ گئے ہیں۔ اور اس وقت یہاں بیٹھے اپنے تلوؤں پر رقم زمینوں کی تاریخ پڑھ رہے ہیں۔

پہلا آدمی : ہاں! درست تاریخ تو اب ہمارے پیروں میں باقی رہ گئی ہے۔

دوسرا آدمی : ہمارے تلوے کتنی زمینوں کو چاٹ چکے ہیں!

پہلا آدمی : یاد نہیں ہے کہ تلوے بہت گرد آلود ہو چکے ہیں۔

دوسرا آدمی : ہاں مجھے بھی یاد نہیں ۔ لیکن ہماری یادداشت کیوں ختم ہوتی جا رہی ہے !

پہلا آدمی : یاد نہیں ہے کہ تلوے بہت گرد آلود ہو چکے ہیں ۔

دوسرا آدمی : ہاں مجھے بھی یاد نہیں ۔ لیکن ہماری یادداشت کیوں ختم ہوتی جا رہی ہے !

پہلا آدمی : کیا تم خود کو یاد ہو؟

دوسرا آدمی : نہیں ۔ اپنے آپ کو بھول گیا ہوں میں ۔

پہلا آدمی : میں بھی خود کو بھول گیا ہوں ۔

دوسرا آدمی : ہمارے ہی سروں کا نہیں، تمام قوموں کے سروں کا بھی یہی حال ہے کہ سب کے سر اونگھ رہے ہیں ۔

دوسرا آدمی : ہم جھوٹے بہت ہو گئے ہیں ۔

پہلا آدمی : کیا کبھی کسی قوم کے سروں پر اونگھ نے حملہ کیا تھا ۔

دوسرا آدمی : ہاں ! بہت سی قومیں گزری ہیں ۔ جن کے سروں پر اونگھ نے حملہ کیا تھا ۔

پہلا آدمی : تو پھر کیا وہ سر سو گئے تھے !

دوسرا آدمی : ہاں ۔ سو گئے تھے کہ یہ ایک تاریخ ہے ۔ جب بھی قوم اور راہبر جھوٹے ہو جاتے ہیں سر سو جاتے ہیں ۔

(اچانک کئی جانوروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

پہلا آدمی : ایسی آوازیں کیوں نکال رہے تھے ـــــ عجیب عجیب آوازیں ـ دیکھو مجھے چھونا مت ۔ ہاتھ نہیں لگانا مجھے ۔ میں بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا ۔ چھوؤں گا نہیں ۔

دوسرا آدمی : میں کہاں نکال رہا تھا ۔ یہ تو تم نکال رہے تھے ۔

پہلا آدمی : کیا یہ میری آوازیں تھیں !

دوسرا آدمی : ہاں ! تم ہی تو نکال رہے تھے ۔

پہلا آدمی : میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ آوازیں تم نکال رہے تھے ۔

دوسرا آدمی : نہیں ! وہ آوازیں ہم دونوں ہی کی تھیں کہ بعض وقت ہمارے اندر سے ایسی آوازیں آتی ہیں تو زمین سرخ ہو جاتی ہے ۔

پہلا آدمی :رکو!

دوسرا آدمی :رکا ہی ہوں۔اگر کسی گھڑی کی سوئی ہوتا تو متحرک رہتا۔

پہلا آدمی :ارے ہاں!

(وہ اپنے ساتھی کی طرف حیرت سے دیکھتا ہے اور پھر جیب سے کاغذ نکال کر کہتا ہے جس پر ایک گڈ مڈ شکل بنی ہوئی ہے)

دیکھو دیکھو شاید یہ میں ہوں۔نہیں نہیں۔شاید یہ شکل تو میرے باپ کی ہے یا بھائی کی بہن یا دادا کی ہے— نہیں نہیں شاید یہ شکل ہمارے شہر کی ہے یا ملک کی ہے۔

دوسرا آدمی :میں دیکھتا ہوں (کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین کر دیکھتے ہوئے) یہ تو میرے باپ کی ہے۔شاید دادا یا بھائی ہے—ماں بھی ہو سکتی ہے،۔میں بھی ہو سکتا ہوں نہیں نہیں یہ تصویر ہم دونوں میں سے کسی کی بھی نہیں ہے—اقوام متحدہ یا پارلیمنٹ ہاؤس کی شکل ہے یہ— لیکن یوں تو کسی درندے کی تصویر لگتی ہے اور یوں دیکھو تو جانوروں کا ہجوم دکھائی دے رہا ہے۔

(اچانک پھر مختلف جانوروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

پہلا آدمی :دیکھو تم پھر آوازیں نکال رہے ہو!

دوسرا آدمی :میں کہتا ہوں۔یہ آوازیں تمہاری ہیں۔

پہلا آدمی :چلو یہ آوازیں ہم دونوں ہی نکال رہے ہیں۔

دوسرا آدمی :ہم دونوں ہی کیوں۔سب کے سب نکال رہے ہیں۔غور سے سنو پوری قوم پوری نسل کی آوازیں ہیں یہ—ہاہاہاہا۔کتنی اچھی اچھی آوازیں ہیں اس قوم کی— مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔چھوؤ مت چیخ بن جاؤں گا میں۔

پہلا آدمی :میں بھی درد ہوں ۔تم بھی درد ہو یہ موسم،یہ ماحول،یہ گھر،دروازے،دیواریں ،سڑکیں شہر،اخبار کتابیں،قلم کاغذ،زمین سب کے سب درد بن گئے ہیں۔ہاتھ لگاؤ تو چیخنے لگتے ہیں۔میں درد کا پورٹریٹ بناؤں گا۔رنگوں میں اتر کر ان کے رشتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان کے اندر چھپے ہوئے سروں کو پہچان کر—رنگوں اور موسیقی سے

بھر ہوا درد کا ایک پورٹریٹ بناؤں گا میں

دوسرا آدمی :تم بناؤ گے درد کا پورٹریٹ!

پہلا آدمی :ہاں! میں بناؤں گا درد کا پورٹریٹ اور اس کا ہر رنگ چھوتے ہی چیخنے لگے گا کہ ہم سب کے سب الگ الگ رنگ ہی تو ہیں

دوسرا آدمی :رنگ ہمارے عزیز بھی ہیں۔ ہمارے دوست بھی ہیں اور ہمارے دشمن بھی ہیں ان کی مخالفت بھی کرتے ہیں اور انہیں ریپ بھی کرتے ہیں۔

پہلا آدمی :ہم رنگوں کے درد کو محسوس نہیں کر سکتے۔ ان کے اندر چھپے ہوئے سروں کو سن نہیں سکتے۔

دوسرا آدمی :کیونکہ ایسی سماعت ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوئی جو سروں اور رنگوں کے درد کو پہچان سکے ۔ ان کی آواز کو سن سکے۔

پہلا آدمی :میں درد کا پورٹریٹ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں ۔لیکن بنا نہیں پا رہا ہوں ۔اس لئے دنیا کے تمام آرٹسٹوں سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ آرٹ اور رنگوں کے ساتھ کھلواڑ کر نے کی بجائے درد کا پورٹریٹ بنانے کی کوشش کریں۔

دوسرا آدمی :کیا یہ کائنات مختلف رنگوں کا درد ہے؟ کیا ہر رنگ کے اندر ایک کائنات پوشیدہ ہے ؟ کیا رنگوں میں تمام سر موجود ہیں؟ اور کیا یہ کائنات تمام سروں اور راگوں کا مجموعہ ہے اور کیا اب وہ تمام سُر، رنگ اور راگ کائنات میں باقی ہیں —یا ختم ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں کیا یہ کائنات درد کا پورٹریٹ ہے— نہیں— ہے— جسم، رنگ سر، شیشہ، سورج چاند، زمین، آسمان۔ ان سب کو پیش کر کینوس پر پھینک دو۔

پہلا آدمی :میں درد کا پورٹریٹ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں ۔لیکن بنا نہیں پا رہا ہوں— کائنات کو چھوؤ مت۔ ہاتھ مت لگاؤ کچے زخم پر لوبان کی گرتی ہوئی چنگاریوں کی طرح ہے۔ یہ رنگوں سے بھری ہوئی کائنات —ایک شیشہ، ایک جسم ۔ایک سورج، ایک چاند، ایک پرندہ، ایک زمین ایک آسمان، انگنت رنگ، انگنت راگ، انگنت روگ اور اَن گنت درد —زمین پر بس اب گھاس ہی گھاس ہے —میں درد کا پورٹریٹ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں ۔لیکن بنا نہیں پا رہا ہوں اے خدا! تو نے تو درد کا پورٹریٹ بنا دیا

۔کروڑہا برس ہو گئے اور اس کا کوئی بھی رنگ اب تک پھیکا نہیں پڑا اور آج بھی یہ گیلری میں لگا ہوا ہے ۔نمائش جاری ہے ۔مگر اب اس اداس صدی میں یوں لگتا ہے کہ تمام رنگ، ان گنت روگوں کا شکار ہو گئے ہیں—اچھا ہوتا اگر تو اب ایک نیا پورٹریٹ بنا دیتا —ہنستے ہوئے رنگوں کا پورٹریٹ۔

دوسرا آدمی : ہاہاہاہا—نیا پورٹریٹ—ہنستے ہوئے رنگوں کا۔

پہلا آدمی : ہاں، ایک نیا پورٹریٹ۔

دوسرا آدمی : تم بناؤ۔ نیا اور ہنستے ہوئے رنگوں کا پورٹریٹ۔ اگر کہیں تمہیں خالص رنگ مل جائیں ۔ہاہاہاہا۔

پہلا آدمی : نہیں ۔میں تو درد کا پورٹریٹ ہی بناؤں گا۔ اس صدی کا۔

دوسرا آدمی : ہاہاہاہا۔ درد کا پورٹریٹ—تو پھر بناؤ—دیکھو غور سے دیکھو— لگتا ہے وبا پھیل رہی ہے لاکھوں چوہے بھاگ رہے ہیں ان گنت پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں سنائی دے رہی ہیں؟

پہلا آدمی : کہاں؟ وبا پھیل رہی ہے؟

دوسرا آدمی : شاید اس طرف یا شاید اس طرف یا شاید چاروں طرف۔ کتنی گندی بو آرہی ہے مرے ہوئے کتوں کی سڑے ہوئے پھلوں کی کتنی بدبو آرہی ہے۔

(خاموش۔ پھر ریل کی سیٹی دور سے قریب آتی ہوئی)

پہلا آدمی : وہ—وہ ریل کہاں چلی گئی۔ ہمیں یہاں اس مقام پر چھوڑ کر۔

دوسرا آدمی : کونسی ریل؟

پہلا آدمی : وہی ریل جو ابھی ابھی ہمیں یہاں۔ اس جگہ چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

دوسرا آدمی : لیکن یہاں تو کوئی اسٹیشن ہے اور نہ کوئی سگنل ہے حالانکہ گارڈ نے کہا تھا کہ یہیں ہمارا اسٹیشن ہے اور اسی اسٹیشن پر ہماری زندگی سر بہ زانو بیٹھی ہوئی ہے مگر اسے ہمارا انتظار نہیں ہے۔ لیکن...... یہاں تو دور دور تک کسی بھی اسٹیشن کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ اگر اسٹیشن ہوتا تو کم از کم سگنل اور پلیٹ فارم تو دکھائی دیتا

پہلا آدمی : کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ پلیٹ فارم تو اب کسی بھی اسٹیشن پر باقی نہیں رہا—اس قوم کی زندگیوں سے پلیٹ فارم۔ سگنل اور اسٹیشن نکال لیے گئے ہیں۔

دوسرا آدمی : خیر پلیٹ فارم چھوڑو، لیکن وہ ریل اور ریل کے گارڈ نے تو اسٹیشن کی بات کی تھی۔ وہ کیا ہوا۔ کہاں ہے وہ اسٹیشن۔ ہم بہت تھک گئے ہیں۔ بہت بھاگے ہیں بہت بھاگ چکے ہیں۔

پہلا آدمی : تم پھر غلطی کر رہے ہو— بھول رہے ہو— خود کو اپنے آپ کو۔ آج کے ماحول اور موسم کو۔ گارڈ اب کسی بھی ریل کا موجود نہیں ہے۔ صرف مختلف ٹرینیں چل رہی ہیں اور گارڈ غائب ہیں۔

دوسرا آدمی : پھر ہمیں اچانک اس جنگل میں ریل سے کیوں اتار دیا گیا؟

(خاموشی، کچھ دیر بعد پرندوں کی آوازیں)

پہلا آدمی : صبح ہو چکی ہے اور ہمیں اس آدمی کو دیکھنا ہے جو چلتے چلتے اچانک ایک چوراہے پر منجمد ہو گیا ہے۔

دوسرا آدمی : ہاں، چلو کہ ہمیں تو وہ آدمی یاد ہی نہیں رہا۔

پہلا آدمی : ہم ایک ایک چیز کو بھولتے چلے جا رہے ہیں۔

دوسرا آدمی : ہاں! ہم اپنی روایت، تہذیب، انسانیت، اخلاق، سب کچھ بولتے چلے جا رہے ہیں۔

پہلا آدمی : اب یہی دیکھو کہ کچھ دن پہلے یا کچھ عرصے پہلے میں نے جس زمین سے اپنا سفر شروع کیا تھا وہ زمین، وہاں کے چہرے، مجھے اب یاد نہیں رہے۔

دوسرا آدمی : میں بھی سب کچھ بھولتا جا رہا ہوں۔ مجھے وہ عورت اور اس کا چہرہ بھی یاد نہیں رہا جو میرے نکلنے وقت دردِ زہ میں مبتلا تھی اور...... دیکھو! یہ کس قسم کی آوازیں آ رہی ہیں؟

(دور سے جانوروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

پہلا آدمی : جگہ جگہ ایسی ہی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

دوسرا آدمی : یہ آوازیں کب سے شروع ہوئیں اور وہ کون سا موسم تھا۔ گرما کا یا برسات کا، یا پھر...

پہلا آدمی : جگہ جگہ ایسی ہی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

دوسرا آدمی : یہ آوازیں کب سے شروع ہوئی اور کون سا موسم تھا۔ گرما کا یا برسات کا، یا پھر...

پہلا آدمی : پتہ نہیں کون سا موسم تھا۔

(دونوں پتھر اٹھاتے ہیں اور پھر پتھر بجاتے ہیں)

دوسرا آدمی : اس طرح ہم سب کے سب ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو رہے ہیں۔

پہلا آدمی : دیکھو دونوں پتھروں سے کس طرح خون ٹپ ٹپ زمین پر گر رہا ہے۔

دوسرا آدمی : میں جب بھی بہتے ہوئے خون کو دیکھتا ہوں، میری آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔

پہلا آدمی : آج کل تو ہر طرف آنکھوں کو دکھ دینے والے منظر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ ان گنت مرغیوں کے ڈربے میں ایک منظر داخل ہوا تھا اور اس ڈربے کی تمام مرغیاں مر گئی تھیں۔

دوسرا آدمی : ہاں، اور جو بچ رہی تھیں وہ اپنی کوکھ کی صفائی میں لگ گئی تھیں۔

(دور سے قافلے کے گزرنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

پہلا آدمی : یہ آوازیں گزرتے ہوئے قافلے کی لگتی ہیں۔

دوسرا آدمی : کیسا قافلہ؟ کہاں کا قافلہ۔ تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ کیونکہ تمام قافلے اپنے اپنے راستوں سے بھٹک گئے ہیں۔ گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ گنجان جنگلوں میں یا پھر طوفان میں گھرے میدانوں میں اپنے اپنے چراغ جلانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں سب کے سب۔

پہلا آدمی : جب میں سفر کے لئے گھر چھوڑ رہا تھا تو میرے نیلے رنگ کے باپ نے مجھے گلے لگا کر کہا تھا۔ جاؤ مگر جب سفر سے واپس آؤ تو اپنے سر کے ساتھ واپس آؤ کہ سروں کی فصلیں اگائی جا رہی ہیں۔۔ کیا میں اپنے سر کو واپس لے جا سکوں گا؟

دوسرا آدمی : مجھے اپنے سر کی فکر لگی ہوئی ہے کہ وہ میرے جسم پر موجود ہے یا غائب ہو گیا ہے۔

پہلا آدمی : مطمئن ہو جاؤ کہ تمہارا سر جسم پر سلامت ہے۔

(اچانک دور سے کئی قدموں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

(خاموشی)

دوسرا آدمی : ہم پھر بھول گئے ہیں کہ ہمیں چل کر اس آدمی کو دیکھنا ہے۔

پہلا آدمی : کس آدمی کو؟

دوسرا آدمی : اسی آدمی کو جو چلتے چلتے اچانک ایک چوراہے پر مجسم ہو گیا ہے۔

پہلا آدمی : ارے ہاں، ہمیں تو وہ آدمی یاد ہی نہیں رہا۔

دوسرا آدمی : چلو چل کر اس آدمی کو دیکھیں۔ لیکن احتیاط سے چلو۔ کہیں ہمارے پاؤں بھی منجمد نہ ہو جائیں۔

پہلا آدمی : جب میں اپنے گھر سے نکل رہا تھا۔

دوسرا آدمی : کیا لوگ دوسروں کے گھر سے نکلتے ہیں؟

پہلا آدمی : ہاں، آج کل لوگ اپنے گھروں کے بجائے دوسروں کے گھروں سے زیادہ نکل رہے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے آپ سے زیادہ دوسروں کے گھروں کی فکریں ستا رہی ہیں۔

دوسرا آدمی : ہاں تو سناؤ۔ جب تم اپنے گھر سے نکل رہے تھے!

پہلا آدمی : ہاں، تو جب میں اپنے گھر سے نکل رہا تھا۔ میری بیوی نے میرے پیروں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیے کہ ہم لوگ آج کل بے سوچے سمجھے بہت قدم اٹھا رہے ہیں۔ ہر جگہ ہر مقام پر اس لیے ہمارے پاؤں چلتے چلتے منجمد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

دوسرا آدمی : ہاں، ہمارے پاؤں واقعی بڑے بے اعتبار ہو کر رہ گئے ہیں۔ دیکھو تمہارا ہاتھ میرے پھر قریب آ رہا ہے۔ میں چیخ پڑوں گا۔

پہلا آدمی : سنو، بے شک احتیاط سے چلنے والے پاؤں اب کسی کے پاس باقی نہیں رہے۔ یہاں سے وہاں تک۔ اوپر سے نیچے تک سب کے سب بے احتیاط ہو گئے ہیں۔

دوسرا آدمی : کبھی کبھی میرے دماغ میں اچانک یہ خیال آتا ہے کہ میں فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک کے

بیچوں بیچ چلوں اور کسی چیز سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں یا پھر بھٹک جاؤں کسی جنگل میں یا شہر میں۔۔۔یا۔۔۔

پہلا آدمی : ہم سب کے سب بھٹک چکے ہیں اور اس قدر بھٹک چکے ہیں کہ ملنا مشکل ہو گیا ہے۔

دوسرا آدمی : گم ہو کر رہ گئے ہیں ہم سب خاردار جنگلوں میں۔ جس راستے سے بھی نکلنے کی کوشش کرتے ہیں پھر ہمارے پاؤں ہمیں اسی راستے پر لا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

پہلا آدمی : میرا ایک ساتھی بھٹکتے بھٹکتے ایک درخت کی شاخ بن کر رہ گیا تھا اور دوسرا اپنے ہی گھر کے اندر بھٹک رہا ہے۔

دوسرا آدمی : رکو! (بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) یہ دیکھو۔

(جیب سے پلاسٹک کی گڑیا نکالتے ہوئے) اس کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ میرے بچے نے گھر سے نکلتے وقت یہ پلاسٹک کی گڑیا مجھے دیتے ہوئے کہا تھا۔ بابا! آتے وقت ہمارے لیے چلنے والی گڑیا ضرور لے آنا۔ کیونکہ تمام کھلونوں کے پاؤں آپ ہی آپ ٹوٹ چکے ہیں۔

(اور پھر وہ دیر تک اپنی ایک ٹانگ پر اچھلتے ہوئے پورے اسٹیج پر دوڑنے لگتا ہے اور پھر دوڑ دوڑ کے اپنے ساتھی کے پاس جا کر دونوں گھٹنوں کے درمیان سر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دور سے مختلف جانوروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

پہلا آدمی : دیکھو۔ تم پھر آوازیں نکال رہے ہو۔

دوسرا آدمی : میں کہتا ہوں۔ یہ آوازیں تمہاری ہیں۔

پہلا آدمی : خیر چلو۔ یہ آوازیں ہم دونوں ہی نکال رہے ہیں۔

دوسرا آدمی : یہ آوازیں ہم دونوں ہی نہیں پوری قوم پوری نسل نکال رہی ہے۔ دیکھو مجھے چھونا مت۔ ہاتھ مت لگانا۔ چیخ بن جاؤں گا میں۔ کہ سراپا کچا بہتا ہوا زخم ہوں۔

پہلا آدمی : دیکھو رنگوں سے بھرے درد کے پورٹریٹ پر پھر روگ گر رہا ہے۔

دوسرا آدمی : اس روگ سے اپنے اپنے سروں کو بچاؤ۔

(اور دونوں اپنے اپنے سروں کو ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ادھر

سے ادھر ادھر دوڑنے لگتے ہیں اور دوڑتے دوڑتے ہانپ کر بیٹھ جاتے ہیں)

پہلا آدمی :وہ چلتے چلتے اچانک چوراہے پر ایسے منجمد ہو گیا ہوگا!

دوسرا آدمی :ہاں! کیسے منجمد ہو گیا ہوگا۔

(دونوں حرکتیں کرنے لگتے ہیں)

پہلا آدمی :اور سوچو اچانک منجمد ہو جانے پر ٹرافک کا کیا حال ہوا ہوگا!

دوسرا آدمی :ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہوں گے۔

پہلا آدمی :ایک دوسرے سے ٹکرانے کے تو ہم سب عادی ہو گئے ہیں اور ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس زمین پر دیکھو۔

دوسرا آدمی :کہاں کون سی زمین پر!

پہلا آدمی :کسی بھی زمین پر دیکھ لو۔ فی الحال اس زمین پر دیکھو جگہ جگہ خون کے دھبے ہی دھبے پھیلے ہوئے ہیں۔ گرم گرم خون کے دھبے کہ خون کو ہم ٹھنڈا ہونے دیتے ہی نہیں۔ بس بہاتے چلے جاتے ہیں۔

دوسرا آدمی :(کچھ سوچتے ہوئے) آخر وہ کیسے منجمد ہو گیا ہوگا؟ سوچو۔ میرے تو جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں سوچ سوچ کر۔

پہلا آدمی :میں بتاؤں کیسے منجمد ہو گیا ہوگا۔ لو دیکھو!

(اور پھر وہ حرکتیں کرنے لگتا ہے)

دوسرا آدمی :کہتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پر جو گھڑی باندھی ہوئی تھی وہ جوں کی توں متحرک ہے۔

پہلا آدمی :اور....اور اس کی جیب سے کہتے ہیں کہ کچھ کاغذات، دوائیں اور مسخ شدہ تصویریں بھی برآمد ہوئی ہیں۔

دوسرا آدمی :مگر کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ جس کاغذ پر اس کا پتہ اور نام لکھا ہوا تھا۔ وہ پسینے سے بھیگ کر مٹ گئے ہیں کہ آج کل لوگوں کو پسینے بہت چھوٹ رہے ہیں۔

پہلا آدمی :دیکھو۔ (بے چینی سے وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہتا ہے) رنگوں سے بھرے پورٹریٹ پر روگ گر رہا ہے کہ آج... بوسنیا کا پورٹریٹ...عراق یا...

دوسرا آدمی : رکو! نام کیوں گنوار ہے ہیں۔ ناموں کی گنتی کی وجہ سے ہی ہم سب کے سب چکر میں پڑ گئے ہیں۔

پہلا آدمی : کوئی بھی رنگ پورٹریٹ سے باہر نکل ہی نہیں رہا ہے۔

دوسرا آدمی : پورٹریٹ سے باہر نکلنا بہت مشکل ہے۔ پورٹریٹ سے باہر کوئی بھی رنگ نکل ہی نہیں سکتا۔

پہلا آدمی : سب کے سب دیواروں پر لگے ہوئے ہیں اور روگ گر رہا ہے۔ تمام رنگ چیخ رہے ہیں اپنے اندر ہی اندر۔ اب اس منجمد ہو جانے والے آدمی ہی کو دیکھو۔ کہتے ہیں کہ ہاتھ لگاتے ہی چیخنے لگتا ہے۔

دوسرا آدمی : کہتے ہیں کہ سراپا کچا زخم ہے۔ یا تھا۔

پہلا آدمی : ہاں، میں نے بھی سنا ہے کہ وہ چھوتے ہی چیخنے لگتا ہے۔

دوسرا آدمی : اس کے آگے پیچھے کوئی تھا؟ یا پھر وہ اکیلا ہی تھا؟

پہلا آدمی : سنا ہے کہ اس کے آگے پیچھے بہت کچھ ہونے کی وجہ سے ہی وہ منجمد ہو گیا ہے۔

دوسرا آدمی : کہیں وہ کسی بھیانک کہانی کا کلائمکس تو نہیں ہے؟

پہلا آدمی : نہ وہ کسی رومانٹک کہانی کا کلائمکس ہے اور نہ بھیانک کہانی کا بلکہ وہ ایک کہانی ہے۔ بہت لمبی کہانی۔

دوسرا آدمی : ہم سب کے سب بھی تو کہانیاں ہی ہیں۔ الگ الگ رنگ کی الگ الگ موضوع پر لکھی گئی کہانیاں۔

پہلا آدمی : میں بھی ایک کہانی ہوں۔ تم بھی ایک کہانی ہو۔ ہم سب خراب موسموں کی خراب کہانیاں ہیں۔

دوسرا آدمی : سنو۔ غور سے سنو۔ پھر ریل کی سیٹی سنائی دے رہی ہے۔ وہ آ کر ہمیں زبردستی لے کر چلی جائے گی اور کسی گھنے جنگل میں اتار دے گی جہاں کوئی اسٹیشن ہوگا اور نہ کوئی گارڈ۔ دیکھو تم مجھے چھونے کی کوشش مت کرو۔

پہلا آدمی : کیا اس سے پہلے کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے؟

دوسرا آدمی : کون سا واقعہ؟

پہلا آدمی : چلتے چلتے اچانک منجمد ہو جانے والا۔

دوسرا آدمی : کم از کم میں تو نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہوا ہو۔ اور نہیں بھی ہو۔ مگر اب ایسے موسم شروع ہو چکے ہیں کہ کسی بھی وقت ہم منجمد ہو سکتے ہیں۔ شہر منجمد ہوسکتا ہے۔ گھر منجمد ہو سکتے ہیں ملک منجمد ہوسکتا ہے۔ محلے منجمد ہو سکتے ہیں۔ پوری زمین منجمد ہوسکتی ہے۔

پہلا آدمی : تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب کسی بھی چیز کا اعتبار باقی نہیں رہا۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ ہم لوگ سفر کر رہے تھے اور جس راستے پر سفر کر رہے تھے اچانک وہ راستہ تبدیل ہو گیا تھا اور جہاں ہم جانا چاہتے تھے وہاں نہیں جا سکے تھے۔

پہلا آدمی : ہم بے موسم، بے اعتبار اور چھوٹے چھوٹے سروں والے شرمندہ لوگ ہیں اور مسلسل اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں۔

دوسرا آدمی : اور ہماری ان حرکتوں پر سورج ہنس رہا ہے۔

پہلا آدمی : اس زمین کے لوگ آئے تھے۔ ان کی عورتوں کے بال کھلے ہوئے تھے اور ان کے چہروں پر اوس گر رہی تھی۔

دوسرا آدمی : کون سی زمین کے؟ (وہ زمین کو اچانک منہ لگاتا ہے اور پھر اپنے ساتھی سے کہتا ہے۔ (درد تھا کہ باہر نکلنا چاہتا تھا۔ میں پی گیا)

پہلا آدمی : ہاں تو میں اس زمین کی بات کر رہا تھا جہاں کی قوم کے چہرے نکال لیے گئے ہیں اور تلوؤں کو داغ دیا گیا ہے کہ کہیں زمین نہ چھوڑ دیں۔

دوسرا آدمی : اچھا، اس زمین کی بات کر رہے ہو، جہاں مرغیوں کے ڈربوں میں اجنبی بلاوڈر داخل ہوئے تھے اور تمام مرغیاں حاملہ ہو گئی تھیں۔

پہلا آدمی : سمجھنے کی کوشش کرو۔

دوسرا آدمی : کچھ دن پہلے میرے خواب میں زعفران لوگ آئے تھے۔ ان کے سروں پر کیکٹس کی چھتیں بنائی گئی تھیں۔

پہلا آدمی : کیا وہ لوگ اپنی پھٹی ہوئی ہتھیلیوں کو رفو کر رہے تھے؟

دوسرا آدمی : ہاں، وہ لوگ اپنی پھٹی ہوئی ہتھیلیوں کو رفو کر رہے تھے۔

پہلا آدمی : کیا وہ رفو کر لیں گے؟

دوسرا آدمی : یقین ہے کہ کر لیں گے کیونکہ جب ہتھیلیاں پھٹ جاتی ہیں تو تاریخ رنگ لاتی ہیں۔

دوسرا آدمی : تاریخ جب بھی رنگ لاتی ہے، درخت اپنے پیرہن اتار دیتے ہیں تو ایک نیا موسم چلا آتا ہے اور پھر وہ نیا موسم آگے چل کر پھر جنگل ہو جاتا ہے۔

دوسرا آدمی : ہم سب کے سب جنگلوں میں اگے ہوئے خودرو پودے ہیں اور ہماری جڑوں میں نمک رکھ دیا گیا ہے (وہ قہقہہ لگاتا ہے، مسلسل قہقہہ)

پہلا آدمی : اتنی زور سے مت ہنسا کرو کہ ہنسنے ہنسانے کے موسم لد گئے اور اب جو موسم چل رہا ہے بس ایک ہی منظر ہے اس موسم کا۔

دوسرا آدمی : کون سا موسم!

پہلا آدمی : مسلسل روگ گر رہا ہے رنگوں پر اور اس منجمد ہو جانے والے آخری ادمی پر۔

دوسرا آدمی : ارے ہاں، ہم بار بار اس منجمد ہو جانے والے آدمی کو بھولتے چلے جا رہے ہیں۔

پہلا آدمی : ہم جھوٹے بہت ہو گئے ہیں۔ آنے والے موسم ہمارے آگے جھوٹ کی علامتیں ڈال دیں گے۔!

دوسرا آدمی : ہاں، واقعی ہم بہت جھوٹے ہو گئے ہیں۔ ہم بھلا دیئے جائیں گے۔

پہلا آدمی : کیا اس منجمد آدمی کو وہاں رکھا جائے گا! دیکھو مجھے چھونا مت۔ چیخ بن جاؤں گا۔

دوسرا آدمی : سنا تھا کہ اس آدمی کو وہاں سے ہٹایا جانے والا تھا۔

پہلا آدمی : کیا پھر ہٹا دیا گیا؟

دوسرا آدمی : نہیں، کہتے ہیں کہ کسی نے کہا کہ اس آدمی کو وہیں رکھا جائے۔

پہلا آدمی : نہیں، کہتے ہیں کہ کسی نے کہا کہ اس آدمی کو وہیں رکھا جائے۔

پہلا آدمی : تو پھر اسے وہیں رکھ دیا گیا۔

دوسرا آدمی : ہاں، سبھوں نے کہا وہ اس تیز رفتار صدی کی منجمد تاریخ ہے۔ لہٰذا اس History کو اور History کی طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

پہلا آدمی : پھر....؟

دوسرا آدمی : پھر کیا۔ کم از کم کسی ایک تاریخ کو تو صحیح رکھا جائے۔

پہلا آدمی : ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی کسی ایک تاریخ کو صحیح رکھا جائے۔ لیکن بڑے بڑے چوراہوں پر تو مہمان آدمیوں کے مجسمے لگائے جاتے ہیں۔ اس کا تو کوئی نام ہے اور نہ کام۔

دوسرا آدمی : یہ ان سب سے مہمان آدمی ہے جو ایک اٹل حقیقت ہے۔ ایک بھرپور سچ ہے۔

پہلا آدمی : حقیقتیں اٹل اور سچ ہی ہوا کرتی ہیں۔

دوسرا آدمی : ٹھیک کہتے ہو لیکن آج کل آئینوں پر مسلسل پتھراؤ جا رہی ہے۔

پہلا آدمی : آئینے چہروں کو کھا رہے ہیں۔

دوسرا آدمی : نہیں، چہرے آئینوں کو کھا رہے ہیں۔

پہلا آدمی : سچ ہے۔ آؤ چلیں کہ ایک ہجوم ہوگا وہاں۔

دوسرا آدمی : سنا ہے کہ لوگ اس مہان آدمی کے پاؤں چھو چھو کر اپنی ذلیل خواہشات کا اظہار کر رہے ہیں۔

پہلا آدمی : آج کل ہم سب کے سب بڑی ذلیل قسم کی خواہشات میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں۔

دوسرا آدمی : ہاں بہت ذلیل ہو گئے ہیں ہم اور ہماری خواہشیں۔ خیر... ہمیں گھر سے نکلے کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ دیکھو مجھے چھونا مت۔

پہلا آدمی : یاد نہیں ہے کہ ہم نے گھر کب چھوڑا تھا۔ لیکن لگتا ہے کہ برسوں گزر چکے ہیں۔ دیکھو میرے قریب مت آؤ۔

(آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ پھر ہواؤں کے چلنے اور گھڑی کے ٹک ٹک کرنے کی آواز کے ساتھ اوراق پھڑ پھڑانے کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں اور چند لمحوں بعد صبح اور پرندوں کی آوازیں آتی ہیں)

پہلا آدمی : وہ دیکھو — وہاں، منجمد ہو جانے والا آدمی ہے۔ چلو چل کر دیکھیں۔

دوسرا آدمی : لگتا ہے کہ وہ بھی ہماری طرح سراپا زخم ہے۔

پہلا آدمی : آؤ اب چلیں۔ بہت ہجوم ہے۔

(وہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ مجسمہ پر گرد جمی ہوئی ہے۔ جنگلی بیلیں اس کے جسم سے لپٹی ہوئی ہیں اور گھاس اس کے اطراف اگی ہوئی ہے اور دائرے کی شکل میں بنائی گئی زنجیروں کے قریب ایک تختی پر لکھا ہوا ہے)

یہ آدمی چلتے چلتے اچانک ایک رات اس چوراہے پر مجسم ہو گیا ہے۔ یہ اس تیز رفتار صدی کی منجمد تاریخ ہے۔ دونوں اس کے قریب جاتے ہی بے ساختہ کہتے ہیں۔

پہلا آدمی : ارے یہ تو میں ہوں!

دوسرا آدمی : ارے یہ تو میں ہوں!

پہلا آدمی : نہیں! یہ میں ہوں۔

دوسرا آدمی : یہ تو صرف میں ہی ہوں!

پہلا آدمی : یہ میں ہوں۔

دوسرا آدمی : یہ میں ہوں!

اور پھر کئی آوازیں کئی زبانوں میں سنائی دیتی ہیں اور ہر زبان کا آدمی یہی کہتا ہے۔

یہ میں ہوں — یہ میں ہوں — یہ میں ہوں — یہ میں ہوں — یہ میں ہوں — یہ میں ہوں — یہ میں ہوں — یہ میں ہوں۔

آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل جاتا ہے اور پھر دور سے ریل کی سیٹی کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

اخبار کا دفتر

• پرکاش پنڈت

کردار

رحمان	چپراسی
کشوری لال	ٹائپسٹ
فقیر چند	کلرک
قدامت پیلی بھیتی	شاعر
بزرگ	ایڈیٹر کا رشتہ دار
لڑکا	بزرگ کا بیٹا
فردوس	مستند ادیب
دل باغ رائے خیراتی مل	آڑھتیا

اور

کاتب

ایڈیٹر

• **پردہ دو حصوں میں** منقسم اسٹیج پر کھلتا ہے۔ پلائی ووڈ کے پارٹیشن کے ایک طرف جونسبتاً بڑا کمرہ ہے ساتھ ساتھ دو میزیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک میز خالی ہے اور دوسرے کلرکوں کا مخصوص لباس۔ ٹوٹی ہوئی کرنی کا خاکی پتلون اور دھاری دار قمیض پہنے (جس میں بٹنوں کے بجائے دو بکسوے لگے ہیں) فقیر چند رجسٹر میں فٹے اور پنسل کی مدد سے لکیریں کھینچ رہا ہے۔ دوسرے کمرے میں جانے کے لئے پلائی ووڈ کے پارٹیشن میں جو اسپرنگ دار دروازہ ہے اس کے قریب اسٹول پر بیٹھا ہوا رحمان اونگھتے اونگھتے چونک اٹھتا ہے اور چونکنے کے بعد پھر اونگھنے لگتا ہے۔

ایڈیٹر ایک بہت بڑی میز پر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ میز پر فائلوں کا انبار قلم دان، لوہے کی جالی دار ٹرے (جو کاغذوں سے بھری ہوئی ہے) اور ٹیبل بیل۔ ہر چیز بڑے قرینے سے رکھی ہے۔ دائیں نکڑ پر ایک چھوٹی سی میز پر کشوری لال بیٹھا ٹائپ کر رہا ہے۔ ایڈیٹر کے دائیں ہاتھ پر دو خالی کرسیاں پڑی ہیں اور بائیں ہاتھ پر پلائی ووڈ کی دیوار مین اسپرنگ دار دروازہ ہے۔ سامنے دیوار کا کلاک ساڑھے دس بجا رہا ہے۔

ایڈیٹر : (**لکھنے کے ساتھ ساتھ** آہستہ آہستہ بولتا ہے) آج ۔۔۔ پوری دنیا کے سامنے ۔۔۔ ہائیڈروجن بم ۔۔۔۔ کے تجربوں نے ۔۔۔ ایک ایسا ۔۔۔
(چونک کر ٹیبل بیل بجاتا ہے) رحمان ۔۔۔ ارے رحمان ۔
(دروازہ کھلتا ہے اور بوکھلایا ہوا رحمان داخل ہوتا ہے)

رحمان : جی ساب ۔

ایڈیٹر : دیکھو کیا وہ کاتب آج بھی نہیں آیا ۔

رحمان : جی نہیں ساب

ایڈیٹر : کیوں نہیں آیا؟ آج تو اسے ضرور آنا چاہیئے تھا ۔ تم سے کہا تھا کہ اس کے گھر کا پتہ لگانا ۔

چپراسی : جی کچھ پتہ نہیں چلا میں صبح سے ۔۔۔۔

ایڈیٹر : کیا صبح سے ۔۔۔ صبح سے کچھ نہیں ۔ (ٹائپ رائٹر کی آواز تیز ہو جاتی ہے) ۔۔۔ میں پورے سات روز سے چیخ رہا ہوں لیکن (کشوری لال کی طرف رخ کرتا ہے) ارے بھائی کشوری لال اپنی ٹک ٹک بند کرو ۔۔۔ کیا مذاق ہے ۔۔۔ (ٹائپ کی مشین رک جاتی ہے) عجب جاہلوں سے پالا پڑا ہے ۔۔۔ دیکھو جی جیسے بھی ہو اسے ڈھونڈ کر لاؤ آج ۔۔۔ ابھی ۔

رحمان : جی۔۔۔کہاں سے۔۔۔ڈھونڈ لاؤں۔

ایڈیٹر : جہنم سے۔۔۔اور اگر وہ جہنم میں بھی نہ ملے تو تم بھی وہیں رہنا، سمجھے تمہاری چھٹی ہے۔

رحمان : جی۔

ایڈیٹر : جی کیا؟

رحمان : جی کچھ نہیں۔

ایڈیٹر : تو جاؤ کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔آخری تاریخ سر پر آ گئی اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔۔۔(رحمان دروازہ کھول کر ،اسٹیج سے چلا جاتا ہے)۔۔۔پرچہ کیسے چھپے گا؟ کشوری لال جی، میں نے آپ سے بھی کہا تھا اس گدھے کا کچھ پتہ لگائیے۔

کشوری لال: جی کہاں سے پتہ لگایا جائے۔سب کاتبوں سے پوچھ پوچھ کر ہار گئے۔

ایڈیٹر : تو اس کا مطلب ہے اس ہفتہ کا پرچہ نہیں چھپے گا۔

کشوری لال: جی۔جی چھپے گا تو۔

ایڈیٹر : کیسے چھپے گا جناب! کاپیوں کے بجائے پرنٹنگ مشین میں مجھے ٹھونسیں گے آپ! ہونہہ حد ہے ڈھٹائی کی۔کم بخت جب کام لینے آیا تھا تو ایسی مسکین صورت بنائی تھی۔جیسے ستر وقت سے روٹی نہیں ملی اور اب دیکھو ہفتہ بھر ہونے کو آیا ہے نہ کاپیوں کا کوئی پتہ ہے نہ کوئی جواب۔۔۔کشوری لال جی! مجھے تو اس ہفتہ کا پرچہ۔۔۔۔

(دروزہ کھلتا ہے اور رحمان داخل ہوتا ہے)

رحمان : جی جا رہا ہوں۔آپ سے ایک صاحب ملنا چاہتے ہیں۔

ایڈیٹر : کون صاحب ہیں۔

رحمان : جی کوئی شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

ایڈیٹر : شاعر اور کیا حضور سمجھتے ہیں اس وقت کوئی شریف آدمی ملنے کے لئے آئے گا۔کیا نام ہے۔

رحمان : جی نہیں پوچھا۔

ایڈیٹر : نام نہیں پوچھا۔بہت خوب، رحمان! رحمان! اب تمہاری عمر کیا ہوگی؟

رحمان : (جھینپتے ہوئے) یہی کوئی چالیس سال سمجھئے۔

ایڈیٹر : تو مجھے بتاؤ، چالیس برس تک تم کیا کرتے رہے؟

رحمان : جی میں آپ کی خدمت ۔۔۔۔۔

ایڈیٹر : بھاڑ جھونکتے رہے ہو۔

رحمان : جی۔

ایڈیٹر : جی کیا؟ جاؤ بھیجو نئی مصیبت کو اندر۔

(رحمان جاتا ہے اور منحنی سا شخص شیروانی پہنے کمر لچکاتا ہوا داخل ہوتا ہے)

شاعر : آداب عرض ہے قبلہ!

ایڈیٹر : آداب عرض۔ آیئے تشریف رکھئے (خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

شاعر : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) شکریہ، شکریہ، آپ کچھ مصروف ہیں شاید۔ جی!

ایڈیٹر : جی نہیں، کچھ خاص مصروفیت تو نہیں۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

شاعر : حضور والا، آپ شاید پروف دیکھ رہے ہیں۔

ایڈیٹر : پروف؟ اجی نہیں ابھی پروف کہاں ۔۔۔ ابھی تو ہمارے کاتب بہادر ہی کا کچھ اتہ پتہ نہیں ہے۔

شاعر : بڑی نا ہنجار قوم ہے صاحب۔ آپ فرشتۂ موت کا تو یقین کر سکتے ہیں لیکن کاتب نام کی جو مخلوق ہے اس کا بھروسہ نہیں۔ کیا آپ کو کوئی کاتب درکار ہے۔

ایڈیٹر : جی ہاں ضرور ضرور۔ کیا آپ کتابت کی غرض سے آئے ہیں۔

شاعر : جی نہیں سر دست تو بندہ بحیثیت ایک شاعر حاضر ہوا ہے۔ کتابت البتہ سیکھ رہا ہے اور سچ پوچھئے تو نظموں غزلوں کی آئے دن کتابت کرتے کرتے ہی یہ شعر کہنے کا سودا سر میں سما گیا ہے۔

ایڈیٹر : آپ کا اسم شریف؟

شاعر : ناچیز کو قدامت پیلی بھیتی کہتے ہیں۔ جناب نے میرا کلام تو دیکھا ہوگا؟

ایڈیٹر : جی ابھی تک تو میرا خیال ہے یہ سعادت مجھے نصیب نہیں ہوئی۔

شاعر : (جیب سے کاغذ کا پلندہ نکال کر) تو یہ لیجئے۔ یہ پندرہ غزلیں اور دس نظمیں آپ کی نذر ہیں۔

ایڈیٹر : (پلندہ لے کر تعجب سے) پندرہ غزلیں اور دس نظمیں!

شاعر : جی ہاں۔ سر دست تو یہی حاضر ہیں۔ دراصل میرا حافظہ کمزور ہے قدیم بیاض بستے میں تو باندھی تھی لیکن بستہ ہی لانا بھول گیا ورنہ۔۔۔۔

ایڈیٹر : اچھی بات ہے انہیں دیکھ کر میں آپ کو اپنی رائے سے مطلع کر دوں گا۔ اپنا پتہ تو آپ نے لکھ ہی دیا ہوگا۔

شاعر : اجی! اس میں تکلف کیا ہے۔ آپ ابھی میری موجودگی میں ملاحظہ فرما لیجئے۔

ایڈیٹر : بات دراصل یہ ہے قدامت صاحب کہ اس وقت مجھے کچھ خاص کام۔۔۔۔

شاعر : کام اجی حضت کام تو دنیا کے چلتے ہی رہتے ہیں۔ خیر لایئے میں خود ہی دو چار شعر آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میرا کلام۔۔۔۔ ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے (بڑے بے تکے ترنم سے)

پڑی جب سے نظر ان پر کچھ ایسا حال ہے اپنا
کہ دل پہلو سے اٹھے ہے کہ دل پہلو میں بیٹھے ہے

ایڈیٹر : سبحان اللہ قدامت صاحب۔ آپ ناحق زحمت فرماتے ہیں یہ تو ایسا کلام ہے کہ میں تنہائی میں پڑھوں اور مزا لیتا رہوں۔

شاعر : اجی نہیں آپ کیوں تکلف فرمائیں۔ میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ دراصل آگرہ مجھے راس نہیں آیا۔ دلی کے پرچوں میں بے بحر، بے وزن، بے سر پیر کی غزلیں، نظمیں دیکھ کر طبیعت کو طیش آیا تو میں نے سیدھا دلی کا رخ کیا۔ اب میرا ارادہ یہیں قیام کرنے کا ہے۔

ایڈیٹر : بہت خوب۔ نیک ارادہ ہے۔ لیکن یہ تو بتایئے اس سے پہلے بھی آپ کا کلام کہیں شائع ہوا ہے۔

شاعر : تو کیا واقعی میرا کلام آپ کی نظر سے نہیں گذرا؟

ایڈیٹر : میں نے عرض کیا نہ، یہ سعادت ہنوز مجھے نصیب نہیں ہوئی۔ کیا آپ روزانہ اخباروں

میں لکھتے ہیں؟

شاعر : جی نہیں تو۔۔۔۔

ایڈیٹر : اچھا تو پرچوں میں لکھتے ہوں گے؟

شاعر : لاحول ولا قوۃ۔

ایڈیٹر : کہیں ایسا تو نہیں کہ لکھ کر حفاظت سے گھر ہی پر رکھ لیتے ہوں۔

شاعر : حضرت میری چیزیں چھپتی ہیں اور نہایت شان سے چھپتی ہیں۔

ایڈیٹر : تو شاید بیرونی ممالک میں چھپتی ہوں گی۔

شاعر : استغفر اللہ، کیا فرمایا آپ نے۔لائیے میرا کلام (پلندہ جھپٹ لیتا ہے) کیا سمجھتے ہے آپ؟ آپکا پرچہ اگر معیاری ہے تو میرا کلام بھی غیر معیاری نہیں۔آداب غرض۔

ایڈیٹر : خدا حافظ۔

(زور سے دروازہ کھول کر باہر چلا جاتا ہے اسپرنگ دار دروازہ دیر تک کھلتا بند ہوتا ہے۔

(اس کے ساتھ ٹائپ رائٹر کی مشین چلنے لگتی ہے)

ایڈیٹر : میں نے آپ سے کہا تھا کشوری لال جی کہ۔۔۔۔۔اپنی ٹک ٹک بند کر دیجئے۔(ٹائپ مشین بند ہو جاتی ہے)۔۔۔۔۔۔میرے دماغ پر پہلے سے ہتھوڑے لگ رہے ہیں۔اور آپ ہیں کہ۔۔۔۔۔۔کام کی ایسی دھن سوار ہے تو جائیے دوسرے کمرے میں تشریف لے جائیے۔(کشوری لال مشین اٹھاتا ہے)۔۔۔۔۔اور دیکھئے رحمان ابھی تک گیا کہ نہیں۔

(کشوری لال دروازہ کھول کر مشین باہر لے جاتا ہے اور پھر خالی ہاتھ لوٹتا ہے۔)

کشوری لال: جی وہ تو گیا۔آپ سے ملنے دو صاحب اور آئے ہیں۔

ایڈیٹر : دو صاحب۔یک نہ شد دو شد۔شکل وصورت سے شاعر تو نظر نہیں آتے۔

کشوری لال: جی نہیں۔دیکھنے میں تو باپ بیٹے نظر آتے ہیں۔

ایڈیٹر : باپ بیٹے۔کیا مذاق ہے یہ اخبار کا دفتر ہے یا پرائمری اسکول کیا چاہتے ہیں۔

کشوری لال: جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

ایڈیٹر :ضرور ملنا چاہتے ہیں؟۔

کشوری لال: جی معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ اگر آپ نہ ملیں گے تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایڈیٹر :تو وہ خود آ کر مجھ سے بغل گیر ہو جائیں گے۔ یہی نا۔۔۔۔۔اچھا تو بھیج دو اور ہاں ساتھ ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا۔۔۔۔۔

کشوری لال: جی ابھی بھیجتا ہوں۔

ایڈیٹر :کیا بھیجتے ہو؟

کشوری لال: جی دونوں کو۔

ایڈیٹر :اور پانی؟

کشوری لال: جی تینوں کو۔

(کشوری لال جاتا ہے اور اسی دروازے سے ایک بزرگ لڑکے سمیت داخل ہوتے ہیں۔)

نو وارد :آہا۔۔۔۔۔۔۔بیٹے اچھے تو ہو۔

ایڈیٹر :اوہ۔ماموں جان۔۔۔آپ۔۔۔۔آیئے۔۔۔آیئے۔کب آئے آپ۔بیٹھئے۔

(دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

بزرگ :آج ہی، بلکہ یہ سمجھو بیٹا! ابھی۔سوچا سب سے پہلے اپنے عزیز سے مل آؤں۔تم نے جب سے گاؤں چھوڑا ہے یار دوست، بزرگ، رشتے دار سب کو بھلا دیا۔

ایڈیٹر :جی کیا عرض کروں ماموں جان کام ہی سے فرصت نہیں ملتی۔

(ایڈیٹر ٹیبل بیل بجاتا ہے۔فقیر چند داخل ہوتا ہے)

ایڈیٹر :دیکھو فقیر چند! جلدی سے دو گلاس شربت خون افزا بنا لاؤ۔

فقیر چند :جی۔

ایڈیٹر :دیکھو دو نہیں تین۔

فقیر چند :جی صاحب۔(فقیر چند جاتا ہے)

بزرگ :کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں بیٹا۔اور میری تو پوری زندگی کا نچوڑ یہ ہے کہ ہر کام اپنے وقت پر ہوگا۔چاہے ہم کریں چاہے کوئی اور، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ۔۔۔اے ہاں

اس سے ملو پہچانا اسے ۔کہاں سے پہچانو گے بیٹا۔ اتنا سا تھا جب تم نے دیکھا تھا۔
آداب کرو بیٹا۔

لڑکا :آداب عرض کرتا ہوں بھائی صاحب۔

ایڈیٹر :آداب عرض بھائی۔ کہو کیسے ہو۔

لڑکا :جی آپ کی دعا ہے۔

بزرگ :اوراگر سچ پوچھو تو تمہارا یہ چھوٹا بھائی ہی مجھے یہاں کھینچ لایا ہے ورنہ تم جانو گھر سے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ اس سال دسویں درجے کا امتحان دیا ہے اس نے ۔سب جماعتوں میں اول آتا رہا ہے۔

ایڈیٹر :ماشاءاللہ بہت ہونہار ہے۔

بزرگ :تم ایسے بڑے بھائیوں کے صدقے یہ بھی کسی قابل ہو جائے گا۔ بزرگوں کا نام روشن کرے گا۔اس کے استادوں کا خیال ہے کہ یا تو یہ بہت بڑا انجینئر بنے گا یا پھر ادیب۔

ایڈیٹر :ادیب۔

بزرگ :ہاں بیٹا ادیب! دسویں درجے کا امتحان دینے کے بعد ان دو مہینے کی چھٹیوں میں اس نے کوئی پچاس کے قریب کہانیاں قلم برداشتہ لکھ ڈالی ہیں۔

ایڈیٹر :(پریشان ہوکر) پچاس کہانیاں؟

بزرگ :اور چھ سو صفحے کا ناول۔

ایڈیٹر :(اور بھی پریشان ہوکر) چھ سو صفحے کا ناول؟

بزرگ :دکھاؤ بیٹے بھائی کو اپنی چیزیں دکھاؤ۔ میرا ارادہ تو اسے انجینئر بنانے کا تھا۔لیکن تم جانو بچے جب جوان ہو جائیں تو والدین کو ان کی خواہشات کا احترام کرنا چاہئے۔اب یہ ادیب بننے پر مصر ہے تو تم جانو بیس روپیہ پھاڑا خرچ کرکے اسے تمہارے پاس لایا ہوں کہ تم خدا نظر بد بچائے اخبار کے ایڈیٹر ہو نیک ہی صلاح دو گے اور کچھ پیسے ہاتھ لگ جائیں گے۔

ایڈیٹر :(بہت پریشان ہوکر) پیسے؟

بزرگ : پیسوں کا مجھے زیادہ لالچ نہیں۔تم جانتے ہو میں نے رام دھن بڑھئی ایسے نمک حرام کا قرض صرف اسی لیے معاف کر دیا تھا کہ اس کے یہاں کانسی کی ایک پرات پیتل کی دو ایک کٹوریوں اور چند پھٹے پرانے گودڑوں کے علاوہ۔۔۔۔۔۔

ایڈیٹر : لیکن ماموں جان! یہ تو ابھی بچہ ہے۔

بزرگ : ہاں ہے تو بچہ ہی لیکن تم جانو، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔لال تو ماں کی گود ہی میں پہچان لیے جاتے ہیں۔کیا خیال ہے تمہارا۔ناول کا دو روپیہ صفحہ تو مل ہی جائے گا۔

ایڈیٹر : (اتنا ہی پریشان ہو کر) ہزاروں روپیہ؟

بزرگ : بھئی اس میں تمہاری محنت ہوگی اس کا۔۔۔۔مجھے اتنا اوچھا نہ سمجھو کہ۔۔۔

ایڈیٹر : ماموں جان۔(سر جھکا کر) آپ میری درخواست قبول فرمائیں گے؟

بزرگ : کہو کہو۔میں نے کب تمہاری کوئی بات ٹالی ہے۔تم جانو ایک بار تم نے۔۔۔۔

ایڈیٹر : میرا مشورہ یہ ہے ماموں جان کہ صاحبزادے کو انجینئر بنایئے اپنی اس عمر میں اگر یہ پچاس کہانیاں اور چھ سو صفحے کا ناول لکھ سکتا ہے اور وہ بھی صرف دو مہینے میں تو میرا خیال ہے دنیا بھر کے ادیبوں کا رزق خطرے میں ہے۔

بزرگ : تم کیا کہہ رہے ہو بیٹے۔ذرا میرے سامنے اس کا یہ ناول تو پڑھ جاؤ۔

ایڈیٹر : یہ ناول پڑھ جاؤں۔آپ کے سامنے یعنی ابھی چھ سو صفحے کا ناول پڑھ جاؤں۔نہیں ماموں جان، خدا کے لیے صاحبزادے کو ادیب مت بنایئے۔انجینئر نہیں بننا چاہتا، تو بزازے میں کپڑے کی دوکان۔دہی بڑوں کا خوانچہ۔۔۔۔

بزرگ : (بھنا کر) کیا زیادہ کام کرنے سے تمہارا دماغ چل گیا ہے؟

ایڈیٹر : ہاں ماموں جان، میرا دماغ چل گیا ہے۔آپ نے ہمیشہ میری بات مانی ہے اگر آپ چاہیں تو واپسی کا کرایہ۔۔۔۔

بزرگ : آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔تم سمجھتے ہو کہ۔۔۔

ایڈیٹر : میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں ماموں جان اور اپنے آپ کو آپ کا انتہائی فرماں بردار بھانجا۔لیکن خدا کے لیے صاحبزادے کو ادیب نہ بنایئے ورنہ آپ کی ساری زمینیں۔

سارے مکان۔ساری جائیداد۔۔۔

بزرگ :ہونہہ۔چلو، اٹھو بیٹے۔مجھے کیا معلوم تھا۔۔۔لیکن تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔بھائی۔ دلی کے پانی کی تاثیر ہی ایسی ہے جسے دیکھو ا‌کڑفوں بنا ہوا ہے۔

لڑکا :آداب عرض ہے بھائی جان۔

ایڈیٹر :آداب عرض ہے بھائی (پیار سے شانہ تھپتھپا کر) کیا تم کسی طرح ادیب بننے سے باز نہیں آسکتے؟

لڑکا :جی ہرگز نہیں۔

بزرگ :دیکھا۔

ایڈیٹر :جی ہاں خوب دیکھا اور میرا خیال ہے آپ بھی خوب دیکھیں گے جب یہ آپ کی ساری زمین، سارے مکان، ساری جائیداد نیلام۔۔۔

(زور سے دروازہ کھول کر دونوں چلے جاتے ہیں)

ایڈیٹر :(ٹھنڈی سانس لے کر) پچاس کہانیاں اور چھ سو صفحے کا ناول۔۔۔

(فقیر چند ٹرے میں شربت کے گلاس لے کر داخل ہوتا ہے)۔۔۔۔یہ اب لائے ہو شربت فقیر چند، تم سے کوئی کام کو کہنا تو۔۔۔۔

فقیر چند :جی دکان پر بہت بھیڑ تھی۔

ایڈیٹر :دکاندار واپس نہیں کرے گا۔یہی نا۔۔۔تو پھینک دو۔

فقیر چند :جی۔

ایڈیٹر :نالی میں نہ پھینکنا، چاہو تو اپنے پیٹ میں پھینک لو۔جاؤ میری جان چھوڑ۔۔۔۔

(فقیر چند ابھی کھڑا ہے کہ فردوس داخل ہوتا ہے)

ایڈیٹر :۔۔۔اوہیلو، کہیے فردوس صاحب بہت دنوں کے بعد تشریف لائے۔

فردوس :ارے کیا بتاؤں دوست۔آج کل تو۔نفسیات پر کتاب لکھنے میں اس قدر مصروف ہوں کہ۔۔۔۔۔

ایڈیٹر :کبھی ہمارے لیے بھی کچھ لکھئے۔فقیر چند فردوس صاحب کو شربت پلاؤ۔

فقیر چند :جی۔

(ٹرے فردوس کی طرف بڑھاتا ہے۔فردوس گلاس لے کر آہستہ آہستہ سپ کرنے لگتا ہے۔)

ایڈیٹر :آپ کے پچھلے مضمون کی تعریف میں اتنے خط آئے فردوس صاحب اتنے کہ۔۔۔

فردوس :ارے یار یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ آج شام کو تمہارا کیا پروگرام ہے۔

ایڈیٹر : کچھ نہ پوچھئے فردوس صاحب! پرسوں پرچہ نکلنے کی تاریخ ہے اور ابھی تک ہمارے کاتب صاحب عنقا ہیں آدمی دوڑتے دوڑتے پٹواری ہو گئے لیکن کہیں سراغ نہیں ملا۔ کتابت کے لیے صرف چار کالم لے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ باقی دو دن بعد آ کر لے جاؤں گا۔ آدمی تو نیا تھا لیکن ہاتھ بہت اچھا تھا اور معلوم بھی ہوتا تھا ضرورت مند ہے۔ میں نے مستقل طور پر اسے کام دینے کا فیصلہ کر لیا اور کسی دوسرے کاتب سے ایک سطر بھی نہیں لکھوائی۔۔۔۔

فردوس :یہ سب تم جانو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ شام کو مشاعرے میں چل رہے ہو یا نہیں؟

ایڈیٹر :آپ شام کی بات کرتے ہیں فردوس صاحب میں اس گھڑی بلکہ اس لمحہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اگر وہ کاتب نہ ملا تو۔۔۔۔

فردوس :تو اس ہفتہ کا پرچہ نہیں چھپے گا۔ یہی نا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں تم شام کو مشاعرے میں کیوں نہیں چل رہے ہو۔

ایڈیٹر :فردوس صاحب، ہمارا پرچہ تیس کو آؤٹ ہو جانا چاہیے اور آج اٹھائیس ہے۔ آج نہ صرف اٹھائیس ہے بلکہ سولہ صفحوں میں سے میرے پاس ایک صفحہ بھی کتابت شدہ نہیں ہے۔ اور ایک بھی کتابت شدہ صفحہ نہ ہونے کا مطلب صاف ہے کہ۔۔۔۔

فردوس :پرچہ وقت پر نہ چھپ سکے گا۔

(ایک ہی گھونٹ میں شربت پی کر اور گلاس میز پر پٹک کر نکل جاتا ہے۔ فقیر چند بھی پیچھے پیچھے باہر چلا جاتا ہے)

ایڈیٹر :لیکن سنئے تو فردوس صاحب۔۔ فردوس صاحب کیا مصیبت ہے (زور سے)

کشوری لال۔۔۔کشوری لال جی۔۔۔

(دروازہ کھول کر کشوری لال اندر آتا ہے)

کشوری لال: جی۔

ایڈیٹر : جناب! آپ کو کچھ معلوم ہے آج تمام ایجنٹوں کو خطوط جانے ہیں۔آپ کہاں گل چھرے اڑاتے پھر رہے ہیں۔اب تک کتنے خط ٹائپ ہوئے۔

کشوری لال: جی تین۔

ایڈیٹر : صرف تین۔دو سو بارہ میں صرف تین۔

کشوری لال: جی آپ ہی نے روک دیا تھا کہ۔۔۔۔۔

ایڈیٹر : میں نے روک دیا تھا؟۔۔۔۔میں کبھی کسی کو نہیں روکتا۔۔۔مجھے آج شام تک دو سو بارہ خطوط۔۔۔(دروازہ کھول کر رحمان داخل ہوتا ہے۔)

۔۔۔کہاں وہ مل گیا؟ رحمان! کیا وہ کاتب مل گیا۔

رحمان : جی نہیں ساب۔سب جگہ ڈھونڈ ڈالا لیکن۔۔۔۔

ایڈیٹر : سب ڈھونڈ ڈالا۔کیسے سب ڈھونڈ ڈالا۔۔۔مجھے بے وقوف مت بناؤ رحمان۔ ڈھونڈھنے سے تو انسان اپنے آپ کو ڈھونڈ سکتا ہے اور تم کہتے ہو وہ کاتب کا بچہ نہیں ملا۔

رحمان : جی نہیں ملا ساب۔

ایڈیٹر : جی کیوں نہیں ملا ساب۔

رحمان : جی نہیں ملا۔

ایڈیٹر : میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کیوں نہیں ملا؟

(دروازہ کھول کر فقیر چند اندر داخل ہوتا ہے)

فقیر چند : جی مل گیا ساب

ایڈیٹر : (خوش ہو کر) مل گیا۔کہاں ہے۔بلاؤ۔دیکھو ذرا احتیاط سے بلاؤ۔

فقیر چند : جی یہ رہا (ایک کاغذ بڑھاتا ہے) صرف پندرہ پرچوں کا آرڈر ہے۔آپ کہتے تھے بیس۔۔۔۔

ایڈیٹر :کاتب ملا یا آرڈر؟

فقیر چند :جی آرڈر۔

ایڈیٹر :(غصے سے) آرڈر کو جہنم میں ڈالو، مجھے آرڈر نہیں کاتب چاہیے۔

فقیر چند :جی کون سا کاتب؟

ایڈیٹر :ملاحظہ فرمایئے کشوری لال جی۔ کہ کون سا کاتب؟

کشوری لال: جی اسے کیا معلوم کہ آپ۔۔۔۔

ایڈیٹر :جی اسے کیوں نہیں معلوم کہ پرچہ تیس کو نکلتا ہے اور آج اٹھائیس ہے۔

کشوری لال: جی یہ تو معلوم ہوگا۔

ایڈیٹر :کیوں فقیر چند جی! آپ کو معلوم ہوگا کہ پرچہ تیس کو نکلے گا؟

فقیر چند :جی ہاں۔

ایڈیٹر :اور یہ بھی معلوم ہے کہ آج اٹھائیس تاریخ ہے؟

فقیر چند :جی ہاں۔

ایڈیٹر :(چڑ کر) جی ہاں۔ آپ کو خاک معلوم نہیں۔ آپ کو صرف یہ معلوم ہے کہ تنخواہ پہلی تاریخ کو ملنی چاہئے۔

فقیر چند :جی نہیں۔

ایڈیٹر :کیا تنخواہ یکم کو نہیں ملتی۔

فقیر چند :جی ملتی ہے۔

ایڈیٹر :جی نہیں کیا؟ پھوٹو منہ سے کچھ تو پھوٹو۔۔۔ تنخواہ یکم کو مل جاتی ہے تنخواہ کے نوٹ گننا اور نقد روپوں کو چھ چھ بار گننا آتا ہے۔ اگر نہیں آتا تو پرچے کا خیال کرو اگر وقت پر نہیں چھپے گا تو یکم کو پیسے کیا گنو گے؟

فقیر چند :جی میں تو۔۔۔۔

ایڈیٹر :جی میں تو کچھ نہیں۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ تمہیں اس کاتب کا گم ہو جانا معلوم ہے۔

فقیر چند :جی کون سا کاتب۔

ایڈیٹر : جی کون سا کاتب! خوب! بہت خوب۔ کشوری لال جی اندھیر ہے (میز پر ہاتھ پٹک کر) آپ فرماتے تھے سارا دفتر کاتب کو ڈھونڈ رہا ہے اور یہاں سوال ہے کون سا کاتب۔ آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ فقیر چند جی کہ کون سا کاتب۔ اگر میں یہ عرض کروں کہ آپ کی تقدیر کا کاتب تو آپ ان لفظوں کے معنی نہیں سمجھیں گے۔ سمجھے بغر ستیہ گرہ پر اتر آئیں گے کہ ہماری تنخواہ یکم کو ملنی چاہئے۔ اگلا چاہے چوری کرے، ڈاکہ ڈالے، جیب کاٹے ۔۔۔ (بہت زور سے دروازہ کھلتا ہے اور دل باغ رائے داخل ہوتا ہے)۔۔۔ آپ کون صاحب ہیں۔

دل باغ رائے: جی میں ''نئی پرانی دنیا'' کے ایڈیٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔

ایڈیٹر : فرمایئے۔ تشریف رکھیے۔۔۔ کشوری لال جی آپ لوگ ذرا باہر۔ (سب باہر چلے جاتے ہیں۔ دل باغ رائے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

دل باغ رائے: تو کیا آپ ہی ''نئی پرانی دنیا'' کے ایڈیٹر ہیں۔

ایڈیٹر : جی ہاں، خاکسار ہی ہے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

دل باغ رائے: خدمت کے لیے ہی تو حاضر ہوا ہوں، آپ کی۔

ایڈیٹر : کیا آپ کتابت کے لئے ۔۔۔۔۔

دل باغ رائے: کتابت کے لئے نہیں میں آپ کو مزہ چکھانے کے لئے آیا ہوں۔

ایڈیٹر : (تعجب سے) مزہ چکھانے۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

دل باغ رائے: جی آپ ابھی میرا مطلب سمجھ پائیں گے۔ شریف آدمیوں کی پگڑی اچھالنا اتنا آسان نہیں جتنا آپ اس ہاتھ بھر کی کرسی پر بیٹھ کر سمجھتے ہیں۔

ایڈیٹر : کرسیاں تو جناب سبھی ہاتھ بھر کی ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ آپ بھی جس کرسی پر رونق افروز ہیں وہ بھی ہاتھ بھر کی ہے۔ آپ بڑی خوشی سے مزہ چکھانے کا عمل شروع فرمایئے۔ (کشوری لال کو زور سے آواز دیتا ہے) کشوری لال

دل باغ رائے: مجھ سے مذاق مت کیجئے جناب۔ کیا آپ سمجھتے اس طرح آپ بچ جائیں گے۔

ایڈیٹر : مزہ چکھنے سے بھلا کون بچنا چاہے گا۔

دل باغ رائے: مزہ میں نہیں آپ کو عدالت چکھائے گی اور ایسا چکھائے گی کہ۔۔۔۔

ایڈیٹر : کیوں صاحب! یہ عدالت نام کی چیز مجھے کیوں مزہ چکھائے گی۔

دل باغ رائے: اس لیے کہ آپ اپنے دوکوڑی کے اخبار میں بکواس چھاپتے ہیں۔ شریف لوگوں پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔

ایڈیٹر : شریف لوگ۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے۔ جناب شریف تو شریف ''نئی پرانی دنیا'' میں کبھی بدمعاش سے بدمعاش لوگوں پر بھی کیچڑ نہیں اچھالا گیا۔ آپ کہیں بھول سے تو یہاں نہیں آ گئے۔

دل باغ رائے: جی نہیں۔ آج تو خوب یاد کر کے آیا ہوں۔ البتہ پھر کبھی بھول کر بھی ادھر قدم نہ رکھوں گا۔ کیونکہ پھر میں نہیں آؤں گا۔ آپ میرے پاس آئیں گے۔

ایڈیٹر : کیا میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ مجھے یہ سعادت کیوں نصیب ہوگی۔

دل باغ رائے: اس لیے کہ آپ نے میری بےعزتی کی ہے ان سلٹ کی ہے پچھلے پرچے میں آپ نے ایک واہیات کہانی چھاپی جس میں صاف صاف میری ہتک کی گئی ہے اور میں آپ کو اس ہتک کا مزہ چکھا کر دم لوں گا۔

ایڈیٹر : ابھی آپ فرما رہے تھے کہ مزہ عدالت چکھائے گی۔ خیر مزہ چکھانے کا آپ کو اور عدالت کو دونوں کو پورا پورا اختیار ہے لیکن میری اطلاع کے لیے اتنا تو فرما دیجیے کہ آخر اس میں آپ کو اپنی ہتک کیوں نظر آئی۔

دل باغ رائے: اس لیے کہ اس میں میری ہتک کی گئی ہے۔

ایڈیٹر : کہانی کا نام آپ کو یاد ہوگا۔

دل باغ رائے: خوب اچھی طرح ''سبز باغ''۔

ایڈیٹر : ہیرو کا نام۔

دل باغ رائے: ہیرو نہیں، اس میں آپ نے مجھ کو چھوٹی ذات کے اک فرد کے روپ میں پیش کیا ہے۔

ایڈیٹر : اس کا نام۔

دل باغ رائے: اس کا کوئی نام نہیں رکھا گیا۔ صرف اس کا حلیہ اور اس کی عادتیں بیان کر کے میری

توہین کی گئی ہے۔ مجھے دل باغ رائے خیراتی مل کہتے ہیں۔صدر میں میری آڑہت کی دوکان ہے۔

ایڈیٹر :تو اس میں آپ کی توہین یا انسلٹ وغیرہ وغیرہ کا کون سا پہلو نکل آیا؟

دل باغ رائے :نکلتا ہے۔

ایڈیٹر :کیسے نکلتا ہے؟

دل باغ رائے :میں جو کہتا ہوں نکلتا ہے۔

ایڈیٹر :جی یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔

دل باغ رائے :اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔

ایڈیٹر :فیصلہ تو آپ خود ہی سنا رہے ہیں۔

دل باغ رائے :خیر دیکھا جائے گا۔ایک ہی پیشی میں یہ ایڈیٹری وڈیٹری ہوا نہ ہو گئی ہو تو میرا نام بھی دل باغ رائے خیراتی مل چھوڑ کر کوڑا کباڑ رکھ دیجئے گا۔

ایڈیٹر :ہونہہ سب پتہ چل جائے گا۔

(زور سے دروازے کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

ایڈیٹر :اف توبہ ہے۔کیسے کیسے جانوروں سے پالا پڑا ہے۔(بیل بجاتا ہے) اے اور حمان۔کیا سب مر گئے۔

(فقیر چند داخل ہوتا ہے)

فقیر چند :جی لنچ ٹائم۔۔۔۔۔

ایڈیٹر :لنچ ٹائم۔اچھا تو یہ پورا دفتر لنچ اڑا رہا ہے۔ایک بجتے ہی سب کے پیٹوں میں چوہے کودنے لگتے ہیں۔فقیر چند۔تم کیوں لنچ کھانے نہیں گئے۔کیا تمہیں بھوک نہیں لگی؟

فقیر چند :جی لگی تو ہے لیکن۔۔۔۔

ایڈیٹر :لیکن کیا؟ آج مجھے کھانے کا ارادہ ہے؟

فقیر چند :جی۔

ایڈیٹر :جی یعنی ہے مجھے کھانے کا ارادہ۔

فقیر چند :جی نہیں۔

ایڈیٹر :تو جاؤ۔موج اڑاؤ۔لنچ کھاؤ۔میرا بھیجا کیوں کھا رہے ہو۔

(فقیر چند جاتا ہے۔اس کے بعد آہستہ آہستہ ایڈیٹر کے کمرے کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ایڈیٹر کاغذوں پر جھکا ہوا ہے روشنی مدھم پڑ جانے پر اور لمحہ بھر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد روشنی پھر تیز ہو کر سابقہ حالت پر آجاتی ہے اب سامنے کے کلاک میں چار بج رہے ہیں۔)

ایڈیٹر :رحمان۔اے اور رحمان

رحمان :جی ساب۔

ایڈیٹر :جی ساب کے بچے کب سے بیٹھا چلا رہا ہوں۔

رحمان :جی میں کشوری لال جی کے لیے چائے لانے گیا تھا۔

ایڈیٹر :(طنز سے) کشوری لال جی چائے نوش فرما رہے ہیں نہ۔

رحمان :جی۔

ایڈیٹر :خوب خوب کیوں نہیں۔کسی بندہ خدا کو کام کی کچھ فکر ہو۔جب نا۔تم نے چائے پی؟

رحمان :جی نہیں۔

ایڈیٹر :کیوں نہیں۔تم بھی پیو اور سنو صرف چائے کیوں سب کے سب دفتر والے بھنگ پی کر کیوں نہیں سو جاتے۔

رحمان :جی۔

ایڈیٹر :جی کے بچے وہ کاتب آیا؟

رحمان :جی نہیں آیا۔

ایڈیٹر :تو سنو رحمان۔مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج سے تم اپنی ملازمت ختم سمجھو۔یکم کو آکر اپنا حساب کتاب کر لینا۔

رحمان :حضور میں تو۔۔۔

ایڈیٹر :میں حضور وضور کچھ نہیں جانتا۔مجھے چام سے نہیں کام سے غرض ہے۔اگر کاتبوں کے

آگے پیچھے بھاگنے کا کام بھی مجھی کو کرنا ہے تو آپ لوگ کیا یہاں مکھیاں مارنے کے لیے رکھے گئے ہیں؟

رحمان :جی صاحب میں پھر جاتا ہوں۔

ایڈیٹر :پھر کہاں جاتے ہو۔اب تو سیدھے گھر کو جانا۔

رحمان :جی نہیں حضور میں کاتب کو ڈھونڈنے جاتا ہوں۔

ایڈیٹر :اور اب بھی کاتب نہ ملا تو۔

رحمان :تو میں دوسرا کاتب لے آؤں گا۔

ایڈیٹر :دوسرا کاتب، دوسرے کاتب۔کی ایسی تیسی پرچے کا ضروری مسودہ کاتب کے پاس ہے اور تم کہتے ہو دوسرا کاتب۔

رحمان :جی اسی کو ڈھونڈھوں گا۔

ایڈیٹر :ڈھونڈوں گا نہیں۔اب کے مجھے صرف یہ اطلاع دینے آنا کہ اسے ڈھونڈ لیا ہے سمجھے اور اگر ڈھونڈ سکتے ہو تو ابھی بتاتے جاؤ اور سب دفتر والوں سے کہتے جاؤ کہ کل سے وہ سب چھٹی کریں، مجھے ایسے نمک حراموں کی ضرورت نہیں، کہ پرچہ نہ چھپنے پر بھی ٹھیک ایک بجے جن کے پیٹ پیٹھ سے جالگیں اور چار بجنے میں ایک منٹ ادھر نہ ادھر ہو کہ چائے حاضر ہونی چاہیے۔اب تم جا سکتے ہو اور صرف اسی صورت میں آسکتے ہو جب کم سے کم تم اس کمبخت پاجی شیطان کو اپنے ساتھ لاؤ۔

(رحمان بے دلی سے جاتا ہے)

ایڈیٹر :(روک کر) اور سنو فقیر چند سے بھی کہو کہ وہ بھی اس حماقت کے پوٹلے کو ڈھونڈھنے جائے۔

رحمان :جی۔

ایڈیٹر :اور کشوری لال جی تو چائے نوش فرما رہے ہوں گے۔

رحمان :جی۔

ایڈیٹر :جی کیا؟

رحمان : جی کچھ نہیں۔

ایڈیٹر : جی کیوں نہیں۔ کیا تم نے انھیں چائے لاکر نہیں دی۔

رحمان : جی لا کر دی۔

ایڈیٹر : تو پھر کیوں کچھ نہیں۔ چائے نوش فرما رہے ہیں۔ فرمانے دو۔ اگر آج وہ کاتب نہ آیا تو کل سے دفتر کے بجائے گھر پر نوش فرمایا کریں گے۔ جاؤ اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔

رحمان : جی۔

ایڈیٹر : پھر وہی جی۔

رحمان : جی میں نے کہا کہ۔۔۔

ایڈیٹر : کیا آپ مجھ پر اتنا کرم فرما سکتے ہیں رحمان صاحب کہ آپ مجھ سے کچھ نہیں کہیں گے اور ایک منٹ ضائع کیے بغیر اس کاتب کو۔۔۔

رحمان : جی۔

ایڈیٹر : (پھر روک کر) اور سنو کشوری لال جی سے کہتے جاؤ چاہے گورنر صاحب بھی مجھ سے ملنے آئیں۔ میرے کمرے میں کسی کو گھسنے نہ دیا جائے۔

رحمان : جی۔

ایڈیٹر : جی نہیں۔ اچھی طرح سے کہہ دو اور اب اگر کوئی میرے دفتر میں آیا تو میں پورے دفتر کو آگ لگا دوں گا سمجھے۔

رحمان : جی سمجھ گیا۔

ایڈیٹر : کیا سمجھ گئے۔

رحمان : کہ آپ پورے دفتر کو آگ۔۔۔

ایڈیٹر : شاباش میرے دوست! بس اتنا ہی سمجھے کہ دفتر کو آگ لگا دوں گا۔

رحمان : جی نہیں۔

ایڈیٹر : اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ اور بھی سمجھے ہو۔

رحمان : جی ہاں سب کچھ سمجھ گیا۔

ایڈیٹر : کیا سمجھ گیا آخر میں بھی تو سنوں۔

رحمان : کہ جب تک وہ کاتب۔

ایڈیٹر : اور کیا سمجھے؟

رحمان : اور کسی شخص کو آپ کے کمرے میں نہ گھسنے دیا جائے۔

ایڈیٹر : اس کاتب کے علاوہ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کاتب کو بھی نہ گھسنے دیا جائے۔

رحمان : جی اس کاتب کے علاوہ۔۔۔۔

ایڈیٹر : اور

رحمان : اور یہ کہ جب تک۔

ایڈیٹر : ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ یہ دونوں باتیں کافی ہیں۔ دیکھو اگر خوبی تقدیر سے وہ کاتب مل جائے تو یہ مت کہنا کہ میں خفا ہو رہا ہوں۔

رحمان : جی نہیں۔

ایڈیٹر : خالی خولی نہیں۔ کان کھول کر سن لو، ورنہ وہ آئے گا اور اگر وہ نہ آیا تو تم جانتے ہو۔

رحمان : جی میں جانتا ہوں۔

ایڈیٹر : اگر تم جانتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تمہارے آنے تک میں اپنا ایڈیٹوریل لکھ لوں گا۔ اور اگر وہ کاتب مل گیا تو اب بھی۔ میرا مطلب ہے اتنی دیر ہو جانے پر بھی میں کسی نہ کسی طرح یکم تک پرچہ نکال دوں گا۔ چاہے میرے پورے کنبہ کو کتابت کرنی پڑے۔ اب جاؤ۔ (جی کہہ کر رحمان چلا جاتا ہے۔ ایڈیٹر لکھنے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ دہراتا جاتا ہے) چین کے وزیر عظیم ۔۔۔ چو این لائی۔ ۔۔۔ اور ہندوستان کے وزیر اعظم ۔۔۔ پنڈت نہرو۔۔ کی یہ ۔۔۔ ملاقات ۔۔ کوئی ۔۔۔ کوئی ہندوستان اور چین کی تاریخ میں یہ واقعہ۔۔۔۔

(رحمان پھر داخل ہوتا ہے)

ایڈیٹر : (کڑک کر) پھر وہی میں نے تم سے کہا تھا رحمان کہ۔۔۔

رحمان : جی وہ کاتب۔۔

ایڈیٹر :کاتب۔کون کاتب۔

رحمان :جی وہی کاتب۔

ایڈیٹر :(دبی زبان سے) وہی کاتب۔کیاوہ کاتب مل گیا۔

رحمان :جی ہاں وہ خود ہی آ گیا ہے باہر بیٹھا ہے۔

ایڈیٹر :باہر بیٹھا ہے، باہر کیوں بیٹھا ہے اسے اندر بھیجو فوراً بھیجو۔

رحمان :جی۔

(رحمان جاتا ہےاور کاتب داخل ہوتا ہے)

کاتب :السلام علیکم۔

ایڈیٹر :وعلیکم السلام۔آیئے تشریف لایئے کہیے (کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

کاتب :(کرسی پر بیٹھتے ہوے) شکریہ آپ کچھ مصروف ہیں شاید۔

ایڈیٹر :جی نہیں۔ میں بالکل مصروف نہیں۔آپ بتایئے۔آپ کو آنے کی فرصت بہر حال مل گئی ہے۔

کاتب :جی ہاں۔آپ ہی کا کام کر رہا تھا۔عام کاتبوں کی طرح میری عادت نہیں کہ دس جگہ کام کرتا پھروں۔ایک ہی کام لیتا ہوں اور ختم کرتا ہوں۔کسی کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔

ایڈیٹر :پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔تو آپ کا خیال ہے ہم لوگ خوشی سے ناچ گا رہے ہیں آپ نے تو قبلہ ہماری لٹیا ہی ڈبودی تھی۔ ہماری برسوں کی ساکھ ختم کر دی ہمیں کہیں کا نہ رکھا اور اس پر فرماتے ہیں کہ آپ سے کسی کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔کیا اس سے پہلے آپ نے کسی ہفتہ وار پرچہ میں کام کیا ہے؟

کاتب :جی،عمر گزری ہے اسی دشت کی۔۔۔

ایڈیٹر :(بات کاٹ کر) بس بس شاعری رہنے دیجئے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ ہر روش مجھ سے اپنی کارگزاری۔۔۔

کاتب :دراصل میں دور رہتا ہوں صاحب اور پھر آپ نے فرمایا تھا ابھی مضامین بھی تیار نہیں ہیں۔

ایڈیٹر : مضامین۔مضامین تیار ہوتے کون سی دیر لگتی ہے۔ یہ قینچی سلامت رہے۔آپ تو بہت سے ہفتہ وار اخباروں میں کام کر چکے ہیں۔

کاتب : اسی لیے تو میں سمجھا کہ آپ مضامین کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے ہوں گے۔

ایڈیٹر : دوڑ دھوپ۔

کاتب : جی ہاں! میں نے جس کسی پرچے میں کام کیا اس کے ایڈیٹر کو مضامین کے لیے پریشان ہی دیکھا۔ یہ ادیب لوگ بڑے واہیات ہوتے ہیں۔ ذرا سی تعریف کر دیجئے۔ ایسے نخرے بگھاریں گے کہ خدا کی پناہ۔

ایڈیٹر : خیر، اب یہ تبصرہ نگاری چھوڑ یئے۔ یہ بتایئے کہ آپ دو دن تک یہاں دن رات بیٹھ کر کام کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس دفتر میں میرے سامنے۔

کاتب : اس کی کیا ضرورت ہے؟

ایڈیٹر : تو آپ کے خیال میں اس کی ضرورت ہی نہیں اور بہت سادہ لوح ہیں آپ۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ پر بھروسہ کر کے، بلکہ صاف پوچھئے تو آپ کے جھانسے میں آ کر کسی دوسرے کاتب کو کام نہیں دیا۔

کاتب : ٹھیک ہی تو کیا آپ نے۔ جب میں آپ سے وعدہ کر گیا تھا کہ اب میں آپ کا پرچہ پورا لکھ دیا کروں گا۔

ایڈیٹر : پورا پرچہ۔ جی ہاں بندہ پرور میں اسی خوش فہمی میں ہی تو مبتلا رہا کہ آپ پورا پرچہ لکھ دیں گے اور میں نے کسی دوسرے کاتب کو۔۔۔۔

کاتب : میں پھر عرض کرتا ہوں جناب کہ اس کی کیا ضرورت۔۔۔۔

ایڈیٹر : ضرورت۔ دیکھئے مجھے طیش مت دلایئے میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں اس طرح کے چونچلے مجھے نہیں آتے۔

کاتب : چونچلوں کی کیا ضرورت جناب۔۔۔۔۔

ایڈیٹر : پھر وہی ضرورت۔ میں کہتا ہوں آپ کو کام نہیں کرنا تھا تو پہلے کیوں نہ بتایا۔ ہمارا بیڑہ غرق کر کے کیا آپ کو کوئی روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ میں نے آپ سے کہا

نہیں تھا کہ پرچہ تیس کو آؤٹ ہوگا۔

کاتب : جی کہا تھا۔

ایڈیٹر : آج کیا تاریخ ہے۔

کاتب : جی اٹھائیس۔

ایڈیٹر : آج اٹھائیس تاریخ ہے اور پرچہ تیس کو آؤٹ ہوگا اور پرچہ سولہ صفحے کا ہے اور آپ نے کمال کیا ہوگا تو صرف دو ورق لکھے ہوں گے۔ سچ پوچھیے تو اس کا بھی یقین نہیں۔

کاتب : جی لکھ لیے ہیں۔

ایڈیٹر : لکھ بھی لیے ہوں جب بھی جہازی سائز کے باقی تیرہ صفحے آپ لکھیں گے یا میرا باپ۔

کاتب : جی میں لکھوں گا، بلکہ میں نے لکھ بھی لیے ہیں۔

ایڈیٹر : لکھ بھی لیے ہیں کیا مطلب؟

کاتب : مطلب بالکل صاف ہے۔ بقیہ تیرہ صفحے بھی میں نے لکھ لیے ہیں دیکھیے۔

(پیلے کاغذوں کا پلندہ بڑھاتا ہے)

ایڈیٹر : (پلندہ لے کر) یہ کیا؟

کاتب : یہ آپ کا پورا پرچہ ہے۔ بالکل تیار۔ کتاب شدہ۔ تصحیح بھی ہو چکی، چاہیں تو نظر ڈالے بغیر ہی پریس کو بھیج سکتے ہیں۔

ایڈیٹر : (سخت پریشان ہو کر) بغیر دیکھے پریس بھیج سکتے ہیں۔ پورا پرچہ تیار ہے، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

کاتب : جی عرض کیا نا کہ پورا پرچہ تیار ہے۔ میں گھر میں بیکار نہیں بیٹھا رہا۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہے۔

ایڈیٹر : ذمہ داری۔ لیکن میں نے آپ کو صرف دو ورق کا میٹر دیا تھا۔ اور آپ کہتے ہیں کہ پورا پرچہ۔

کاتب : جی ہاں پورا پرچہ۔ آپ نے فرمایا تھا کہ باقی مضامین ابھی تیار نہیں اور مضامین کی وجہ

سے آپ پریشان تھے۔۔۔

ایڈیٹر : مضامین کی وجہ سے میں پریشان تھا۔

کاتب : اور میں آپ سے عرض کر چکا ہوں۔ مجھ سے کسی کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔

ایڈیٹر : لیکن میں نے تو آپ کو صرف دو ورق۔۔۔۔۔

کاتب : جی ہاں، دو کا میٹر تو آپ نے دیا تھا۔ باقی تیرہ صفحوں میں، میں نے اپنی ایک کہانی۔ حفظان صحت کے اصولوں پر ایک مضمون، اپنے چھوٹے بھائی کی چند نظمیں، غزلیں اور منتخب اشعار۔ قبلہ والد صاحب کی برسی پر کی گئی قوالی کی پوری تفصیل۔۔۔۔

ایڈیٹر : کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا۔۔۔؟

کاتب : اس طرح صرف نصف کالم کی جگہ بچ گئی تھی۔ اس کے لیے پہلے میں نے سوچا آپ سے چل کر کچھ لے لوں لیکن پھر اس خیال سے کہ دیر ہو جائے گی پشتہا پشت کے اپنے نورانی سرمے کے ایک تیر بہدف نسخے کا اشتہار شامل کر دیا اور اب پرچہ بالکل تیار ہے اور آپ چاہیں تو پریس۔۔۔ لیکن آپ، یہ ایک دم پریشان کیوں ہو گئے۔ آپ کے چہرہ کا رنگ۔۔۔ آپ کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ دیکھئے مجھ سے کسی کی پریشانی۔۔

ایڈیٹر : (مری ہوئی آواز میں چلا کر) رحمان۔۔۔۔ ارے او رحمان۔۔۔ (آہستہ آہستہ ٹیبل بیل بجانے کی آواز) کشوری لال جی۔۔۔ اجی۔۔۔۔ او کشوری لال جی۔ پانی۔۔۔ پانی۔۔۔ پانی۔۔۔!

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

اس منجدھار میں

• سعادت حسن منٹو

کردار

بیگم	....	ماں
امجد	....	بیگم کے بیٹے
مجید	....	بیگم کے بیٹے
سعیدہ	....	امجد کی نئی نویلی حسین بیوی
اصغری	....	خادمہ
کریم اور غلام محمد	....	نوکر

پہلا منظر

(**نگار ولا کا ایک کمرہ**—— اس کی خوبصورت شیشہ گی کھڑکیاں پہاڑی کی ڈھلوانوں کی طرف کھلتی ہیں۔ حد نظر تک پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے ہیں جو آسمان کی خاکستری مائل نیلاہٹوں میں گھل مل گئے ہیں۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردے صبح کی ہلکی پھلکی ہوا سے ہولے ہولے سرسرا رہے ہیں۔ یہ کمرہ جیسا کہ ساز و سامان سے معلوم ہوتا ہے حجلۂ عروسی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کو کھڑکیوں کے پاس ساگوان کی مسہری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کونے میں شیشے کی تپائی جس پر بلور کی صراحی اور گلاس کے علاوہ ایک ٹائم پیس رکھی ہے۔ پیچھے ہٹ کر پیازی ٹفیٹے میں ملبوس صوفہ سیٹ ہے اس پر دو ملازم گدیاں سجا رہے ہیں—— اس سے دور ہٹ کر ایک نوجوان خادمہ جو معمولی شکل وصورت کی ہے۔ آتشدان پر سجائی ہوئی۔ چیزوں کو اور زیادہ سجانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کمرے کی فضا میں ایسی دوشیزگی ہے جو ذرا سی جنبش سے منکوحیت میں تبدیل ہو سکتی ہے—— باہر سے ٹائلوں پر لکڑی کی ننھی ننھی ضربوں کی آواز آتی ہے۔ تینوں خادم ہلکے سے ردعمل کے بعد اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں —دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی وجیہہ عورت بیساکھیوں کی مدد سے اندر آئی ہے اور کمرے کا جائزہ لے کر اپنے اطمینان کا اظہار کرتی ہے)

بیگم صاحب: (بیساکھیوں کی مدد سے کمرے میں ادھر ادھر پھر کر تمام چیزوں کو صحیح مقام پر دیکھ کر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے) ٹھیک ہے! (ایک بیساکھی کو اپنی بغل سے الگ کر کے

صوفے کے بازو کے ساتھ رکھ کر بیٹھنا چاہتی ہے۔ مگر فوراً ہی اپنا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ سہارے کے لیے صوفے کے بازو کی چمکیلی سطح کے ساتھ چھوا تھا اور اس پر نشان پڑ گیا تھا۔ اپنے دوپٹے کا ایک کونہ پکڑ کر وہ یہ خود بخود مٹ جانے والا نشان بجھا دیتی ہے اور پھر بیساکھی اپنی بغل میں جما کر نوجوان خادمہ سے مخاطب ہوتی ہے) اصغری!

اصغری: (فوراً متوجہ ہو کر) جی!

بیگم صاحب: (ایک دم یہ محسوس کر کے کہ وہ بھول گئی ہے کہ اس نے اصغری سے تخاطب کیوں کیا تھا) میں کیا کہنے والی تھی؟

اصغری: (مسکراتی ہے) آپ یہ کہنے والی تھیں کہ آپ کا اطمینان نہیں ہوا...... میں بھی یہی سمجھتی ہوں بیگم صاحبہ ——— دولہن بہت خوبصورت ہے ——— اس کمرے کی تمام سجاوٹیں اس کے سامنے ماند پڑ جائیں گی۔ (وہ آتشدان کے عین درمیان میں ریشمی ڈوریوں سے آویزاں، دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے)۔

بیگم صاحب: (مسکراتی ہوئی ——— آتشدان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور اپنی بہو کی تصویر کو غور سے دیکھتی ہے ——— خوش ہوتی ہے لیکن ایک دم گھبرا سی جاتی ہے) اصغری!

اصغری: جی!

بیگم صاحب: صبح سے میری طبیعت ——— کچھ گھبرا سی رہی ہے۔

اصغری: امجد میاں جو آ رہے ہیں اپنی دولہن کے ساتھ۔

بیگم صاحب: (اپنے خیالات میں کھوئی کھوئی) ہاں......بس آنے ہی والا ہے......کمال موٹر لے گیا ہے اسٹیشن پر۔

اصغری: اگلے سال مجید میاں کی شادی کر دیجیے ——— گھر میں رونق ہی رونق ہو جائے گی۔

بیگم صاحب: انشاءاللہ ——— وہ بھی انشاءاللہ اسی طرح بخیر و خوبی انجام پائے گی......(زیرلب) انشاءاللہ

اصغری: (دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے اور اسکے حسن سے بہت متاثر ہوتی ہے) اللہ نظر بد

سے بچائے۔

بیگم صاحب: (غیر ارادی طور پر قریب قریب چیخ کر) اصغری!

اصغری: (سہم کر) جی!

بیگم صاحب: کچھ نہیں..... گاڑی کب آتی ہے کراچی سے؟

اصغری: معلوم نہیں بیگم صاحب۔

بیگم صاحب: اور میں نے کمال کو کس اسٹیشن پر بھیجا ہے .. (گھبرا کر) خدا معلوم میرے دماغ کو کیا ہو گیا..... امجد میاں کو رات راولپنڈی ٹھہرنا تھ ..... اپنے دوست سعید کے پاس ...اور وہ تو میرا خیال ہے اب وہاں سے چل بھی چکے ہوں گے (دوسرے خادم سے) غلام محمد؟

غلام محمد: جی؟

بیگم صاحب: تم دیکھو کمال کہاں ہے... موٹر کہاں لے گیا ہے؟

غلام محمد: بہت اچھا! (چلا جاتا ہے)

بیگم صاحب: (اصغری کے کاندھے کا سہارا لے کر) آج صبح سے میری طبعیت ٹھیک نہیں —— چلنے پھرنے سے معذور نہ ہوتی —— اس کم بخت ڈاکٹر ہدایت اللہ نے مجھے منع نہ کیا ہوتا تو مین دولہن کو ساتھ لاتی (دور سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے) میرا خیال ہے، شاید امجد میاں کے دوست کا ٹیلیفون ہے کہ وہ چل پڑے، جاؤ اصغری..... بھاگ کے جاؤ۔ (اصغری دوڑی باہر جاتی ہے)

بیگم صاحب: (کریم سے —— اپنی افسردگی دور کرنے کی خاطر) بس اب تو آتے ہی ہوں گے امجد میاں۔

کریم: اللہ خیر خیریت سے لائے۔

بیگم صاحب: (سراسیمہ ہو کر) کیوں کیا ہوا؟

(اصغری سخت اضطراب کی حالت میں اندر داخل ہوتی)

اصغری: بیگم صاحب —— بیگم صاحب

بیگم صاحب: (بیساکھیوں کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر) کیا ہے؟

اصغری: جی ..... مجید میاں کا ٹیلیفون آیا ہے کہ گاڑی ..... گاڑی ٹکرا گئی ہے۔

بیگم صاحب: (بیساکھیوں پر ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے) پھر؟

اصغری: مجید میاں اور ان کی دولہن دونوں زخمی ہوئے ہیں اور ہسپتال میں پڑے ہیں۔

بیگم صاحب: (ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے —— بیساکھیاں بغلی سے گر پڑتی ہیں۔ایک لمحے کے لئے وہ یوں کھڑی رہتی ہیں جیسے پتھر کا بت —— (پھر اس میں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے۔اور وہ دروازے کی جانب بڑھتی ہیں) کمال سے کہو، موٹر نکالے، —— ہم راولپنڈی جا رہے ہیں۔

(بیگم دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے۔غلام محمد اور اصغری دونوں حیرت زدہ ہیں۔ اصغری زور سے چیختی ہے—— بیگم پلٹ کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

بیگم صاحب: کیا ہے؟

اصغری: آپ—— آپ چل رہی ہیں—— چل سکتی ہیں۔

بیگم صاحب: میں؟ (اپنی بغلوں میں بیساکھیوں کی عدم موجودگی کا احساس کرتے ہوئے) میں؟ ...... میں کیسے چل سکتی ہوں؟

(ایک دم چکراتی ہے اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہیں)

اصغری: (بیگم کے پاس جاتے ہوئے، غلام محمد سے) غلام محمد جاؤ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو۔

(غلام محمد چلا جاتا ہے۔اصغری، بیگم کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی ہے)

پردہ

دوسرا منظر

(**وہی کمرہ جو پہلے منظر میں ہے**—— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو ساز و سامان پہلے پڑا تھا۔اب اپنا نیا نویلا پن کھو چکا ہے۔اب ہر چیز دیر کی استعمال شدہ معلوم ہوتی ہے —— صبح کا وقت ہے ۔کھڑکیوں کے ریشمی پردے صبح کی ہلکی پھلکی ہوا سے سرسرا رہے ہیں—— دائیں ہاتھ کی ساگوان کی مسہری پر دولہن سعیدہ کمبل اوڑھے لیٹی ہے—— شیشے کی تپائی پر پڑی ہوئی ننھی ٹائم پیس جس میں نو بجے ہیں ،لرزنا شروع کر دیتی ہے—— ہلکی سی گھنٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے —— کمبل میں جنبش پیدا ہوتی ہے—— سعیدہ کروٹ بدلتی ہے اور آنکھیں کھولتی ہے۔جھلا کر ننھی ٹائم پیس کی طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ایسا کرتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے پر چھائی ہوئی گھنی پلکیں پھڑ پھڑاتی ہیں—— کروٹ بدل کر وہ بستر میں تکیوں کا سہارا لے کر ذرا اوپر اٹھ آتی ہے اور باہر حد نظر تک پھیلی ہوئی پہاڑیوں کا دلکش منظر دیکھ کر بچوں کی سی مسرت محسوس کرتی ہے—— پھر ایک دم ٹانگیں چلا کر کمبل کو اوپر سے ہٹاتی ہے اور اچک کر مسہری سے اترتی ہے اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنا شروع کر دیتی ہے —— کسی خوش الحان پرندے کی آواز سنائی دے رہی ہے—— سعیدہ اپنے خیالوں میں محو ہے۔وہ جوان ہے۔شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا ریشمی لباس بھی جو اس کے بدن

سے دور دور اپنی حریری دنیا الگ بسائے ہے، اس کے خوبصورت خطوط سے غافل نہیں ......اور خود سعیدہ کا ادراک بھی......اس کا سراپا حسین جمیل ہے اور اپنے حُسن و جمال سے آگاہ......اصغری کی کرخت آواز، پرندے کی خوش الحانی کا تقابل پیش کرتی ہے۔ سعیدہ چونکتی ہے)

سعیدہ: (نگاہوں ہی نگاہوں میں ''کیا ہے''؟ پوچھتی ہے)

اصغری: مجید میاں ابھی ابھی ہسپتال سے آئے ہیں۔ کہتے تھے، جا کے دیکھو، اب جگ گئیں یا نہیں؟

سعیدہ: کیا خبر لائے ہیں؟

اصغری: میں انھیں بھیجتی ہوں۔

(اصغری چلی جاتی ہے۔ سعیدہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر سنگھار میز کے پاس آتی ہے۔ آئینے میں ایک لحظے کے لئے اپنے آپ کا جائزہ لیتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے بال سرسری طور پر ٹھیک کر کے مسہری کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ مسہری کے سرہانے اس کا جارجٹ کا سفید دوپٹہ لٹک رہا ہے۔ اسے اتارتی ہے اور بڑی بے توجہی سے اپنے کاندھوں پر ڈال لیتی ہے —— باہر سے بوٹوں کی چرمی آواز آتی ہے، خفیف سے ردعمل کے ساتھ سعیدہ دروازے کی جانب دیکھتی ہے —— مجید —— سانولے رنگ کا متوسط قد نوجوان، جو مضبوط ہاتھ پاؤں رکھتا ہے اور جس کے چہرے کے خطوط عمر کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور منجھے ہوئے ہیں اندر داخل ہوتا ہے)

مجید: سلام بھائی جان

سعیدہ: سلام

مجید: (صوفے کے پاس آکر رکتے ہوئے) طبیعت کیسی ہے آپ کی؟

سعیدہ: (بے دلی سے) ٹھیک ہے (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) سنایئے کیا خبر لائے راولپنڈی سے؟

مجید: (سعیدہ کے سامنے آکر) کوئی خاص نہیں (آدھی سی آہ بھر کر) بس اب انھیں لے

آئیں گے یہاں۔

سعیدہ: کیوں؟

مجید: وہ تنگ آگئے ہیں (ایک مونڈھا گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے) ان کی جگہ میں ہوتا تو...... بہت ممکن ہے میں نے خودکشی کر لی ہوتی۔

سعیدہ: (اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) کیا معلوم تھا کہ میری قسمت میں یہ لکھا ہے...... اتنے آدمی مرے...... میں بھی ساتھ ہی مر گئی ہوتی۔

مجید: مگر یہ اللہ کو منظور نہیں تھا۔

سعیدہ: (کھڑکی سے باہر پہاڑیوں کا منظر دیکھتی ہے) ہاں، یہ اللہ کو منظور نہیں تھا— اللہ کو یہ منظور تھا کہ میری ٹانگ پر ہلکی سی خراش آئے پر میری ساری زندگی زخموں سے چور چور ہو جائے (آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں— سفید دوپٹے سے وہ انھیں پر نزاکت طریقے سے ہولے ہولے خشک کرتی ہے) اللہ کو یہ منظور تھا کہ میرے سہاگ کی کمر ٹوٹ جائے اور میں ساری عمر ہوا میں کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ڈولتی رہوں۔

(سسکیاں لیتی ہے)

مجید: (اٹھتا ہے) بھابی جان حوصلے سے کام لینا چاہیے...... کیا پتا ہے وہ ٹھیک ہو جائیں۔

سعیدہ: (سرزنش کے طور پر) مجید، کم از کم تم تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو— چھ مہینے ہو گئے ہیں انھیں ہسپتال کی چارپائی کے ساتھ لگے ہوئے...... ڈاکٹروں کا جو فیصلہ ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں...... وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے...... ان کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو چکی ہیں...... لیکن...... لیکن، میں ایک بات مانتی ہوں کہ ان میں بہت حوصلہ ہے...... میں جب بھی ان کے پاس گئی۔ انھوں نے مجھے پاس بٹھا کر کہا، سعیدہ، کچھ فکر نہ کرو، میں بہت جلد تندرست ہو جاؤں گا...... اور پھر میں تمھیں ان پہاڑیوں کی سیر کراؤں گا جن کا ذکر تم کراچی میں اتنی بار میرے منہ سے سن چکی ہو...... مجھے ان پہاڑیوں سے پیار ہے...... اتنا پیار ہے کہ تم ان کے متعلق اور سنو گی تو رشک کرو گی...... اور وہ مجھے حوصلہ دینے لگتے کہ سعیدہ دنیا حادثوں کا دوسرا نام ہے...... میں

تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری جان نہیں گئی......ورنہ......پھر وہ ایسی بات کہتے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

مجید: کیا؟

سعیدہ: (نمناک آنکھوں سے خلا میں دیکھتے ہوئے) کہ تم......کہ تم میرے بعد کسی اور کی ہو جاؤ گی—(کانپ جاتی ہے......وہ......ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں مجید؟

مجید: معلوم نہیں۔

سعیدہ: تمہیں معلوم ہونا چاہیے (آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے—دوپٹہ ڈھلک آتا ہے—حریری لباس میں اس کا متلاطم سینہ ریشمی اتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے) تم مرد ہو......تم اس کے بھائی ہو......اگر اس حادثے کے تم شکار ہوتے......تو؟

مجید: میں کبھی ایسی باتیں نہ سوچتا جو امجد بھائی سوچتے ہیں؟

سعیدہ: کیوں؟

مجید: ہم دونوں مرد ہیں—دونوں بھائی ہیں—مگر دل اور دماغ کے اعتبار سے ہم دونوں بہت مختلف ہیں۔

سعیدہ: (بڑبڑاتی ہے) دل......اور دماغ۔

(اصغری داخل ہوتی ہے)

اصغری: مجید میاں، آپ کو بیگم صاحب بلاتی ہیں۔

مجید: چلو میں آتا ہوں۔

اصغری: انھوں نے کہا ہے جلدی آئیے۔

مجید: اچھا......(سعیدہ کی طرف دیکھ کر) میں ابھی آتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

اصغری: (فرش پر بچھے ہوئے رگ پر سعیدہ کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے اور اس کے پاؤں کی انگلیاں چٹخانا چاہتی ہے)

سعیدہ: (پاؤں ایک طرف کھینچ کر) جانے دو اصغری۔

اصغری: (پاؤں سے قریب قریب لپٹ کر) نہیں دولہن بیگم۔(انگلیاں چٹخانا شروع کر دیتی ہے..... کیا خبر لائے ہیں مجید میاں۔

سعیدہ: کہتے تھے۔وہ یہاں آنا چاہتے ہیں۔

اصغری: یہ تو بڑی خوش خبری کی بات ہے۔

سعیدہ: (دکھ کے ساتھ) ہاں!

اصغری: پر بیگم صاحب تو بہت ناراض ہو رہی تھیں کہ اتنی دیر کیوں لگا دی مجید میاں نے۔

سعیدہ: کہاں؟

اصغری: یہاں—— آپ کے پاس

سعیدہ: میرے پاس؟ کیا کہتی تھیں بیگم صاحب۔

اصغری: کچھ نہیں—— ان کا مزاج آج کل بہت چڑ چڑا سا رہتا ہے—— انھیں کوئی بات اچھی نہیں لگتی—— انھیں..... امجد میاں کا اتنا دکھ نہیں جتنا آپ کا ہے..... ہر وقت آپ ہی کے متلق سوچتی رہتی ہیں—— تو..... امجد میاں ٹھیک ہو گئے ہیں نا؟

سعیدہ: چڑ کر، اپنا پاؤں ہٹا کر اٹھتے ہوئے) ہاں ٹھیک ہو گئے ہیں۔

(بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہے۔اصغری اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

سعیدہ: سلام خالہ جان!

بیگم صاحب: سلام بیٹا—— جیتی رہو (پاس آ کر سعیدہ کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیرتی ہے) تمھیں معلوم ہو گیا مجید سے کہ.....

سعیدہ: جی ہاں!

بیگم صاحب: غریب تنگ آ گیا ہے وہاں ہسپتال میں..... (اصغری کی طرف دیکھ کر) اصغری تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے)

بیگم صاحب: اس کی..... اس کی خواہش ہے کہ وہ تمھارے پاس رہے..... اس نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میری سعیدہ میری نظروں کے سامنے ہونی چاہیے.....

سعیدہ: (آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔بیگم کے گلے سے لگ جاتی ہے)

بیگم صاحب: (آنکھوں سے آنسو رواں ہیں) وہ..... وہ تم سے بے اندازہ محبت کرتا ہے..... لیکن ..... لیکن اس نے کہا تھا تم سے پوچھ لیا جائے کہ تمھیں اس کے یہاں آ کر رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں

سعیدہ: اعتراض.....

بیگم صاحب: ہاں بیٹا ـــــ ہوسکتا ہے، یوں تمھارے دکھ میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

سعیدہ: وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں ـــــ خالہ جان وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔

بیگم صاحب: بیٹا، وہ کچھ ایسے ہی دل و دماغ کا آدمی ہے ـــــ اس کو دوسروں کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔

سعیدہ: آئیں..... کیوں نہ آئیں (لہجے میں تیخ سی پیدا ہو جاتی ہے) وہ ایسی باتیں نہ کریں۔

بیگم صاحب: ڈاکٹروں نے کہا ہے، اگر وہ خوش رہے تو انشاءاللہ ایک دو مہینے میں بیساکھیوں کی مدد سے چل پھر سکے گا..... (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) بیساکھیاں ..... جو اس کے گاڑی کے حادثے کی خبر سن کر میری زندگی سے الگ ہوگئی تھیں..... مجھے معلوم ہوتا کہ یہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والی ہیں تو میں ان کو مضبوطی سے پکڑ کے رکھتی..... مگر بیٹا اس منجدھار میں جسے زندگی کہتے ہیں۔ مضبوط سے مضبوط کشتی لے ڈوبتی ہے اور ایک معمولی تنکا ہی کنارے لگا دیتا ہے..... (توقف کے بعد) سعیدہ بیٹا، امجد نے مجھ سے ایک اور بات تم سے پوچھنے کو کہا تھا؟

سعیدہ: کیا خالہ جان؟

بیگم صاحب: کیا تم اس سے محبت کرو گی؟

سعیدہ: (بوکھلا کر) محبت.....

بیگم صاحب: (سعیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) میں تمھیں زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی..... (چلی جاتی ہے)

سعیدہ: (دوپٹے سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) محبت ـــــ محبت؟ ـــــ دل دماغ (آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، آتشدان کے عین وسط میں ریشمی ڈوریوں

سے لٹکی ہوئی اپنی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے) تبا—— کیا تو اس سے محبت کرے گی؟

(ٹرے میں رکھی ہوئی پیالیوں کی آواز آتی ہے ——اصغری ناشتہ کے لئے اندر داخل ہوتی ہے اور پہیوں والی تپائی صوفے کے آگے لے جاتی ہے اور اس پر ناشتہ چن دیتی ہے)

اصغری: دولھن بیگم، امجد میاں سے محبت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی؟

سعیدہ: (ایک دم چونکتی ہے) کیا کہا؟

اصغری: جی کچھ نہیں...... ایسے ہی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی——ناشتہ کر لیجئے۔

سعیدہ: تم جاؤ۔

اصغری: جی اچھا۔

(اصغری ایک نظر سعیدہ کو اور ایک نظر اس کی تصویر کو دیکھتی باہر چلی جاتی ہے۔ سعیدہ ، آہستہ آہستہ سوچ میں مستغرق صوفے کی طرف بڑھتی ہے اور مسہری پر لیٹ جاتی ہے۔)

سعیدہ: (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) دولھن بیگم، امجد میاں سے محبت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی—— (اونچی آواز میں) اور کون کرے گی؟ اور کون کر سکتی ہے؟

(پردہ)

تیسرا منظر

(**نگارولا سے ملحقہ باغیچہ** ——— وسط میں پست قد ترشی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان فوارہ ہے جس میں سے پانی کی پھوار دھڑک دھڑک کر باہر نکل رہی ہے۔ دھوپ کھلی ہے۔ آسمان نکھرا ہوا ہے فضا میں عجیب سا کنوارا پن ہے ——— بے حجاب ہے۔ ہر ذرہ نظارے کی دعوت لئے گویا قبولیت کا منتظر ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ہوا چلتے چلتے ٹھہر سی گئی ہے کہ باغ کی بیلیں پھر سے اپنی زلفیں سنوار لیں، پھول اپنے گالوں کی سرخی درست کر لیں، اور بھونروں کو جن کلیوں کا منہ چومنا ہے بے خوف وخطر چوم لیں ——— اس فضا میں گھاس کے ہموار قالین پر کرسیاں بچھی ہیں۔ ایک میں سعیدہ گلابی لباس میں ملبوس خود اپنا ہی عکس بنی بیٹھی ہے۔ دھوپ کی حدت سے اس کے غازے کے ہلکے سے غبار سے اس کی اپنی گلابیاں، سرخیاں بن بن کر باہر نکل رہی ہیں۔ دوسری کرسی پر مجید بیٹھا ہے جو ہولے ہولے سگریٹ کے کش لگا کر دھوئیں کے نیلے نیلے چھلے منہ سے نکال رہا ہے۔ اس کا چہرہ مطمئن ہے۔ سامنے امجد ہے ——— اپاہجوں کی کرسی میں ——— اس کے چہرے پر اپاہجوں کی کرسی والی کیفیت ہے جو کسی اور کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی ——— اُسکا رنگ بہت زرد ہے مگر اس کی آنکھوں میں چمک ہے جو سعیدہ کے حسن و جمال کی بازگشت ہے)

امجد: (اپنے دائیں بائیں دیکھ کر) آج موسم کتنا دلفریب ہے۔

سعیدہ: (فوراً متوجہ ہو کر) جی ہاں

امجد: مجید، جاؤ، سعیدہ کو گھما لاؤ ـــــ ان پہاڑیوں کی سیر کرالاؤ ـــــ (پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا ہے) افسوس ہے، مجھ سے مڑا نہیں جاتا ـــــ مجید اٹھو ـــــ میری کرسی گھما کر ادھر کر دو ـــــ یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہونا چاہیے۔

(مجید اٹھتا ہے۔ لیکن سعیدہ اس سے پہلے اٹھ کر امجد کی کرسی کا رخ پھیر دیتی ہے۔ اب تینوں کا منہ پہاڑیوں کی طرف ہے جو دھوپ میں ـــــ حد نگاہ تک اپنا منہ دھو رہی ہیں)

امجد: (پہاڑیوں کے منظر کو اپنی نگاہوں سے پیتے ہوئے) سعیدہ، یہی ہیں وہ پہاڑیاں جن سے مجھے پیار ہے ـــــ اتنا پیار کہ میں بیان نہیں کر سکتا ـــــ (مجید سے) جاؤ، مجید، سعیدہ کو ساتھ لے جاؤ اور ان کی سیر کراؤ (سعیدہ سے) سعیدہ، جب تم ان پر چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگو گی اور تمھاری سانس رکنے لگے گی تو تمھیں ایسا محسوس ہوگا کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لذت نہیں ...... میں مجید کو زبردستی ساتھ لے جاتا تھا مگر یہ ایک چڑھائی کے بعد ہی ہمت ہار دیتا تھا ـــــ مجھ سے کہتا تھا، بھائی جان مجھے آپ کا یہ شغل پسند نہیں ـــــ یہ کیا کہ آدمی بیکار ہیں ہانپ ہانپ کر بیہوش ہو جائے (ہنستا ہے) پہاڑیوں اور ان کے سر کرنے کا حسن اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے گا۔ کیوں سعیدہ؟

سعیدہ: (مسکرا کر) جی ہاں۔

امجد: (مجید سے) جاؤ یار ـــــ سعیدہ کو لے جاؤ ـــــ کبھی کام بھی کیا کرو۔

مجید: (سعیدہ سے) چلیئے بھابی جان ـــــ مگر میں شرط لگاتا ہوں، آج تو یہ چلی جائیں گی۔ لیکن پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کریں گی۔

سعیدہ: نہیں نہیں ـــــ یہ آپ کیونکر کہتے ہیں؟

امجد: اس لئے کہ یہ اور دل دماغ کا آدمی ہے۔

سعیدہ: دل و دماغ؟ ـــــ یہ کیا بلا ہے دل و دماغ؟

مجید: آپ کو ایک ہی پہاڑی چڑھنے سے معلوم ہو جائے گا۔

امجد: (ہنستا ہے) تم بکتے ہو مجید —— سعیدہ کی زندگی کے سامنے تو ایک پہاڑ ہے —— اگر یہ معمولی سی پہاڑی کی چڑھائی سے اکتا گئی تو......

سعیدہ: چلئے مجید میاں

مجید: چلئے

(دونوں چلے جاتے ہیں —— امجد مسکراتا ہے۔ اصغری داخل ہوتی ہے —— اس کے ہاتھ میں پلیٹ ہے جس میں چھلے اور کٹے ہوئے سیب ہیں۔ وہ معنی خیز نظروں سے مجید اور سعیدہ کو دیکھتی امجد کی جانب آتی ہے اور اس سے مخاطب ہوتی ہے)

اصغری: تھوڑے سیب کھا لیجئے۔

امجد: (جو سعیدہ اور مجید کو ڈھلوانوں میں اترتے دیکھ رہا ہے) کھا لوں گا۔

اصغری: (انہی کی طرف دیکھ کر) آج دولھن بیگم کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں۔

امجد: (ایک دم پلٹ کر اصغری کو دیکھتے ہوئے) دکھائی دے رہی ہیں؟

اصغری: (خفیف سی بوکھلاہٹ کے ساتھ) جی —— جی ہاں!

امجد: (پھر سعیدہ اور مجید کو دیکھتے ہوئے) خوبصورت دکھائی نہیں دیتی —— ہونے اور دکھائی دینے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اصغری۔

اصغری: جی ہاں —— یہ تو ہے۔

امجد: لاؤ سیب

اصغری: (پلیٹ بڑھاتے ہوئے) حاضر ہیں —— پر چھلے ہوئے ہیں۔

امجد: تمھارا مطلب؟

اصغری: چھلی ہوئی چیز سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا ہے (ہنس کر)...... اس کے سرخ سرخ گال تو چھری سے اتر چکے ہیں۔

امجد: (ہنستا ہے) اصغری! —— تم اب بہت شیطان ہو گئی ہو۔

اصغری: (سنجیدگی سے) شیطان؟ —— امجد میاں —— آپ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ شیطان خدا کا سب سے بڑا فرشتہ تھا، جس نے آدم —— یعنی مٹی کے پتلے کے

سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

امجد: ہاں ہاں..........

اصغری: اور فرشتوں کے اس ہیڈ ماسٹر کو اس کی سزا دی گئی تھی......

امجد: درست ہے......

اصغری: تو یہ بھی درست ہے

امجد: کیا ہے؟

اصغری: کچھ بھی نہیں —— درست آخر ہوتا کیا ہے؟ —— وہی جسے آپ درست سمجھ لیں، یا درست سمجھنے کی کوشش کریں یا وہ غلطی جو آپ ایک دفعہ اس لئے کر لیں کہ آئندہ درست ہوتی رہے گی۔ یا وہ درستی جسے آپ غلطی میں تبدیل کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ آپ پھر درست کر سکتے ہیں —— لیکن یہ سب بکواس ہے —— میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں امجد میاں۔

امجد: تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟

اصغری: میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں —— لیکن ایک عورت ہوں امجد میاں۔

امجد: میں پھر نہیں سمجھا۔

اصغری: (سیب کی ایک قاش اٹھاتی ہے اور امجد کے منہ کے پاس لے جاتی ہے) آپ سیب کھائیے۔

امجد: (سیب کی قاش دانتوں میں لیتے ہوئے) تم پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کیا کرتی تھیں۔

اصغری: آج موسم ہی کچھ ایسا دلفریب ہے۔

امجد: کیا نہیں ہے؟

اصغری: (سیب کی دوسری قاش اٹھا کر) کیوں نہیں...... یہ لیجئے ایک اور قاش......
(دوسری قاش امجد کے کھلے ہوئے منہ میں ڈالتی ہے)

امجد: (سیب کھاتے ہوئے کچھ توقف کے بعد) اصغری!

اصغری: (جو پہاڑوں کا منظر دیکھنے میں محو تھی۔ چونک کر) جی؟

امجد: تمھاری شادی کر دیں؟

اصغری: شادی؟

امجد: ہاں —— اب تمھاری شادی ہو جانی چاہیے۔

اصغری: کیوں امجد میاں؟

امجد: شادی بڑی اچھی چیز ہے —— دنیا میں ہر شے کی شادی ہو جانی چاہیے —— زندگی میں شادی سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں —— میں امی جان سے کہوں گا کہ اصغری کی جلد شادی کر دیجئے۔

اصغری: نہ امجد میاں!

امجد: کیوں؟

اصغری: مجھے ڈر لگتا ہے۔

امجد: کس سے؟

اصغری: (سبزے پر بیٹھ جاتی ہے لہجہ فکر مند ہوتا ہے) شادی سے۔

امجد: (ہنستا ہے) پگلی!

اصغری: سچ کہتی ہوں امجد میاں —— مجھے واقعی ڈر لگتا ہے —— اول تو ایک نوکرانی کی شادی ہی کیا ہے۔ ہوئی ہوئی، نہ ہوئی نہ ہوئی —— کیا فرق پڑتا ہے...... لیکن ہوگئی تو کہیں ایسا نہ ہو گاڑی پٹری سے اتر جائے اور......

امجد: (دکھ کے ساتھ) اصغری!

اصغری: (کہے جاتی ہے) گاڑی پٹری سے اتر جائے اور اصغری قیمہ قیمہ ہونے سے بچ جائے —— ایک ٹانگ سے لنگڑی، ایک بازو سے لولی اور ایک آنکھ سے اندھی ہو جائے ——- آدھی اصغری غائب ہو جائے ——- آدھی بچ جائے ——- نا امجد میاں —— میری شادی کا نام نہ لیجئے —— شادی تو ایک سالم چیز ہے —— آدھی یا چوتھائی چیز کو شادی نہیں کہتے۔

امجد: (سوچتے ہوئے) اصغری!

اصغری: (گھٹی گھٹی آواز میں) جی!

امجد: تم ٹھیک کہتی ہو (آواز میں انتہا درجے کا درد پیدا ہو جاتا ہے) لیکن دیکھو مجھے رنجیدہ نہ کرو...... میں خوش رہنا چاہتا ہوں ـــــ میں ان دو شکستہ ٹانگوں پر بھی خوش رہنا چاہتا ہوں ـــــ مجھے نہ چھیڑو ـــــ میرے دل میں درد ہوتا ہے ـــــ

اصغری: (امجد کے پاؤں پکڑ لیتی ہے) مجھے معاف کر دیجئے! امجد میاں (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) جانے میں کیا بک گئی ـــــ آپ خوش رہیں ـــــ خدا آپ کو خوش رکھے۔

امجد: (بہادری کے ساتھ) خدا کا نام نہ لو ـــــ اگر اسکو مجھے خوش رکھنا ہوتا تو مجھے اس حادثے کا شکار ہی کیوں کرتا ـــــ کیا تھا تو مار کر اپنے شکاری تھیلے میں کیوں نہ ڈال لیا ـــــ اس کا نام نہ لو ـــــ میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے ـــــ مجھے اگر خوش رہنا ہے تو اپنے رہے سہے وجود ہی کے سہارے خوش رہنا ہے ـــــ انہی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں پر چند تنکے چن کر مجھے اپنی خوشی کا آشیانہ بنانا ہے۔

اصغری: صرف اپنی خوشی کے؟

امجد: (بہت زیادہ دکھ کے ساتھ) اصغری خدا کے لئے ـــــ تم اتنی کیوں ظالم ہوگئی ہو ـــــ تمھارے منہ میں اگر زبان پیدا ہوئی ہے تو کیا اسی لئے کہ تم میرے دکھ میں اضافہ کرو...... میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میری مدد کرو ـــــ ایک اپاہج کی مدد کرو کہ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی زندگی جوڑ جاڑ کے چند دن ـــــ صرف چند گزارے۔

اصغری: آپ درخواست نہ کیجئے امجد میاں ـــــ میرا کلیجہ پھٹتا ہے ـــــ آپ مالک ہیں، حکم دے سکتے ہیں ـــــ میری زندگی حاضر ہے۔ (اس کے موٹے موٹے آنسو امجد کے سلیپروں پر گرتے ہیں ـــــ اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ایک طرف چلی جاتی ہے)

امجد: (گردن جھکا کر سلیپروں کی طرف دیکھتا ہے جن پر سے اصغری کے آنسو لڑھک جاتے ہیں ـــــ گردن اٹھا کر اصغری کو دیکھتا ہے جو جا رہی ہے)

(کوٹھی کی جانب سے بیگم نمودار ہوتی ہے۔ شال اوڑھے ہاتھ میں زیورات کے ڈبے

لئے وہ امجد کے پاس آتی ہے)

بیگم صاحب: امجد بیٹا

امجد: (جلدی سے اپنے پاؤں کمبل میں چھپا کر) جی!

بیگم صاحب: سعیدہ کے لئے جو زیورات تم نے پسند کئے ہیں تیار ہو کر آ گئے ہیں۔لو.....

(ڈبے امجد کی گود میں رکھ دیتی ہے)

امجد: (بچوں کے سے اشتیاق سے ہر ڈبہ کھول کر سارے زیورات دیکھتا ہے اور ابلتی ہوئی خوشی کا اظہار کرتا ہے) بہت اچھے ہیں —— بہت عمدہ ہیں —— بہت حسین ہیں —— لیکن اتنے نہیں جتنی سعیدہ ہے.....اصغری.....اصغری! —— ادھر آؤ۔

(اصغری جو ایک سرو کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔امجد کے پاس آتی ہے۔امجد اسے تمام زیورات دکھاتا ہے)

امجد: کہو، کیسے ہیں؟

اصغری: آپ خود کہہ چکے ہیں —— حسین ہیں لیکن اتنے نہیں جتنے دولھن بیگم ہیں۔

امجد: (ماں سے) امی جان۔کپڑے کب آئیں گے۔

اصغری: کل تک آ جائیں گے۔

امجد: اور وہ بائیسکوپ مشین —— کیوں نہیں آئی ابھی تک۔

بیگم صاحب: بیٹا —— مجید آرڈر دے آیا تھا۔ایک دو روز میں آ جائے گی۔

امجد: اچھا (رک کر) امی جان!

بیگم صاحب: جی بیٹا

امجد: کچھ اور بھی منگوانا چاہئے سعیدہ کے لئے —— میں اسے ایک لحظے کے لئے بھی اداس نہیں دیکھنا چاہتا —— ہر روز اس کے لئے کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور ہونی چاہیے

بیگم صاحب: سب کچھ تمھارے اختیار میں ہے۔جو چاہو کرو۔

امجد: اختیار؟ (رک کر) ہاں.....تو.....امی جان۔

بیگم صاحب: جی!

امجد: کمال کو بھیجئے ـــــ اسپورٹس کی دکان میں جائے ـــــ جتنے کھیل اسے مل سکیں لے آئے ...... سعیدہ اور مجید کھیلا کریں گے اور میں دیکھا کروں گا ...... اور دیکھئے ...... اس سے کہیے کچھ ایسے کھیل بھی لے آئے ، جو میں ...... میں بھی سعیدہ کے ساتھ کھیل سکوں۔

بیگم صاحب: (بے حد متاثر ہو کر امجد کا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر) میرے بچے!

(امجد بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا ہے ـــــ اصغری ضبط نہیں کر سکتی اور چیختی ہوئی ایک طرف دوڑ جاتی۔ بیگم کی آنکھوں سے خاموش آنسو رواں ہیں)

(پردہ)

چوتھا منظر

(وہی کمرہ جو پہلے اور دوسرے منظر میں ہے —— رات کا وقت ۔فضا بالکل خاموش ہے۔ بڑے بے ڈھنگے طریق پر مسہری پر سعیدہ تین چار گدے تکیوں میں اپنا نیم سنہرے بالوں والا سر دبائے کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول ہے......نظریں کتاب کے حروف کے بجائے اس کے اپنے دل کی جانب معلوم ہوتی ہیں۔ سینے کے مقام پر کمبل کی سلوٹیں چغلیاں کھا رہی ہیں اور ننھے سے تالاب میں جزر کا نقشہ پیدا ہو رہا ہے —— بائیں طرف لوہے کی ہسپتالوں جیسی چارپائی بچھی ہے —— اس کے ساتھ اپاہجوں والی کرسی پر امجد بیٹھا ہے۔اس کے ہاتھ میں کتاب ہے۔وہ اسے یوں پکڑے ہے جیسے کوئی شیشے کی چیز ہے۔اس کی نظریں پریشان ہیں۔کتاب کے حروف سے اٹھ کر کبھی وہ سعیدہ کے ہاتھوں پر جا بیٹھتی ہیں۔کبھی اس کے سنہرے بالوں والے سر پر جو تکیوں میں دھنسا ہے —— آخر اس سے نہیں رہا جاتا —— کتاب بند کر کے اپنی گود میں رکھتا ہے اور بڑی آہستگی کے ساتھ سعیدہ سے مخاطب ہوتا ہے)

امجد: سعیدہ!

سعیدہ: (چونک کر) جی؟

امجد: میرا خیال ہے، اب سو جاؤ۔

سعیدہ: (کروٹ بدل کر امجد کو دیکھتے ہوئے) آپ سونا چاہتے ہیں تو میں غلام محمد اور کریم کو بلاؤں کہ وہ آپ کو لٹا دیں۔

امجد: (کھوکھلی آواز میں) لٹا دیں ...... نہیں سعیدہ —— میں لیٹ لیٹ کے تھک گیا ہوں —— آج یہیں کرسی پر سو جاؤں گا —— تمھیں تکلیف نہ ہو تو اٹھ کے یہ بتی بجھا دو اور سبز بتی روشن کر دو۔

سعیدہ: (اٹھتی ہے) آپ بار بار میری تکلیف کا ذکر کیوں کرتے ہیں۔

امجد: میں خود جو تکلیف میں ہوں۔

سعیدہ: (چڑ کر) مجھے اس کا احساس ہے امجد صاحب —— مگر بتایئے میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں ...... مجھ سے جو ہو سکتا ہے، میں کرنے کے لئے تیار ہوں —— مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ کو ہر وقت میری تکلیف کی پڑی رہتی ہے —— مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

امجد: سعیدہ، تم بہت اچھی ہو۔

(سعیدہ بتی اوف کرتی ہے —— چند لمحات کے لئے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ پھر کمرے کی ہر چیز ہلکی ہلکی سبز روشنی میں نہانا شروع کر دیتی ہے)

سعیدہ: کاش میں اچھی ہوتی —— اچھی ہو سکتی (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔ سینے سے اسکا اضطراب ظاہر ہے)

امجد: اس سے زیادہ تم اور کیا اچھی ہو سکتی ہو سعیدہ۔

سعیدہ: (تیزی سے) جی نہیں —— آپ نہیں جانتے۔

امجد: (بہت ہی ملائم آواز میں) اگر کسی وجہ سے میں نے تمھیں ناراض کر دیا ہے تو مجھے معاف کر دو

سعیدہ: (امجد کی طرف دیکھتی ہے —— اٹھتی ہے اور مسکراتی ہوئی اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے امجد کے بالوں میں کنگھی کرتی ہے) سچ تو یہ ہے امجد صاحب کہ میں آپ کے لائق نہیں

ہوں۔

امجد: (سعیدہ کا ہاتھ پکڑ کر) ...... یہ تمھارے دل کی اچھائی ہے اگر تم ایسا سمجھتی ہو، ورنہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

سعیدہ: (بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے) سو جایئے — کئی راتوں سے آپ جاگ رہے ہیں — بلکہ جب سے یہاں آئے ہیں۔ ایک لحظے کے لئے بھی آپ کی آنکھ نہیں لگی۔

امجد: مجھے نیند نہیں آتی سعیدہ۔

سعیدہ: کیوں؟

امجد: معلوم نہیں کیوں — بس ایسا لگتا ہے کہ نیند کبھی آئی تھی نہ آئے گی ...... میں تو وہ راتیں بھی یاد کرنا بھول گیا ہوں جب سویا کرتا تھا۔

سعیدہ: کاش، میں آپ کو اپنی نیند دے سکتی۔

امجد: نہیں سعیدہ — میں اتنی عزیز چیز تم سے نہیں چھیننا چاہتا — یہ تمھاری آنکھوں ہی کے لئے سلامت رہے جو نیند میں اور بھی زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہیں — جاؤ اب سو جاؤ۔

سعیدہ: میں کم بخت تو سو ہی جاؤں گی۔

امجد: ایسا نہ کہو — خدا تمھارے بخت کو بلند کرے...... جاؤ سو جاؤ۔

سعیدہ: (چڑ کر) آپ کیوں میرے ساتھ اتنی نرمی سے پیش آتے ہیں ...... امجد صاحب، مجھے اس سے بڑی وحشت ہوتی ہے — خدا کی قسم آپ کی یہ نرمی، یہ حلیمی، یہ انکسار، ایک دن مجھے پاگل بنا دے گا۔

(جھنجھلا کر تیزی سے مسہری کی طرف بڑھتی ہے اور خود کو بستر میں گرا دیتی ہے)

امجد: مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے منہ سے جو باتیں نکلتی ہیں، وہ بھی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے۔ کروٹ بدل کر وہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیتی ہے — امجد اپنی گود میں سے کتاب اٹھاتا ہے اور اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے — سکوت کا عالم ہے۔ ہلکی ہلکی سبز روشنی میں یہ سکوت اور بھی زیادہ نحیف ہو گیا ہے — کافی لمبا

عرصہ خاموشی میں گذرتا ہے، بڑی بیزاری سے خاموشی میں ——امجد کے چہرے پر روشنی قبروں کے سبز غلاف کی طرح چڑھی ہے——اس کی نگاہیں کتاب سے ہٹ کر بار بار سعیدہ کی جانب اٹھتی ہیں ،اور شرمسار ہوکر دبے پاؤں لوٹ آتی ہیں ——تھوڑی دیر کے بعد امجد بہت زیادہ مضطرب ہو جاتا ہے)

امجد: سعیدہ!

سعیدہ: جی!

امجد: میں——میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔

سعیدہ: کروٹ نہ بدلتے ہوئے کیا؟

امجد: کیا......کیا آج ہماری پہلی رات ہو سکتی ہے......

سعیدہ: (بستر میں لرزسی جاتی ہے)

امجد: وہ رات——جو ابھی تک نہیں آئی

(سعیدہ خاموش رہتی ہے)

وقفہ

امجد: سعیدہ

سعیدہ: جی!

امجد: کیا تم میری یہ درخواست قبول کر سکتی ہو؟

سعیدہ: (کروٹ بدل کر) امجد کو دیکھتی ہے——اس کی آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش تیر رہی ہے) کہیے امجد صاحب۔

امجد: جھوٹ موٹ......محض میرے بہلاوے کے لئے......تم یہ فرض کرلو کہ میں تمھارے پہلو میں لیٹا ہوں......میں یہاں فرض کرلوں گا کہ تم میرے پہلو میں لیٹی ہو......میں تم سے وہی باتیں شروع کروں گا جو پہلی رات کو مجھے تم سے کرنی تھیں......تم اسی طرح جواب دینا، جس طرح کہ تمھیں دینا تھا......میرے لئے......کیا میرے لئے تم یہ جھوٹ موٹ کا کھیل کھیل سکتی ہو سعیدہ

سعیدہ: (آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش کے بجائے رحم کے آنسو تیر رہے ہیں) میں حاضر ہوں امجد صاحب۔

امجد: شکریہ۔

(طویل وقفہ)

امجد: آج ہماری پہلی رات ہے سعیدہ——وہ رات جس میں جوانیاں ارضی جنت کی طرف پہلا قدم اٹھاتی ہیں——وہ رات جس کی تمام پہنائیوں میں دو جی غوطہ لگاتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں......شرماؤ نہیں......یہ رات تو وہ ہے جب تمام پوشیدہ حقیقتوں کے گھونگھٹ اٹھنے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں۔ہلکی سی سرگوشی، نرم سی آہ، ایک چھوٹا سانس، پریدہ سانس کا ننھا سا ہلکورا بھی ان گھونگھٹوں کے پٹ کھول دیتا ہے——اس قدر آہستہ کہ سرسراہٹ تک بھی نہیں ہوتی اور آدمی، دیدار——پورے دیدار کے تمام مراحل طے کر جاتا ہے——یہ وہ رات ہے جب نگاہیں ٹکراتی ہیں تو تارے جھڑتے ہیں اور یہ افشاں دونوں زندگیوں کے ایک ماتھے پر چنی جاتی ہے......یہ وہ رات ہے——پہلی رات، سب سے پہلی، جب آدم کی پسلیاں چیر کر حوا نکالی گئی تھی——یہ وہ رات ہے جس کی درازیٔ عمر کے لئے، شاعر دعائیں مانگ مانگ کر ابھی تک نہیں تھکا——یہ وہ رات ہے جس کے حصول کے لئے جوانی کی جائے نماز بچھا کر زندگی اکثر سجدہ ریز رہی ہے......یہ وہ رات ہے جس میں حجاب کی تمام گرہیں فطرت کے ناخن خود کھولتے ہیں——یہ وہ رات ہے جب قدرت کے تمام کارخانے صرف ایک پرزہ ڈھال رہے ہوتے ہیں——وہ پرزہ جس نے کائنات کے ان تمام کارخانوں کو حرکت بخشی تھی——یہ وہ رات ہے جب تمام آوازیں واپس اپنے مخرجوں میں چلی جاتی ہیں کہ اس آواز کا جلوس انتہائی آرام وسکون سے گذر جائے۔جس میں رکن کی گونج ہے..یہ وہ رات ہے جس کا ہر پردہ اجالے سے بنا ہے——یہ وہ رات ہے، ہر آنے والی رات جس کے حضور جھولی پھیلائے بھیک کی منتظر کھڑی ہے——یہ وہ رات ہے جب بدن کا رواں رواں منہ کھول کے بولتا ہے اور کان کھول کے سنتا ہے

...... بڑے بڑے ان کہے راز — بڑے بڑے ان گائے راگ ...... (ایک دم چیخ کر) ڈھانپ لو — ڈھانپ لو ...... سعیدہ اپنا بدن ڈھانپ لو — خدا کے لئے اپنا جسم ڈھانپ لو۔

سعیدہ: (ہلکی ہلکی سبز روشنی میں گھاس کی نرم نرم پتیوں سے بنی ہوئی لاش کے مانند لیٹی ہے ۔اسکا بدن لرز رہا ہے — ایک ایک انگ کانپ رہا ہے) جی؟

امجد: (بلک بلک کر رونے لگتا ہے) اپنا بدن ڈھانپ لو (سعیدہ اپنا لرزتا ہوا بدن کمبل سے ڈھانپ لیتی ہے۔ امجد آنکھوں کے سامنے ہاتھ رکھے روتا رہتا ہے)

اندھیر

پانچواں منظر

نگار ولا سے ملحقہ باغیچہ —— شام کا وقت ۔فوارے کا پانی کھل کھیل رہا ہے ۔سائے گہرے ہو چکے ہیں۔پس منظر میں خاکستری پہاڑیاں شام کے دھندلکوں میں سنگینی اختیار کر گئی ہیں ۔آسمان نے ایسا لگتا ہے ۔اپنے بدن پر بھبھوت مل لی ہے ۔تختوں کے سینے پر سبزہ خاموش لیٹا ہے۔کرسیاں خالی ہیں —— ساری فضا خالی ہے ۔اس فریم کی طرح جس میں تصویر جڑی جانی والی ہے —— مجید اور سعیدہ کی ہنسی کی آواز آتی ہے —— چند لمحات کے بعد دونوں ہنستے ، بڑی مشکل سے اپنی تھکاوٹ کا بوجھ اٹھاتے داخل ہوتے ہیں —— سعیدہ نڈھال ہو کر خود کو کرسی میں گرا دیتی ہے مجید اس کے پاس کھڑا رہتا ہے۔

سعیدہ: (رانوں پر مکیاں مارتے ہوئے) اف —— ف!

مجید: (ہنستا ہے) آپ تھک گئیں —— دبادوں آپ کو؟

سعیدہ: (گھبرا کر) نہیں نہیں ۔اصغری کو بھیج دیجئے —— مجھ سے تو اب دو قدم بھی چلنا دشوار ہے۔

مجید: (مسکراتا ہے) بہتر...... (آگے بڑھ کر سعیدہ کے چہرے پر نیم سنہرے بالوں کی

آوارہ لٹ انگلیوں سے اٹھا کر ایک طرف کر دیتا ہے)

سعیدہ: (بہت زیادہ گھبراہٹ سے) میں جاتی ہوں اندر۔ (اٹھنے لگتی ہے)

مجید: (ایک طرف دیکھ کر) لو، وہ اصغری خود ہی آ گئی —— آؤ اصغری —— بھابھی جان کے پاؤں دبا دو۔

(اصغری داخل ہوتی ہے —— اس کے ہونٹوں کے اختتامی کونے کپکپا رہے ہیں جیسے کچھ کہنے کے لئے تڑپ رہے ہیں —— پاس آ جاتی ہے۔

اصغری: (سعیدہ سے) دولھن بیگم تھک گئیں آج؟

سعیدہ: (رانوں پر مکیاں مارتے ہوئے) ہاں!

اصغری: (گھاس پر بیٹھ کر، سعیدہ کی ایک پنڈلی دبانا شروع کرتی ہے۔ خطاب مجید سے ہے) یہ سب مجید کا قصور ہے...... اتنی بڑی سیر اور اتنی جلدی...... (لہجے میں تیکھا پن ہے) ہر چیز دھیرے دھیرے ہونی چاہیے (ہولے ہولے دباتی ہے) اس طرح —— ہولے ہولے (سعیدہ سے) کیوں دولھن بیگم —— کچھ آرام محسوس ہوا آپ کو؟

سعیدہ: (دوسری ٹانگ جو اصغری کی گرفت سے آزاد ہے، اضطراب کا شدید مظاہرہ کرتی ہے) ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!

اصغری: (مجید سے) مجید میاں، آپ جائیں —— منہ ہاتھ دھوآئیں —— گرد و غبار سے آپ کا چہرہ بالکل اَن دھویا آلو بنا ہوا ہے۔

مجید: (تیزی سے) تم بہت گستاخ ہو گئی ہو —— یہ سب......

اصغری: (مجید کی بات کاٹ کر) دولھن بیگم کا قصور جنھوں نے مجھے منہ لگا لیا ہے (سعیدہ کے چہرے کیطرف دیکھ کر) ایسا خوبصورت منہ!

(مجید نگاہوں ہی نگاہوں میں غصہ برساتا چلا جاتا ہے)

اصغری: (ہنستی ہے) مجید میاں کی شکل و صورت یوں تو ماشاء اللہ بڑی اچھی ہے —— مگر غصے میں ہمیشہ بگڑ جاتی ہے —— آپ کا کیا خیال ہے۔

سعیدہ: تم مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو (اٹھنا چاہتی ہے مگر اصغری کی مضبوط گرفت کے باعث

نہیں اٹھ سکتی) چھوڑ دو مجھے۔

اصغری: (دباتے ہوئے) میں اس خدمت سے خود کو چھڑانا نہیں چاہتی (سعیدہ کے پاؤں سے سینڈل اتارتی ہے) مجید میاں کہہ رہے تھے، میں گستاخ ہوگئی ہوں — کیا یہ درست ہے دولھن بیگم۔

سعیدہ: بالکل درست ہے۔

اصغری: (بڑے اطمینان سے سعیدہ کے پاؤں کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے) تو یہ بہت بری بات ہے — نوکرانی کو گستاخ کبھی نہیں ہونا چاہیے — آپ میرے کان کھینچئے۔

سعیدہ: خاموش رہو!

اصغری: یہ ظلم ہے — زبان بندی بہت بڑا ظلم ہے دولھن بیگم — میں نے ایسی کون سی بات کی جو آپ کو ناگوار گذری۔

سعیدہ: (اضطراب کے ساتھ) تمھاری سب باتیں مجھے ناگوار گذرتی ہیں۔

اصغری: اصغری بے چاری اب کیا کرے ..... (توقف کے بعد) میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ جیسی لکھی پڑھی بیگم کی نوکری میں اس ایک برس کے اندر اندر ہی مجھے سب کچھ آ گیا ہے ...... پر اب ایسا معلوم ہوتا ہے میں غلط سمجھتی تھی — میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں سیکھا؟ — لیکن یہ کس کا قصور ہے؟ سیکھنے والے کا یا سکھانے والے کا؟

سعیدہ: (اپنی دونوں ٹانگیں ایک طرف سمیٹتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں) تم کیا کہنا چاہتی ہو؟

اصغری: (مصنوعی حیرت سے) میں؟

سعیدہ: ہاں تم — کیا کہنا چاہتی ہو تم؟

اصغری: (سوچتے ہوئے) کہنے کو تو میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں —

سعیدہ: (اٹھ کر ننگے پاؤں گھاس پر چلتے ہوئے) تو کہہ ڈالو آج — مجھے تمھاری ہر روز کی مہین مہین چٹکیاں پسند نہیں — جو تم کہنا چاہتی ہو، میں سننے کے لئے تیار ہوں۔

اصغری: آپ بڑی ہمت والی ہیں دولھن بیگم۔

سعیدہ: میں ہمت والی ہوں، یا بزدل ہوں، تم اسے چھوڑو — جو کہنا چاہتی ہو آج اگل ڈالو۔

اصغری: یہ تے آپ کو اور مجھے دونوں کو تکلیف دے گی۔

سعیدہ: میری تکلیف کا تم کچھ خیال نہ کرو ــــ میں برداشت کرلوں گی۔

اصغری: (سوچتے ہوئے) میں سمجھی تھی میرے دانتوں تلے دبی ہوئی کٹاری دیکھ کر آپ ڈر جائیں گی۔ پر اب ایسا لگتا ہے کہ آپ چلتی چلتی ایسی جگہ پہنچ گئی ہیں جہاں زخموں کی کوئی پروا نہیں رہتی ــــ اب تو مجھے خوف آنے لگا ہے آپ سے۔

سعیدہ: (اضطراب میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے) اصغری!

اصغری: (چونک کر) جی؟

سعیدہ: تم مجھے یہ بتاؤ ــــ اگر امجد میاں گاڑی کے حادثے میں مر جاتے تو میں کیا کرتی؟

اصغری: آپ؟ ــــ مجھے معلوم نہیں آپ کیا کرتیں۔

سعیدہ: میں جوان ہوں، خوبصورت ہوں ــــ میرے سینے میں ایسے ہزاروں ارمان ہیں جو میں سترہ برس تک اپنے خیالوں کا شہد پلا پلا کر پالتی پوستی رہی ہوں ...... میں انکا گلا گھونٹ سکتی ــــ تم مجھے کمزور کہہ لو ــــ بزدل کہہ لو ــــ اخلاق باختہ کہہ لو ...... تم ایک نوکرانی ہو ــــ میں تمھارے سامنے اعتراف کرتی ہوں کہ میں اپنی جوانی کا باغ، جس کے پتے پتے، بوٹے بوٹے میں میرے کنوارے ارمانوں کا گرم گرم خون دوڑ رہا ہے، اپنے ہاتھوں سے نہیں اجاڑ سکتی ...... ویسے میں کسی کو بھی اجازت دے سکتی ہوں کہ وہ میری آنکھیں بند کر کے ــــ نہیں ــــ میرے تمام حواس میں تالے لگا کر بڑھاپے اور رنڈاپے کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتار دے ـ ـ ـ یا ایک ہی بار دھکا دے کر مجھے اپنے ارمانوں کی لرزتی ہوئی چٹانوں کی چوٹیوں پر سے نیچے گرادے جن پر میں اس وقت تک دامن سمیٹتے تند ہواؤں کا مقابلہ کرتی آرہی ہوں ــــ میں تم کو بھی اس کی اجازت دیتی ہوں۔

اصغری: (شکست خوردہ اٹھتی ہے) بس دولھن بیگم۔

سعیدہ: میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہوں اصغری جہاں زمین میرے قدموں کے نیچے گھوم رہی ہے۔ میں جس راستے کی طرف منہ کرتی ہوں وہی مجھ سے منہ موڑ لیتا ہے

——میں جو ارادہ کرتی ہوں، مجھ سے اپنا دامن چھڑا کے بھاگ جاتا ہے۔ میں اس کے پیچھے بھاگتی ہوں ——اندھادھند دوڑتی ہوں اور جب اسے پکڑ لیتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریت کا بنا تھا۔ میرے پکڑتے پکڑتے ہی ڈھیر ہو جاتا ہے ——اصغری تم نہیں جانتی ہو، میں کتنی دیر سے انگاروں کے بستر پر لوٹ رہی ہوں ۔بجھانے کے لئے میں ان پر پانی ڈالتی ہوں تو بھاپ کے ایسے بگولے اٹھتے ہیں جو مجھے اپنے ساتھ اونچائیوں میں لے جاتے ہیں اور جھنجھوڑ کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ایک دم نیچے دے ٹپکتے ہیں ——میری ہڈی ہڈی، پسلی پسلی چور ہو چکی ہے اصغری...... کیا ہی اچھا ہوا اگر امجد صاحب کے بدلے میں اپاہج ہوئی ہوتی۔

(طویل وقفہ ——اصغری خاموش کھڑی رہتی ہے ——سعیدہ اضطراب میں ادھر ادھر ٹہلتی رہتی ہے)

سعیدہ: بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اصغری: (محویت کے عالم سے بیدار ہوتی ہے) کیا کرنا چاہیے؟— آپ کو— آپ کو امجد میاں کی موت کا انتظار کرنا چاہیے۔

سعیدہ: (کچھ دیر سوچ کر) تم مجھے انتہا درجے کی سنگدل کہوگی۔لیکن میں پوچھتی ہوں۔انھیں کب موت آئے گی؟

اصغری: جب اللہ میاں کو منظور ہوگا (بڑبڑاتی ہے) لیکن امجد میاں کی دوستی تو ان سے ختم ہو چکی ہے۔

سعیدہ: کیا کہا؟

اصغری: جی، کچھ نہیں۔

(اکھڑے اکھڑے قدم اٹھاتی اصغری چلی جاتی ہے ——سعیدہ ننگے پاؤں گھاس کے ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر اضطراب کی حالت میں ٹہلتی رہتی ہے۔)

پردہ

چھٹا منظر

(**نگار والا** ـــــ ڈرائنگ روم ـــــ وسیع و عریض کمرہ جو پرانی وضع کے ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ ہر چیز وزنی اور پائدار ہے ـــــ دیواروں پر آئل پینٹنگز آویزاں ہیں ۔جو خاندان کے مختلف افراد کی ہیں ۔ایک پینٹنگ بیگم کی ہے ۔ جب کہ وہ جوان تھی ۔ اس پینٹنگ کے نیچے بیگم ایک صوفے پر بیٹھی تقابل پیش کررہی ہے ۔تصویر میں وہ بے فکر ہے مگر صوفے میں سخت فکرمند ہے۔اس کا چہرہ غم واندوہ کا مجموعہ ہے کوئی ہونی چیز بن رہی ہے ،مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خیالات وافکار کے الجھے ہوئے دھاگے کبھی لپیٹتی ہے کبھی کھولتی ہے ـــــ اصغری داخل ہوتی ہے)

بیگم صاحب: مجید میاں ملے؟

اصغری: جی ہاں......

بیگم صاحب: کہاں تھے؟

اصغری: باغیچے ہیں۔

بیگم صاحب: کیا کر رہے تھے؟

اصغری: جی؟ــــ (رک کر) جی اکیلے بیٹھے تھے۔

بیگم صاحب: (اصغری کی طرف دیکھ کر نگاہیں نیچے کر کے) آ رہے ہیں۔

اصغری: جی ہاں!

بیگم صاحب: تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے — مجید اس کی طرف دیکھتا ہے اندر داخل ہوتا ہے)

مجید: کیا بات ہے امی جان؟

بیگم صاحب: کچھ نہیں — بیٹھ جاؤ۔

مجید: (پاس ہی صوفے کی دوسری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) یہاں سردی ہے۔

بیگم صاحب: ہاں — یہاں سردی ہے۔

(وقفہ)

مجید: (بے چینی محسوس کرتے ہوئے) میرا خیال ہے — آپ نے مجھے یہاں کچھ کہنے کے لئے بلایا ہے۔

بیگم صاحب: ہاں!

مجید: فرمایئے؟

بیگم صاحب: میں تمہیں یہاں سے بھیجنا چاہتی ہوں

مجید: مجھے؟ (اٹھ کر) کہاں؟

بیگم صاحب: بیٹھ جاؤ۔

مجید: (بیٹھ جاتا ہے) یہ لیجئے۔

بیگم صاحب: میں نے ابھی امجد سے بات نہیں کی۔

مجید: (پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) کون سی۔

بیگم صاحب: یہی تمہیں یہاں سے بھیجنے کی۔

مجید: لیکن آپ مجھے یہاں سے کیوں بھیج رہی ہیں ...... میرا مطلب ہے کوئی خاص کام ہے

بیگم صاحب: بیٹھ جاؤ۔

مجید: (بیٹھ جاتا ہے) کوئی خاص کام ہے؟

بیگم صاحب: نہیں۔

مجید: تو پھر مجھے یہاں سے کہیں باہر بھیجنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے۔

بیگم صاحب: کہ میں اسی میں بہتری سمجھتی ہوں۔

مجید: بہتری؟ —— کس کی بہتری؟

بیگم صاحب: ہم سب کی —— اس گھر کی۔

مجید: (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) آپ پہلیوں میں بات کر رہی ہیں امی جان۔

بیگم صاحب: مجید تم میرے لڑکے ہو، میں تمھاری ماں ہوں —— میرے تمھارے درمیان کوئی ایسی گفتگو نہیں ہونی چاہیے جو اس مقدس رشتے پر ذراسی بھی کالک لگائے —— میں چاہتی ہوں کہ تم آج ہی کراچی چلے جاؤ اور جب تک میں کہوں وہیں رہو۔

مجید: لیکن امی جان ——

بیگم صاحب: (بات کاٹ کر) تمھارے وہاں بے شمار دوست موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے، تم ان کی مدد سے، یا خود اپنی ہمت سے اس منجدھار میں سے جسے زندگی کہتے ہیں اپنی کشتی صحیح وسلامت کنارے لے جاؤ گے۔

مجید: (کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا اور بیٹھ جاتا ہے) بہت بہتر —— میں چلا جاؤں گا۔

بیگم صاحب: تمھارا فیصلہ..... (ایک دم خاموش ہو جاتی ہے)

(کمرے میں امجد اپاہجوں والی کرسی میں داخل ہوتا ہے جسے کریم چلا رہا ہے)

امجد: (مجید سے) یار مجید، تم بھی عجیب آدمی ہو —— میں وہاں کمرے میں بیٹھا تمھارا انتظار کر رہا تھا کہ تم آؤ گے تو ہم دونوں سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں گے —— لیکن تم یہاں بیٹھے ہو (بیگم صاحب سے) امی جان —— آپ نے کیا سوچا ہے —— کیسا تحفہ ہونا چاہیے —— میں تو سوچ سوچ کر بالکل پاگل ہو گیا ہوں۔

بیگم صاحب: تم سعیدہ سے کیوں نہیں پوچھتے۔

امجد: لو اور سنو (ہنستا ہے) حد کر دی آپ نے امی جان —— اس سے مشورہ لیا تو تحفے کا مزا کیا خاک آئے گا (مجید سے) کیوں مجید؟

(مجید خاموش رہتا ہے)

امجد: بولو یار۔

مجید: (اٹھ کر) آپ امی جان سے پوچھئے — میں تو جا رہا ہوں۔

امجد: (حیرت سے) جا رہے ہو؟ — کہاں جا رہے ہو؟

مجید: کراچی!

امجد: یقیناً تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے — کیا کرنے جا رہے ہو کراچی؟

مجید: کیا کرنے جا رہا ہوں (پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ) منجدھار میں سے اپنی کشتی نکالنے

امجد: (بیگم سے) کیا ہو گیا ہے اسے (مجید سے) بیٹھو یار — پرسوں اس کی سالگرہ ہے — ابھی ابھی فیصلہ ہو جانا چاہیے۔

مجید: فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

امجد: کیا؟

مجید: کہ میں کراچی جا رہا ہوں اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔

امجد: کیا بکتے ہو (بیگم سے) امی جان، یہ قصہ کیا ہے؟

بیگم صاحب: کچھ نہیں — ماں بیٹے میں لڑائی ہو گئی کسی بات پر

امجد: کس بات پر؟

بیگم صاحب: تم نہیں پوچھ سکتے۔

امجد: عدول حکمی تو ہوتی ہے — لیکن مجید میرا بھائی ہے — آپ کے اور اس کے درمیان اگر کوئی رنجش یا غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے تو اسے دور کرنا میرا فرض ہے — مجید کو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں — اس سے ایسی کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی جو آزار کا موجب ہو — (مجید سے) ادھر آؤ مجید۔

مجید: بھائی جان، مجھے اپنا اسباب بندھوانا ہے۔

امجد: لاحول ولا — یہ سب کیا ہے — (بیگم سے) امی جان — خدا کے لئے اسے روکئے — میرے لئے نہیں تو سعیدہ کے لئے روکئے — اس گھر میں ایک صرف یہی

ہے کہ جس نے ابھی تک اسے اداس نہیں ہونے دیا— میری خاطر اتنی زحمت برداشت کرتا ہے—— اگر آپ نے اسے جانے دیا تو امی جان میں نہیں جانتا، میرا کیا حال ہوگا— سعیدہ کو سیر کے لئے لے جاتا ہے تو میں تصور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے بدلے میں اس کے ہمراہ ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتا ہے تو وہ خلا بہت حد تک پورا ہو جاتا ہے جو قدرت کے بے رحم ہاتھوں نے میری زندگی میں پیدا کر رکھا ہے— میں تو کئی بار سوچتا ہوں امجد اگر تیرا بھائی مجید نہ ہوتا تو کیا تیری شکستہ زندگی کا ملبہ تو اس قابل نہیں تھا کہ گھورے پر پڑا ہوتا— امی جان اسے روکئے—— یہ تو میرا بازو ہے...... کیوں آپ اس کو مجھ سے جدا کر رہی ہیں— اللہ میاں کی جگہ نہ لیجئے امی جان (رونے لگتا ہے)

مجید: میں جا رہا ہوں امی جان

بیگم صاحب: ٹھہرو!

مجید: رک جاتا ہے)

بیگم صاحب: (اٹھتی ہے اور امجد کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) امجد بیٹا—— روؤ نہیں جانِ مادر— جو چیز جہاں ہے وہیں رہے گی...... اس لئے کہ اسے یہی منظور ہے...... (مجید سے) مجید— بھائی کے پاس بیٹھو اور سعیدہ کی سالگرہ کے متعلق سوچو (چلی جاتی ہے)

(مجید کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر امجد کی کرسی کی طرف بڑھتا ہے)

مجید: (آہستہ) بھائیجان، آپ مجھے جانے دیں۔

امجد: (جھکا ہوا سر اٹھا کر) جانے دوں؟— کہاں جانے دوں؟— پاگل مت بنو۔

مجید: آپ نہیں سمجھتے بھائی جان۔

امجد: میں سب سمجھتا ہوں—— اپنا رومال نکالو اور ذرا میرے یہ آنسو پونچھ دو۔

مجید: (تھوڑے توقف کے بعد اپنا رومال نکالتا ہے اور امجد کے آنسو پونچھتا ہے— جلدی جلدی

امجد: کیا کرتے ہو یار— تمھیں تو آنسو پونچھنا بھی نہیں آتا— (مسکراتا ہے) اتنا معمولی سا کام ہے۔

مجید: یہ معمولی کام نہیں بھائی جان۔

امجد: (مسکرا کر) اچھا بھائی بڑا جان جوکھوں کا کام ہے ——— آ ؤ ادھر بیٹھو ——— سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں۔ بیٹھو

مجید: (امجد کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) سوچئے۔

امجد: (آہ بھر کر) سوچتے ہیں بھائی سوچتے ہیں ——— سوچنے کے علاوہ اب اور کام ہی کیا ہے ۔لیکن ذرا تم بھی سوچو۔

(مجید اور امجد دونوں سوچ میں مستغرق ہو جاتے ہیں)

پردہ

ساتواں منظر

(**نگارولا سے ملحقہ بغیچہ** —— شام کا وقت ۔فوارے کا پانی بند ہے جیسے وہ ابل کر عاجز آچکا ہے ۔پس منظر میں خاکستری پہاڑیاں دھندلکوں میں اپنی سنگینیاں جیسے چھپارہی ہیں ۔فرش پر سبزہ روندا ہوا سا معلوم ہوتا ہے ۔دائیں طرف ،فوارے سے ہٹ کر گھنی جھاڑیاں جنکے عقب میں امجد ،اپاہجوں والی کرسی میں بیٹھا ہے ۔پشت پر اصغری کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہے ۔وہ اسے چلانے لگتی ہے)

امجد: نہیں اصغری —— کچھ دیر ٹھہرو۔

اصغری: (ٹھہر جاتی ہے لیکن امجد میاں......

امجد: میں آج اپنی زندگی کا آخری زخم کھانا چاہتا ہوں۔

اصغری: یہ زخم کھانا اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنے تصور ہی میں کھا سکتے ہیں —— لیکن...... یہ زخم تو آپ کے لگ چکا ہے...... اسے دوبارہ کیوں کھلوانا چاہتے ہیں آپ؟

امجد: (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میری حالت میں جو آدمی ہو اس کے بدھوپنے کی کوئی حد نہیں رہتی —— اپنے زخموں کے ٹانکے کھول کھول کر دیکھتا ہے ۔انگوروں کی زبانی ٹیسوں کی داستانیں سنتا ہے اور خود کو بہت بڑا شہید سمجھتا ہے......(ہنستا ہے)

اصغری تمھاری کبھی کوئی چیز ٹوٹی نہیں، اس لئے تم لوگوں کا دردناک حال نہیں جانتی ہو جو عجز کی انتہا کو پہنچ کر شکست وریخت میں بلند بام عمارتیں بناتے ہیں۔

اصغری: (مسکراتی ہے) میں تو ان حدوں سے بھی آگے نکل گئی ہوں امجد میاں ـــــ بڑی اونچی عمارتیں بنا کر خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا چکی ہوں ـــــ ایسا کرتے کرتے تو میرے دل میں بھی گڈے پڑ چکے ہیں۔

امجد: (کانپ جاتا ہے) اصغری ـــــ تم بڑی خوفناک ہو۔

اصغری: (ہنستی ہے) ہر اُجاڑ خوفناک ہوتی ہے حالانکہ بے چاری کیا خوفناک ہو سکتی ہے اسے اپنے ماتم سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے جو دوسروں کو ڈرائے۔ وہ تو خود دبکی ہوئی سہمی ہوئی ہوتی ہے۔

امجد: تمھاری زندگی بھی کسی حادثے سے دوچار ہوئی؟

اصغری: جی نہیں ـــــ اس جی کی زندگی کسی حادثے سے کیا دوچار ہوگی جو کہ خود ایک حادثہ ہے۔

امجد: تمھاری باتوں سے جلے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔

اصغری: اس لیے کہ اب آپ کی سونگھنے کی حس جاگی ہے۔

امجد: پہلے سو رہی تھی؟

اصغری: جی ہاں ـــــ بہت گہری نیند

امجد: اسے جگایا کس نے ہے؟

اصغری: اس گاڑی نے جو پٹری سے اتر گئی۔

امجد: (بڑبڑاتا ہے) اس گاڑی نے ـــــ جو پٹری سے اتر گئی..... (ذرا بلند آواز میں) کیا یہ پھر پٹری سے اترے گی؟

اصغری: جو اللہ میاں کو منظور ہے وہی ہوگا۔

امجد: اللہ میاں کا نام مت لو ـــــ میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے۔

اصغری: نہیں امجد میاں، اس سے ہم ایسوں کی دوستی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ٹوٹ ٹوٹ کے آپ جڑتی رہتی ہے۔

امجد: یہ سب بکواس ہے۔

(دونوں، ایک دم چونکتے ہیں ۔قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے — مجید اور سعیدہ ہانپتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں — سعیدہ جو بہت تھکی ہوئی ہے، فوارے کی منڈیر بیٹھ جاتی ہے۔ مجید کھڑا رہتا ہے۔)

سعیدہ: آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔

مجید: حالانکہ ہم زیادہ دور نہیں گئے۔

سعیدہ: ہاں!

وقفہ

مجید: کیا ہی اچھا ہوتا، اگر میں کراچی چلا گیا ہوتا۔

سعیدہ: اچھا ہی ہوتا۔

مجید: میری جان عجب مشکل میں پھنس گئی ہے — میں کراچی چلا جاتا...... لیکن سوال ہے کہ کیا میں اس منجدھار میں سے اپنی کشتی کھے کر کنارے لے جاتا؟ — نہیں — میں ضرور ناکام رہتا۔

سعیدہ: مجھے معلوم ہے۔

مجید: تمھیں معلوم ہے — مجھے معلوم ہے — سوائے بھائی جان کے اور سب کو معلوم ہے اور یہی اس کہانی کا سب سے المناک حصہ ہے۔

سعیدہ: میں نے کئی بار سوچا ہے کہ ان سے کہہ دوں، لیکن (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) مجھے ڈر ہے، وہ اس صدمے کی تاب نہ لاسکیں گے۔

مجید: مجھے خود اسی بات کا ڈر ہے — ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک برس اور زندہ رہیں گے...... غریب سے زندگی کا اتنا مختصر عرصہ چھیننا ظلم ہے۔

(جھاڑیوں کے عقب میں امجد اپنے دانت بھینچ لیتا ہے — اصغری مضبوطی سے اس کا کندھا پکڑ لیتی ہے)

سعیدہ: ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب تک وہ زندہ رہیں، خوش رہیں۔ان کے احساسات کے نازک آبگینوں کو ہلکی سی ٹھیس بھی نہ لگے......

مجید: اور اگر ہمارا کوئی چھالا رگڑ کھا کے پھوٹ پڑا تو......

سعیدہ: (قریب قریب چیخ کر) تو قیامت آجائے گی۔

مجید: اسی لئے میں سوچتا ہوں کہ میں چلا جاؤں...... جب تک بھائی جان......

سعیدہ: (ایک دم بات کاٹ کر) ایسا نہ کہو مجید —— اتنے ظالم مت بنو۔

(امجد، اپاہجوں کی کرسی میں لرز جاتا ہے، اصغری اسکا دوسرا کندھا بھی مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے)

مجید: محبت بڑی ظالم اور خودغرض ہوتی ہے سعیدہ —— کم بخت دوسروں کی موت پر ناچنے کی خواہش کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتی۔

سعیدہ: ہمیں ایسے خیال اپنے دماغ میں نہیں لانے چاہیں۔

مجید: ٹھیک ہے —— لیکن آجائیں تو کیا کریں۔

سعیدہ: کیا کر سکتے ہیں —— چلو۔

(سعیدہ کوٹھی کی جانب چلتی ہے —— مجید اس کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے —— جھاڑیوں کے عقب میں اپاہجوں والی کرسی میں امجد کا سر جھکا ہوا ہے۔اس کے پیچھے اصغری بت بنی کھڑی ہے۔

اصغری: چلیں؟

امجد: (اسی طرح سر جھکائے نہیں —— ابھی نہیں —— میں سوچ رہا ہوں۔

اصغری: کیا؟

امجد: معلوم نہیں......شاید یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا سوچنا چاہیے۔

اصغری: ایسی سوچ بالکل فضول ہوتی ہے۔

امجد: (سر اٹھا کر) فضول تو ہوتی ہے —— مگر پھر کیا کروں —— (وقفے کے بعد) وہ اتنے ظالم نہیں ہیں جتنی تم ہو —— تم تو مجھے سوچنے سے بھی منع کرتی ہو —— تم بڑی ظالم

ہوا اصغری!

اصغری: (مسکرا کر) محبت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے امجد میاں — کم بخت اپنی موت پر بھی ناچنے سے باز نہیں آتی۔

امجد: میرے سامنے آؤ۔

(اصغری امجد کے سامنے آتی ہے۔امجد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے— کچھ سوچتا ہے اور بڑبڑاتا ہے)

امجد: یہ کتاب اب تک کہاں پڑی تھی۔

اصغری: کہیں ردی کی ٹوکری میں...... اپنی صحیح جگہ!

امجد: چلو— مجھے لے چلو۔

(اصغری کرسی ڈھکیلتی ہے اور کوٹھی کی جانب چلتی ہے)

پردہ

آٹھواں منظر

(**وہی کمرہ جو پہلے**، دوسرے اور چوتھے منظر میں ہے۔ رات کا وقت ـــــ چھت سے سبز روشنی کی پھوار گر رہی ہے ـــــ ہر شے کا اصلی رنگ بدلا ہوا ہے، جیسے اعصاب زدہ مریضوں کا ـــــ مسہری خالی ہے۔ کچھ اس طور پر خالی جیسے وہ کبھی آباد ہی نہیں تھی ـــــ اصغری، امجد کو اپاہجوں والی کرسی میں اندر لاتی ہے)

اصغری: دولھن بیگم، بیگم صاحب کے کمرے میں کیوں چلی گئیں؟

امجد: ڈرتی تھی۔

اصغری: آپ سے؟

امجد: (مسکرا کر) مجھ سے کوئی کیا ڈرے گا ـــــ وہ اپنے آپ سے ڈرتی تھی۔

اصغری: وہ اتنی کمزور نہیں ہیں امجد میاں۔

امجد: وقت بڑے بڑے پہاڑ کھوکھلے کر دیتا ہے ـــــ وہ تو ایک جوان لڑکی ہے۔

اصغری: (توقف کے بعد) آپ سونا چاہیں گے اب؟

امجد: سونا؟...... (ہنستا ہے) میرا مذاق مت اڑاؤ اصغری ـــــ میرے جلتے ہوئے زخموں کی توہین ہوتی ہے۔

اصغری: (توقف کے بعد) کیا آپ کو سعیدہ سے محبت ہے؟

امجد: نہیں۔

اصغری: تو پھر یہ جلتے ہوئے زخم کیسے؟

امجد: مجھے سوچنے دو...... بولو اجازت دیتی ہو سوچنے کی؟

اصغری: آپ سوچئے۔

(طویل وقفہ جس میں امجد سوچ میں غرق رہتا ہے)

امجد: مجھے سعیدہ سے محبت نہیں ہے ــــ جس طرح مارکٹ سے آدمی اچھی چیز چن کے لاتا ہے ــــ اسی طرح میں نے سینکڑوں لڑکیوں میں سے اسے انتخاب کرکے اپنی بیوی بنایا تھا ــــ مجھے اپنے اس انتخاب پر ناز تھا اور بجا ناز تھا ــــ سعیدہ مبالغے کی حد تک خوبصورت ہے ــــ اس پر میرا صرف اتنا حق ہے کہ میں نے اسے چنا اور اپنی رفیقۂ حیات بنایا ــــ اس حیات کا جواب کچلی ہوئی اسی کرسی میں ڈھیر ہے ــــ جو کسی دوسرے کی مدد کی بغیر ہل جل نہیں سکتی...... ڈاکٹروں نے مجھے زیادہ سے زیادہ ایک سال اور زندہ رہنے کے لئے دیا ہے...... سمجھ میں نہیں آتا میں کیوں اس عرصے تک اس کو ایسی زنجیروں میں باندھ کے رکھنا چاہتا ہوں، جن کا ہر حلقہ میری اپنی زندگی کی طرح غیر یقینی ہے...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا...(سوچتے ہوئے) اس کی جوان خوبصورتی ہی ایک وجہ ہوسکتی ہے (ایک دم چونک کر) یہی، یہی ــــ یہی وجہ ہے اور کوئی نہیں ......اس مسہری میں جوان خوبصورتی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ لیٹی دنیا کے حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کررہی تھی...... یہ نظارہ میرےء ساتھ چمٹ گیا ہے ــــ نہیں، میں اس کے ساتھ چمٹ گیا ہوں......(وقفے کے بعد) اصغری!

اصغری: (چونک کر) جی!

امجد: کوئی ایسی صورت ہوسکتی ہے جو یہ چھل کر میرے وجود سے علیحدہ ہوجائے۔

اصغری: ہر مشکل کی چولی میں اس کو آسان کرنے کی ترکیب چھپی ہوتی ہے۔

امجد: تو ڈھونڈنی چاہیے...... لیکن...... لیکن مجھے حجاب کیوں محسوس ہوتا ہے۔

اصغری: معلوم نہیں کیوں ــــ یہ مشکل، آپ ہی کی مشکل ہے۔ اس کے لئے آپ کا ہاتھ کسی نامحرم کا ہاتھ نہیں ہوگا۔

امجد: جانتا ہوں ...... میں اپنے دل کی ان تمام نا خلف نسوں سے واقف ہوں جو اس غلط جذبے کی دھڑکنیں پیدا کرتی ہیں ـــــ لیکن آج اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اصغری: کس کا؟

امجد: میرے سامنے آؤ

(اصغری امجد کے سامنے آجاتی ہے)

امجد: جاؤ، مسہری میں لیٹ جاؤ۔

اصغری: (ہچکچا کر) امجد میاں ـــــ مجھ میں وہ جوان خوبصورتی نہیں ہے۔ جس کی رعنائیاں دنیا کے حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر سکیں ـــــ میری جوانی تو کھردرے ٹاٹ کی شرمندۂ احسان ہونا چاہتی ہے۔

امجد: مسہری میں لیٹ جاؤ اصغری۔

اصغری: (آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں) نہیں امجد میاں ـــــ مسہری کو تکلیف ہوگی ـــــ یہ دولھن بیگم کے نرم اور اور نازک بدن کی عادی ہے۔

امجد: میں تمھیں حکم دیتا ہوں۔

اصغری: (سر جھکا کر) آپ مالک ہیں (مسہری میں لیٹ جاتی ہے ـــــ آنکھیں چھت میں گڑ جاتی ہیں)۔

امجد: جانتی ہو آج کون سی رات ہے؟...... وہ رات ہے جب ایک تڑی مڑی جوانی اور زیادہ تڑ مڑ کر سالمیت اختیار کرنے والی ہے ـــــ یہ قیامت کی رات ہے! فنا کی رات ہے؟ ...... اس کے اندھیاروں میں وجود، عدم کی بھٹیوں میں پگھل کر ایک غیر فانی قالب اختیار کریگا...... یہ وہ رات ہے جس کے بعد اور کوئی رات نہیں آئے گی، اس کی اندھی آنکھوں میں ایسے کاجل سے تحریریں ہوں گی جو انھیں ہمیشہ کے لئے روشن کریں گی ـــــ یہ وہ رات ہے جب موت کے نچڑے ہوئے تھنوں سے زندگی کے آخری قطرے ڈر کر خود بخود ہی باہر آجائیں گے ـــــ یہ وہ رات ہے جب شکستگی اپنی کوکھ سے سربلند ایوانوں کو جنم دے گی ـــــ ایسے سربلند ایوان جن کے کنگروں کو عرش کی بلند

ترین اونچائیوں سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ یہ وہ رات ہے، جب زمزم کا سارا پانی رینگ کر زمین کی تہوں میں چھپ جائے گا۔ اس کے بدلے خاک اڑے گی۔ جس سے پاکیزہ روحیں تیمّم کریں گی۔ یہ وہ رات ہے جب کاتبِ تقدیر اپنا قلمدان اوندھا کر کے عرش کے کسی کونے میں منہ دے کر روئے گا...... یہ وہ رات ہے جس میں امجد اس دنیا کی تمام خوبصورتیوں کو تین دفعہ طلاق دیتا ہے اور ایک بدصورتی کو اپنے رشتۂ مناکحت میں لاتا ہے...... (ایک دم چیختا ہے) اصغری ——— اصغری!

(اس دوران میں اصغری مسہری پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچ کر اسے کھول چکی ہے اور اس کی سل پر کھڑی ہو کر نیچے گہرائیوں میں دیکھ رہی ہے)

امجد: (چیخ کر) یہ کیا کر رہی ہو اصغری؟

اصغری: (کھڑکی کی سل پر مڑ کر امجد کو دیکھتی ہے) ایجاب وقبول ضروری ہے میرے مالک! (نیچے کود جاتی ہے)

امجد: (دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر) اصغری!...... (ہاتھ ہٹاتا ہے اور چند لمحات کھلی کھڑکی کے اندھیرے کو دیکھتا رہتا ہے جو سبز دیوار میں تاریک زخم کے مانند کھلے ہے) ایجاب وقبول!...... (بڑبڑاتا ہے) ایجاب وقبول واقعی ضروری ہے (زور لگا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی کرسی آگے ڈھکیل دیتا ہے ——— بڑی مشکل سے کھڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے)...... مجھے مشکل کو آسان کرنے کا یہ راستہ معلوم تھا...... مگر شاید کسی انگلی پکڑنے والی کی ضرورت تھی......

(کھڑکی کی سل دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے اور اپنا اپاہج جسم بڑی دقتوں سے اوپر اٹھاتا ہے اور دوسری طرف لٹکنا شروع کر دیتا ہے)

امجد: میری پہاڑیاں ——— میری پیاری پہاڑیاں ——— میری پیاری اصغری!

(اگلا دھڑ انیچے پھسلتا ہے اور ایک دم اس کا سارا وجود اندھیرا کھا جاتا ہے)

آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے